

۱  
اردو غزل

مع  
انتخاب

از  
ڈاکٹر یوسف حسین خاں  
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی  
حیدر آباد (دکن)

مطبعہ  
اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد

# انتساب

میں ان اوراق کو امام غزل مولانا فیض الحسن حسرت موہانی  
کی خدمت گرامی میں بطور نذر عقیدت پیش کرنے  
کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

یوسف حسین خاں

## فهرست مضامین

صفحه	مضمون	صفحه	مضمون
۲۴۴	سید محمد میر اثر	۲۵۰	اردو غزل
۲۴۵	شیخ غلام مهدانی مصحفی	۲۲۹	انتخاب غزلیات
۲۸۲	خواجہ میر حسن، حسن	۲۳۰	ولی اور نگ آبادی
۲۸۳	جعفر علی حسرت	۲۳۲	سراج اور نگ آبادی
۲۸۳	شیخ قلندر بخش جرأت	۲۳۳	شاه مبارک آبرو
۲۹۰	میراثا، اللہ خاں انشا	۲۳۴	مرزا جان جانان مظہر دہلوی
۲۹۱	شیخ ابراہیم ذوقی	۲۳۵	شاه حاتم
۲۹۴	اسد اللہ خاں غالب	۲۳۶	میر عبدالحی تاجاں
۳۱۳	بہادر شاہ ظفر	۲۳۶	محمد امان منشا
۳۱۴	میر مہدی مجروح	۲۳۶	میر محمدی بیدار دہلوی
۳۱۶	نعتی صدر الدین آزر دہ	۲۳۸	میر تقی میر
۳۱۷	مومن خاں مومن	۲۶۰	مرزا محمد رفیع سودا
۳۲۵	نسیم دہلوی	۲۶۵	خواجہ میر درد
۳۲۷	آتش لکھنوی	۲۶۹	سید محمد میر سوز
۳۳۰	شیخ امام بخش تاسع	۲۷۱	شیخ قیام الدین قائم
۳۳۲	برق لکھنوی	۲۷۲	انعام اللہ خاں یقین
۳۳۳	جلال لکھنوی	۲۷۳	خواجہ احسن اللہ بیان

۳۵۳	داغ دہلوی	۳۳۵	صبا لکھنوی
۳۶۲	میر مظفر علی خان آسیر لکھنوی	۳۳۶	ماہ لکھنوی
۳۶۴	غشی میر احمد آسیر مینائی	۳۳۷	تسلیم لکھنوی
۳۶۵	خواجہ الطاف حسین حالی	۳۳۸	صفیر بکرای
۳۶۶	سید علی محمد شاد عظیم آبادی	۳۳۹	میرزا جیم الدین جیا
۳۶۹	رضا علی وحشت	۳۴۰	خواجہ محمد وزیر وزیر
۳۸۰	درداؤ کر حسین نواب لکھنوی	۳۴۱	ضیائی بیگم ضیائی
۳۸۴	حافظ جلیل حسن جلیل ناکلری	۳۴۲	مشر شکوہ آبادی
۳۹۲	شوکت علی خان قافی	۳۴۳	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
۴۰۱	سید فضل الرحمن حسرت موہانی	۳۴۴	نائل دہلوی
۴۱۹	جگر مراد آبادی	۳۴۵	زکی دہلوی
۴۲۶	اصغر گوندوی	۳۴۶	میر حسین تسکین
۴۳۴	اقبال	۳۴۷	سید ظہیر الدین ظہیر
۴۳۶	زراق گو رکھپوری	۳۴۸	عبد العظیم آسی
۴۴۱	جوش ملیح آبادی	۳۴۹	یاس شاگرد مومن
۴۴۳	نیر خود دہلوی	۳۵۰	وحشت شاگرد مومن
۴۴۴	مرزا حفص علی خاں اثر	۳۵۱	نظام شاہ نظام رامپوری
۴۴۵	آرزو لکھنوی	۳۵۲	محمد رفیع علی خان ناتھ رامپوری
۴۴۶	آدی مچھلی شہری	۳۵۳	گستاخ رامپوری
۴۴۷	سعید احسن جذبی	۳۵۴	امانت لکھنوی
۴۴۸	مرزا عیسیٰ لکھنوی	۳۵۵	رنید لکھنوی
۴۴۹		۳۵۶	شکی دہلوی







# اُرُو و غزل

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں - خیدرآباد (دکن)

گزشتہ دو سو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اُرُو و غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جان دار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فصاحت ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا بھج چوٹی ہے جن میں اس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب و مومن کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ دنیا کی ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت، اور طرز فکر و احساس وہ ہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجربی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جس کی مثال اُرُو و غزل کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساس

جہاں کو حیثیت و کائنات کے سمجھنے کے لئے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابالغ تھے اور اگر واقف تھے تو باطل بہیم طور پر۔

پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شاعر آج سے دو سو برس پہلے جس مخموم اور افسردہ آواز سے حسن و عشق کی داستان بیان کر رہے تھے اسی کی تقلید اب بھی ہو رہی ہے۔ گویا آرٹ کی تخلیقی آزادی سلب ہو چکی۔ وہی چبے چبائے نوالے ہیں جنہیں برابر چبایا جا رہا ہے۔ چاہے ان میں کچھ مزہ طے یا نہ ملے۔ وہی شہد و شراب، زلف و گیسوئے وینچاز اور شمع و پروانہ کی داستان ہے جو ذرا سے لفظوں کی الب پھیر کے ساتھ صدیوں سے بیان ہوتی رہی ہے اور آج بھی بیان کی جا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کے رموز و علامات میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی توجیہ بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان رموز و علامات کی توجیہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس مرحلے میں بہت کچھ بدلتی رہی ہے۔ شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ ذہنی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی کوئی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رہا ہوا ہے۔ اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ چوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے احساس و تخیل پر پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے تو غزل کے حرکات بھی بدلیں گے اور اس کے رموز و علامات کی توجیہ بھی بدلے گی اور اس طرح نئے نئے خیالی اور جذباتی حقایق کی باز آفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گزشتہ دو سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غزل کے بظاہر بندھے رکھے محاوروں اور اشاروں میں معانی کی کس قدر وسعتیں پنہاں ہیں۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ غزل نگاروں کے پُرانے تجربوں کی نئی نگاہیں آئینہ بھی تخلیق ہوتی نہیں مگر اور اس طرح ہمارے ادبی شعور کی نشوونما چاری رہے گی۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس وقت ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں غزل کو وہ حسن قبول حاصل نہیں رہا جو نظم کو حاصل ہے۔ جدید مغربی تعلیم کے اثر سے ہمارے یہاں نظم نگاری کو رواج ہوا اور پچھلے پچاس سال میں اس میں قابل قدر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ حالی اور اقبال نے اس کو اپنے اصلاحی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دونوں کو اپنی قوم کو پیام دینا تھا جس کے لئے یقیناً نظم کا وسیلہ زیادہ موثر اور مفید تھا۔ قوموں کو جو درس مل دیا جاتا ہے وہ اشاروں انہی میں نہیں دیا جاسکتا۔ وہ وضاحت اور تفصیل اور تکرار چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ کام غزل کے مقابل میں نظم ہی کے ذریعے سے اچھی طرح انجام پاسکتا تھا۔ میں اس موقع پر دیدہ و دانستہ اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہمارے ادب میں غزل کو ترجیح دی جانی چاہیے یا نظم کو۔ دراصل دونوں اپنا اپنا مقام اور اپنا اپنا حق رکھتی ہیں جس سے انہیں محروم نہیں کرنا چاہیے۔ جس وقت سے مولانا حالی نے ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں غزل پر نکتہ چینی کی اس وقت سے آج تک برابر وہی پُرانے اور فرسودہ دلائل غزل کے خلاف لائے جا رہے ہیں ان سب دلائل کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ غزل زندگی کے نئے تقاضوں کی حریف نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ اس صنف سخن میں خیال کو اظہار کی پوری آزادی نہیں ملتی۔ اس کی ریزہ کاری کلام کے منطقی تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکتی جس کا نتیجہ خیالات کا انتشار ہے۔ غرض کہ غزل اب اعتبار اور قدر کی چیز نہیں رہی لہذا اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا ہے۔

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز

ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قومی مصلحت کی ترقی کا موجب ہو گا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطہ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور اچھے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابل قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلاست کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر اور خانی اور صہتر کی زمزمہ بنجیوں سے محروم رہتی جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ ۷۹

در اصل معاملہ اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ غزل کے معترضین نے سمجھ رکھا ہے غزل کی جڑ میں ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ انھیں اکھاڑ پھینکا سہل نہیں۔ مولانا حالی اردو زبان و ادب کی اور عام طور پر مسلمانوں کی قومی زندگی کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصلاحی جوش میں انہوں نے غزل کے نقائص جن جن کو دیکھا ہے اور قومی اخلاق کو سدھارنے کے لئے سادہ اور عام نہم نفیس نکھیں اور دوسروں کو لکھنے کی دعوت دی۔ پھر ان کے پیش نظر غزلوں میں بھی خاص طور پر وہ تھیں جن سے فحش اور رکاکت کی ترویج کا اندیشہ تھا۔ لیکن کیا سب غزلیں ایسی ہوتی ہیں؟

عیب مئے جملہ بگفتی ہنرشس نیر بگو

نفی حکمت کن اذ بہر دل ماسے چند (حافظ)

اگر مولانا حالی آج زندہ ہوتے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ

۱۰ مولانا حالی کی رباعی ملاحظہ ہو۔

پے عشق طیب دل کے بیادوں کا یا خود ہے یہ گھر ہزار آزاروں کا

ہم کچھ نہیں جانتے پراتی ہے خبر اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اس رباعی میں مولانا روم کے اس شعر کی ترویج کی گئی ہے۔

شاوہ باش لے عشق خوش بود لے ماسے طیب جملہ علت ہائے ما

پچھلے چند سالوں میں فحش کی ترویج اور اس کی قدر افزائی شر اور نظم کے توسط سے زیادہ ہوئی ہے یا غزل کے ذریعے۔ مولانا حالی کی رائے کو آج ویلے کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ وہ محض عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے غزل کے جو نقائص بتائے ہیں ان میں سے بعض کو غزل کے حامی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ غزل جو محض قافیہ بندی کے لیے ہو جو بے غرض نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ غزل صرف اعلیٰ درجہ ہی کی ہونی چاہیے۔ نظم اوسط درجے کی گوارہ کر لی جاسکتی ہے لیکن غزل نہیں کی جاسکتی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ”بندش بہ غایت بند و پستش بہ غایت پست“ غزل پر ہو ہو صادق آتا ہے۔ غزل ہمیشہ بند ہی ہوگی، اگر واقعی وہ تفرل کے آداب کی حامل ہے۔ اوسط درجے یا ادنیٰ درجے کی غزل مکر وہ چیز ہے جس سے گھن آتی ہے، ادبی لطف حاصل ہونا تو کجا۔ اس کی غلط تعبیر و توجیہ کا اندیشہ رہتا ہے جو ممکن ہے بعض طبائع پر برا اثر ڈالے۔ غزل کے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ شرو سخن سے دلچسپی رکھنے والے پہلے پہل اسی کو اپنا تختہ مشق بناتے ہیں۔ عروض کی چند کتابیں پڑھیں اور اپنے آپ کو غزل کہنے کا اہل سمجھنے لگے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ غزل گو ہونا علم مجلسی کا جز تصور کیا جاتا تھا اصلاً لفظی اور ضلع جگت ذہانت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ امراء کے طبقہ میں خاص طور پر اس کا رواج تھا۔ جس طرح گھر کے انتظام کے لئے ایک داروغہ رکھا جاتا تھا اسی طرح غزلی کی اصلاح کے لئے ایک استاد رہتے تھے جو اکثر کوئی پٹے حالوں پر رگ ہوتے تھے جنھیں اصلاح شعر کے معاوضہ میں کھانا اور کپڑا میسر آ جاتا تھا۔ غدر سے پہلے اور غدر کے کچھ عرصہ بعد تک غزل لکھنے والے امیر زادے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دیتے والے استاد شمالی ہند کے ہر شہر اور قصبے میں موجود نظر آتے تھے۔ ان سب بے فکروں کے لئے شرو سخن بیکاری اور خوش وقتی کے مشغلہ سے زیادہ وقت نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ ہماری اجتماعی اور جذباتی زندگی کی انتہائی بے مقصدی اور انتشار کا

نما نہ تھا جس سے ریاست و محبت کی طرح ادب بھی متاثر ہوا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کدھر جانا ہے اور کس کے ساتھ جانا ہے؟ ہماری قوم کی حالت غالب کے تھکے بارے مسافر کی سی تھی جس کی زبانی اس نے یہ شعر کہلوا دیا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ  
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ سبر کو میں

اس آڑے وقت میں ہماری خوش قسمتی تھی کہ سرسید اور مولانا حالی جیسے رہبر ملے۔ ان کے دلوں میں درو اور غیثوں میں خلوص تھا۔ مولانا حالی نے اپنی اصلاح کا ثیر اٹھایا۔ یہ ان کا انتہائی اشار تھا کہ باوجود اعلیٰ درجہ کے تفرق کی صلاحیت کے انھوں نے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان کے تفرق کا اندازہ چند شعروں سے ہو سکتا ہے۔

کس طرح اگلی لگاؤ کو بناؤ سمجھوں خط میں لکھا ہے وہ القاب عنوان میں نہیں  
بے قراری تھی سب اسید ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازی شب بچاں میں نہیں  
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف پوچھ ایسے الجھاؤ تری کا کل بچاں میں نہیں

ہے جستجو کہ خوسے ہے خوب ترک کہاں اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں  
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو سیش عشق رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں  
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں  
یہ آخری شعر مولانا حالی کے حقیقی اندرونی احساس کی غمازی کرتا ہے۔

انھوں نے ترک عشق کی جو دعا کی وہ اویری دل سے تھی۔ اسی لئے بے اثر رہی۔ عشقیہ شاعری کی ترقی رکھنے والی نہ تھی نہ رکی۔ چنانچہ آج اس صنف سخن کا ملک زبردست علم دار آزار عقل اور مداوائے عشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مطلق پس و پیش نہیں کرتا۔



اور باب ہوش جتنے ہیں بیاضعل ہیں۔

ان کے لئے ضرور مداوای عشق ہے (حسرت)

مولفنا حال آئی اور ان کے بعد اقبال نے اردو نظم نگاری کو اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا جس پر ہم اب اس کو دیکھ رہے ہیں لیکن غزل بھی اس عرصے میں ہنسی نہیں رہی۔ غالب کے بعد داغ، امیر، شاد، حسرت، فانی، ہنسی اور جگر نے اپنے اپنے انداز میں اسے سنورا اور نکھارا اور اس کے مقام کو بلند کر دیا۔

ہمارے زمانے کے ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔ غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طبقہ میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں اس لئے کہ انھیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہئے ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے ادب اور اپنی ذہنی روایات سے ناواقف ہیں۔ وہ مغربی ادب کی ریش میں آداؤ اور عاری نظم کو اردو میں بھی رواج دینا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہر صنف سخن کو ہر زبان میں نہیں برتنا جاسکتا اور نہیں برتنا چاہئے تخلیقی ادب ذوقی چیز ہے۔ جہاں ذوق مجروح ہوگا وہاں تخلیقی ادب تخلیقی نہیں رہے گا بلکہ کسی دوسرے کی نقالی ہوگی جس سے ادب کی سیرت مسخ ہو جائے گی۔ اندیشہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی یہ ناپختگی اور بے راہ روی ان کی رفتار ترقی کے لئے زنجیر پائے بن جائے اور ان کے تخلیقی مساعی بے اثر ہو کر نہ رہ جائیں جو کسی تحریک کے لئے سب سے بڑی افتاد ہے۔

نظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ادب کے اثر سے ہمارے یہاں جو نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں وہ غزل کے لئے ناموافق ہیں۔ لیکن میرا خیال

ہے کہ اس صورت حال کے خلاف جلد رد عمل رونما ہوگا اور ہمارا ادبی ذوق  
 ہمیں بہت دُور تک ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دے گا۔ جس طرح مغربی تعلیم  
 کے اس ملک میں رائج ہونے پر مشرقی علوم و فنون ناقدری کے نذر ہو گئے  
 لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے صحیح مقام کو تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح مغربی ادب  
 کے زیر اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن  
 میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جو کھم کو جھیل جائے گی۔ اس میں اتنی قوت حیات  
 موجود ہے کہ حتیٰ زرا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدی پر براجمان ہو جائے۔  
 ناکام اور ناول کی طرح نظم بھی عوامی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور  
 اس طرح ہمارے ادب میں نظم اور غزل دونوں کو اپنا اپنا مقام مل جائیگا  
 لیکن عوامی ضروریات کو پورا کرنا کے لئے نظم کو غزل سے موسیقیت کا رس  
 مستعار لینا ہوگا۔ ورنہ خود اس کی قبولیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ہم زندگی کی  
 تاریکیوں سے موسیقی کے ذریعہ ہی گریز کر سکتے ہیں۔ اور شعر تو بغیر موسیقی کے  
 بقول غالب ”مینائے بے شراب و دل بے سوائے گل“ سے زیادہ وقت نہیں  
 رکھ سکتا۔ غرض کہ مجھے غزل کا مستقبل اس کے امکانات کی وجہ سے روشن نظر آتا  
 اس لئے کہ اس صنف سخن سے ہمارے بعض اہم اور دور رس ادبی اور  
 جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے غزل ہمارے ادبی مزاج میں اتنی دخیل  
 ہو چکی ہے کہ اس سے قطعی طور پر بے تعلق ہو جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔  
 ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے  
 نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ  
 حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمدردی کی  
 زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوجع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ  
 آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدت  
 احساس کی کار فرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے

اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔ مثال کے طور پر اس زمانے کے اردو کے دو سب سے بڑے شاعروں کے کلام کو دیکھئے جن میں سے ایک نظم کا اور دوسرا غزل کا بادشاہ ہے۔ ان سے میری مراد اقبال اور حسرت ہیں۔ اقبال کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرت کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چند مثالوں سے میں اس کی وضاحت کروں۔

اقبال کی ایک ابتدائی غزل نما نظم لیجئے۔ ہر لفظ تغزل میں رچا ہوا ہے۔ کبھی اے حقیقت منظر نظر آجاس مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپے ہیں میری حسین بایں تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ سار میں نہ کہیں جہاں میں ایں ملی جو اماں ملی تو کہا ملی مے جرم خانہ خراب کو ترے عہدہ نواز میں نہ وہ عشق میں ہیں گرمیاں نہ وہ جن میں میں شہنشاہ نہ وہ غولوی میں تڑپے ہی نہ وہ خمبہ نہ لکڑیاں میں جو میں ہر سجدہ ہو کبھی تویں سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا مجھے کیا ملے لکھا ناز میں اقبال کی آخری زمانے کی ایک دوسری غزل نما نظم بھی ملاحظہ ہو۔ رمز و

ایما کی طلسمی کیفیات کا کمال دکھایا ہے۔

مجھے یاد کیا نہیں ہے مے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہ محبت ! وہ نگہ کا تادیانہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسہ میں نہ ادائے کافرانہ ! نہ تراشش آذنانہ رنگ تاک منتظر ہے تری باتوں کرم کی کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مے مغانہ میرے ہم صیغہ سے بھی اثر بہار سمجھے انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ حسرت کی عاشقانہ اور شاعرانہ زندگی کی ابتدائی کوشش ملاحظہ ہو۔

اس نظم نما غزل میں جرات کے انداز کی تقلید کی گئی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو عشقیہ محاکات کہہ سکتے ہیں جس میں عہد ہوس کے افسانے کو من و عن ہمارے سامنے دہرایا ہے اور ہر مزے لے لے کر دہرایا ہے۔

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے  
 تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگنا یاد ہے  
 اور ترا غرنے سے وہ آنکھیں اڑنا یاد ہے  
 اور ترادانتوں میں وہ آنکھی دہانا یاد ہے  
 اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے  
 اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے  
 حال دل باتوں ہی باتوں میں جنانا یاد ہے  
 سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے  
 وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے  
 وہ ترا کو ٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے  
 اپنا جانا یاد ہے ترا بلانا یاد ہے  
 ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑنا یاد ہے  
 جب مٹا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے  
 مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے  
 اور میرا وہ پھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے  
 آج تک عہد ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے  
 ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق  
 بار بار اٹھنا اسی جانب بنگاہ شوق کا  
 تجھ سے کچھ ملنے ہی وہ بیباک بھانا یاد ہے  
 کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتاً  
 جان کر سوتا تجھے وہ قصد پا بوسی میرا  
 تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہ لحاظ  
 جب سوا میرے تنہا کوئی دیوانہ نہ تھا  
 غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف  
 آگیا گریصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق  
 دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے  
 آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت ازونیا  
 میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں زالی پیار کی  
 دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سونا زے  
 چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ  
 شوق میں ہندی کے وہ بیدرت پابونا تیرا  
 باوجود اوجائے اتفاقا حسرت مجھے

یہ غزل ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی۔

حسرت کی ایک حال ہی کی غزل ملاحظہ کیجئے جس میں اعلیٰ تنزل کے ساتھ  
 نظم کے سارے انداز موجود ہیں۔ یہ غزل جزیرہ قبرص (سائپرس) کی ایک  
 خاتون کو دیکھ کر جو جہاد پر حسرت کے ہم سفر تھیں لکھی گئی ہے۔

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا  
 رفتار قیامت یونہی کیا کہ تھی تھیں اس پر  
 نظارہ ہے مسعود اسی جلوہ گری کا  
 اک طرف ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا بٹخری نقش ہیں دلکش  
 باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ درسی کا  
 لاریب کہ اس حسن ستمگار کی سرخی  
 موجب ہے مئے زہد کی عصیان نظری کا  
 باوصف تلاش انکی خبر کچھ بھی نہ پا کر  
 کیا کہیے جو ہے حال میری بے خبری کا  
 جب سے یہ سنا ہے کہ وہ ساکن ہیں بس کے  
 عالم ہے عجب شوق کی آشفقہ سری کا  
 ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے بیڑتِ حیرت  
 یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہمسفری کا  
 یہ غزل ۱۹۳۹ء میں مکھی مکھی تھی جبکہ حسرت مشرق وسطیٰ کے ملکوں  
 سے ہوتے ہوئے پہلی مرتبہ یورپ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں بڑھاپے کے کلام  
 میں شوخی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ قیس چالیس  
 سال قبل عشق و محبت کی جو چنگاری حسرت کے دل میں روشن تھی آج بھی معلوم  
 ہوتا ہے وہ ویسی کی ویسی دھک رہی ہے۔ رنگ اور نسل کے اعتبارات جو  
 مثل خس و خاشاک ہیں اس کے آگے ایک دم کو نہیں ٹھہر سکتے۔ وہ فرق امتیاز  
 کرتی ہے لیکن اپنے بنائے ہوئے معیاروں سے۔ اس کی انسانی دستوں کی  
 کوئی انتہا نہیں۔ یہی جذبہ محبت موسیقی میں حل ہو کر تخیلی حسن کا موثر ذریعہ بن  
 جاتا ہے اور یہی تغزل کی جان ہے۔

اگر آپ تغزل کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو بعض باتیں صاف طور پر نمایاں نظر  
 آئیں گی جن کی وجہ سے دوسرے اصناف شعر سے اسے الگ کرنا ہوگا۔ غزل کی  
 ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی درون بینی پائی جاتی ہے۔  
 غزل گو شاعر کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ٹوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیات و  
 کائنات کا نقطہ نظر خالص موضوعی اور داخلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی  
 دنیا کی سیر میں ایسا ہنمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم  
 کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات میں سب  
 کچھ پاتا ہے۔ اس کا تخیل اپنی گلی کاریوں سے اس کے دل کو ایسے ایسے  
 حسین پیکروں سے آباد کر دیتا ہے کہ پھر اس کو ادھر ادھر جھانکنے کا محفل کی

ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر کبھی وہ خارجی عالم کو دیکھتا ہے تو اس طرح نہیں دیکھتا جیسے دوسرے دیکھتے ہیں بلکہ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کے وجود کا ثبوت انسانی شعور میں تلاش کرتا ہے اور اپنی ذات کو اس کے علم کا ماخذ اور ہتھیار تصور کرتا ہے۔ غزل گو شاعر کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جس کی مدد سے اس کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ اس کی درون بینی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل سے آپ گفتگو کرے اور جو تاثرات مختلف اوقات میں اس کے دل پر گزریں انہیں شعر و نغمہ کا رنگین لباس پہنا دے۔ تخیل اور جذبہ جب موسیقی کی رنگین قبا زیب تک کر کے جلوہ گر ہوتے ہیں تو شاعر کی روح اپنے تخیلی پیکروں سے ہم آغوش ہو کر رقص کرنے لگتی ہے۔ خیال موسیقی میں ایسا مل ہو جاتا ہے کہ اس کو اس سے جدا کرنا محال ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے اندرونی تجربے کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے جو بس ایک حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کی منطقی ترتیب جذبہ کے اظہار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ہماری زبان چاہے وہ کتنی ہی سمجھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس میں یہ صلاحیت کبھی بھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرے جو دل کی وادیوں میں گونجتے ہیں غزل گو شاعر رمز و علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ میں ایسا ڈوبا رہتا ہے کہ اس کو یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ وہ جو کہتا ہے دوسروں کے لئے نہیں کہتا بلکہ اپنے من کی موج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ غالب کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے شعروں کو بے معنی سمجھتے تھے۔ خود اس کے دل میں ان کے معنی تھے اور اس سے زیادہ اسے کیا جا سکتا۔ نہ سائیش کی سناٹا صدمہ کی پروا مگر نہیں ہے مے اشعار میں معنی نہ تھی دوسری جگہ کہا ہے کہ دنیا والے میرے کلام کو بھلا کیا سمجھیں گے اور

میرے دل کے جذباتی تجربوں میں کیسے شریک ہو گئیں گے۔ مجھے اگر اپنے کلام کی نقوڑی بہت داد مل سکتی ہے تو وہ روح القدس (جبریلؑ) سے مل گئی ہے۔ وہ بھی اگرچہ میرے ہم زبان نہیں لیکن عالم اسرار کے رازدار کی حیثیت سے وہ تھام ڈھ رحمن کی قدر افزائی کر سکتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں شعر اور خاص کر غزل کا شعر چنانچہ اندرونی تجربہ کا اظہار ہے اس لئے ضرور ہے کہ وہ فطرت میں کسی نہ کسی قسم کا اضافہ کرے اور اگر وہ ایسا کرنے میں قاصر ہے تو تجربہ کا اچھوتا پن مشتبہ رہے گا تخلیقی تخیل کی بدولت غزل کے شعر میں تجربہ حیات کے کسی خاص لمحہ کا اظہار ضروری ہے جو شعور اور محنت شعور کے تانے بانے کی حادث سے بنتا ہے۔ زندگی کے اندرونی تجربے اور اس کی متعلقہ کیفیات کو موسیقی میں سمو کر تاثر انگیز انداز میں بیان کرنا غزل کے شاعر کا مقصد ہوتا ہے۔ دل کے اندرونی تجربوں میں تخیل اور جذبہ کی ایسی آمیزش ہوتی ہے کہ وجدان ہی ان کیفیات سے ہمہ برا ہو سکتا ہے اور انہیں کا اظہار شعر غزل میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو دائمی طور پر زندگی کے طلسماتی عنصر کی تلاش رہتی ہے۔ فطرت کے طلسم دل کے طلسم کے آگے پہنچ ہیں۔ انسانی دل سب سے بڑا طلسمات کا مخزن ہے اس کے اندر عجیب عجیب عالم بنیاں ہیں۔ غزل گو شاعر اپنے لہرے کے شے سروں سے انسانی دل کے طلسماتی پیکروں کو ان کو ابدی زندگی سے بیدار کرتا ہے۔ جب ذہن لہر کے طوفان کو تباہ میں لاتا اور اس کو خاص اصول اور خاص اصول کا پابند کرتا ہے تو غزل کے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی واسطے غزل گو شاعر کے تجربوں میں طلسم و جذبہ آغوش و آغوش نظر آتے ہیں۔

غزل گو شاعر کی درون بینی کے اصلی عناصر تخیل اور جذبہ ہیں تخیل میں یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی اور غیر مرئی حقائق کو یا یوں کہئے کہ ان حقائق کو جو حواس کی کوتاہی اور نارسائی کی وجہ سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے جیسا کہ کمال

اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکلتے اور یاریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔

خامہ انگشت بندوں کہ اسے کیا کہیے  
ناطقہ سر بگڑیاں کہ اسے کیا کہیے (غالب)

رمز و ابہام کے طلسم سے غزل کے شعر میں تھوڑی بہت پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو اس صنف سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ زندگی خود بڑی پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے اندرونی تجربوں کے اظہار میں اگر پیچیدگی آجائے تو یہ بات خلاف فطرت نہ ہوگی۔ اعلیٰ پایہ کے غزل نگار کی حیثیت سے میر صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا تھا۔ ان کے ہاں زبان کی سادگی کے باوجود رمز کا اشکالی موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

دلف سا پیچیدار ہے ہر شعر ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا  
دوسری جگہ کہتے ہیں۔

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

ایک آفت زمان ہے یہ میر عشق پیشہ پروے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے

میر صاحب اپنی کنایہ نگاری کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔  
دہر کا ہو گدگد کہ شکوہ چرخ اس ستم گر ہی سے کنایت ہے  
تخیل اپنی توجیہ اور تعبیر خود اپنے انداز میں کرتا ہے اس کے علاوہ اسے اور کوئی انداز پسند نہیں۔ وہ ان باتوں کو بھی جو عقلی طور پر پہلے سے ثابت ہیں اپنے طور پر اور اپنے رنگ میں باطل دوسری طرح سے ثابت کرتا ہے۔



کی فلسفیانہ اور سائنٹیفک تعبیر و تعریف سنی ہوگی۔ ایک غزل گو شاعر اس کی توجیہ یوں کرتا ہے۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فائدہ ہے  
مٹے تو دل عاشق بیٹھے تو زمانہ ہے (جگر)

زمانہ کا تجربہ ہمیں اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے اور انسانی خودی یا دل حقیقت اشیاء کی پیائش کا پیما اور حیلہ نظر ہے۔ گویا زمانہ کا تحقق دل کی کیفیت سے جدا نہیں۔ شاعر اپنے وجدانی ذوق کے ذریعے اس حقیقت کا راز ہم پر کس لطافت کے ساتھ منکشف کر دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے کیسے سیدھے سادے طریقہ پر کر دیا۔ نہ کسی فلسفیانہ موثر شکافی کی حاجت ہوئی اور نہ وہ منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں خود پھنسا اور نہ دوسروں کو پھنسایا۔ شاعر نے جو رمزی کیفیت پیدا کی وہ اس کے باطنی تخیل کا نتیجہ ہے نہ کہ حسی تجربہ کا۔ حسی تجربہ اس کے نزدیک محض چند علامتیں ہیں جنہیں وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربے میں تحلیل کر لیتا ہے۔ اس طرح منطقی استدلال سے تجربے کی دنیا میں جو سفر کی طواست لاحق ہوتی اس سے بچ کر وہ تخیل کی ایک ہی زقند میں منزل پر پہنچ گیا۔ پھر لطافت یہ ہے کہ سادے سفر میں نزاکت اور لطافت اس کے دامن سے وابستہ رہی۔ اس طرح اپنے دل کو تخیلی پیکروں سے آباد کر کے غزل گو شاعر حسن ازل کا جلوہ خود ہی نہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ایک ہلکا سی جھلک دکھا دیتا ہے۔ وہ اپنی تخیل نگاری کو حقیقت نگاری سمجھ کر محبور ہوتا ہے اس واسطے کہ تخیل ہی اس کے نزدیک اصل حقیقت ہے۔ خارجی فطرت کے حقائق سادہ حقائق سے زیادہ وقع نہیں۔ دیکھنے والے کی شعوی نظر ان سادہ اور بے رنگ حقائق کو رنگین بنا دیتی ہے۔

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی (جگر)

انسان فطرت کی قدر کر سکتا ہے لیکن اس سے دلی محبت نہیں کر سکتا۔ فطرت کا جدید معنی لغتوں ہمارے غزل گو شعرائے کبار کے لئے ناقابل فہم ہے۔ فطرت کی توجیہ انسانی وجود سے علیحدہ ایک قسم کا رومانی خیال ہے جو خارجی حقیقت میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے غزل گو شاعر فطرت کے احساس سے محروم نہیں بلکہ وہ اس کو عادت دیکھنے اور برتنے کا خواہش کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک فطرت کی اہمیت بس اتنی ہے کہ وہ انسانی عمل کا پس منظر ہیا کرتی ہے اس لئے وہ خود مرکز توجہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے فطرت کا ذکر اس کے ہاں غمنی طور پر آجاتا ہے۔ غزل میں فطرت بھی موضوع نہیں بن سکتی موضوع کا پس منظر ہو سکتی ہے۔ فطرت کے مناظر دراصل نظم کا موضوع ہیں جو بیانہ شاعری ہے۔ غزل انسانی دل کے لطیف جذبات و کیفیات کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ و تعبیر درکار ہے۔ تخیل ہی جذبہ کار و باری ہے۔ غرض کہ یوں کہیے کہ غزل جذبہ کا بیان ہے تخیل کی زبانی نظم کہنے والا یہ پیچیدہ حقایق کو سادہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خیال و تصور کو بکھرے بکھرے ٹکڑوں کے ان کی تفصیل بیان کرے۔ غزل گو شاعر جانتا ہے کہ احساس و تاثیر کی دنیا میں کھیاالی طور پر تجزیہ اور تحلیل ممکن نہیں۔ اس لئے وہ پیچیدہ حقائق کو پیچیدہ بنے دیتا ہے اور ان کے اندرونی تجربوں کے لئے بجائے تشریح و تفصیل کے اجمال و ابہام کی زبان استعمال کرتا ہے۔ دوسرے فنون میں یوں کہئے کہ وہ مخاطب اور حقایق کے اچھاؤ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس سے بیگانہ ہو کر ستانہ وار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد حقایق کی پیچیدگیوں کو سلجھانا نہیں بلکہ ان کا لطیف تاثر و احساس پیدا کرنا جو رمز و اشتباہ کا رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے بیان میں استدلال کی کوئی کڑی چھوٹی یا نہیں۔ چھوٹ گئی تو چھوٹ جائے۔ وہ اپنے آپ کو عقل سے زیادہ تاثر کا تابع فرمان خیال کرتا ہے۔ جذبات کی فرمان برداری اس کا طرہ امتیاز ہے۔ لطف یہ ہے کہ غزل گو شاعر کو اکھڑا، اکھڑا، ماتر جنم منطق، استدلال،

۵۔ سہل اور اس کی سب لڑیاں بھی موجود نہیں ہوتیں اس مہم اور وسیع حقیقت تک ہماری رہنمائی کر جاتی ہیں جس کی خصوصیت کا پتہ اس جذبہ ہی سے چل سکتا ہے جو انسانی دل میں اس کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ غزل کے بعض اشعار گو سن کر ایسے احساسات و جذبات پیدا ہوتے ہیں جو منطقی تعقل سے کہیں زیادہ گہرے اور پراسرار طریقے پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ ربط منطقی تصورات کے ربط سے بالکل علیحدہ نوعیت رکھتا ہے اور باوجود غزل کی ظاہری ریڑھ کاڑھا کے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و ادراک کی تہ کے نیچے تحت شعور اور وجدان کی دنیا میں ان جذبات کا کارخانہ علیحدہ چل رہا ہے اور اس کے اعتبار کی نوعیت ہی بالکل الگ ہے اور اس کے انتظام کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں نہیں۔ غالباً یہ جذبات زندگی کی اصل سے بہ مقابلہ عقل کہیں زیادہ قریب ہیں اور زندگی کی بصیرت انہیں سمجھے بغیر ہمیشہ اوصوری رہے گی منطق ان کی نسبت کچھ نہیں جانتی اور ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں سے سرگوشیاں کرتے ہیں جنہیں ہمارا دل سنتا اور سمجھتا ہے۔

۶۔ غزل گو شاعر کی درون بینی میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگارنگی سے بے وہ چین اور گلستان کے استعاروں سے یاد کرتا ہے کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔ اس کو سرو و سمن کی سیر کی حاجت نہیں ہوتی اس واسطے کہ اس کے دل کی طلسمی دنیا میں یہ سب کچھ تخیل و جذبہ کے فیض سے پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ بقول بیدل

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ  
تو ز اغنچہ کم نہ میدہ در دل کشا بہ عین در آ (۱۵)

۱۵۔ غالباً یہ خیال بیدل نے حافظ سے لیا ہے جس کا شعر ہے:   
حیفم آید کہ خراجی بہ تماشا سے چمن کہ تو خوشتر ز گل و تازہ سرازیر بینی   
دوسری جگہ کہ ہے:   
سرو و سمن عشق دار و دل دروند حافظ کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

پئے نامہ ہائے فحشتہ بو پند ز حمت جستجو  
 بہ خیال حلقہ زلف او گرھے خور و بختن درآ  
 اسی خیال کو ایک دوسری غزل میں بدآل نے اس طرح پیش کیا ہے۔  
 بیدلاں چند خیال تخیل و شمشاد کند  
 خوں شوند اینہمہ کز تھو و جمن ایجا و کند

یہ مضمون اردو کے غزل گو شاعروں کے یہاں کثرت سے ملتا ہے۔  
 ہمارے شاعروں کی درون بیتی اس مضمون میں ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کرتی ہے  
 کہ ان کا جواب نہیں۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک انسان کی اندرونی زندگی کا  
 لطیف استعارہ ہے جسے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ جس طرح دل تخیل کا اندرونی عالم ہے،  
 اسی طرح گل و گلشن سے تخیل کا خارجی عالم مراد ہے۔  
 یہاں چند مثالیں لکھتا ہوں۔

بیر صاحب فرماتے ہیں۔  
 کم نہیں ہے دل پر داغ بھی لے مرغ ایر گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلب گار چمن  
 اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

جگر کے شعر ہیں۔  
 کہاں کے سرو و صنوبر کہاں کے لالہ و گل نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہ ہو  
 عشق میں کیا لالہ و گل کیا چمن کیساتف میں ہی خود اپنا گلستان میں ہی خود اپنا قفس  
 فیض ہوئے عشق سے لے دل ہر ایا داغ ہر لہر جو بہار اب مجھ میں ہے سار گلستان میں نہیں

صیاد میرے دم سے ہیں سائے یہ چھپے جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

سمجھائے کون بسمل غفلت شعار کو مدد دکر لیا ہے چمن تک بہار کو

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

دست جنون عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہاریں

حسن کی شائیں تھیں جتنی رب نمایاں ہو گئیں جو ترے رخ سے پھیں رنگ گھستان ہو گئیں

کہاں تک ہیں یہ رنگ و بو کی بہاریں تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں

جلوہ جو ان کے رخ کا مے چشم تر میں ہے شادابی بہار کا عالم نظر میں ہے

اپنے سینے کے داغ میں لالہ کا رنگ دیکھنا اور چاک جیب سے بہار کی کیفیت کا اندازہ لگانا دروں بینی کا کمال ہے۔ اسیر لکھنوی کا شعر ہے۔

ہر داغ سینہ لالہ گلزار فیض سے

پاتے ہیں چاک جیب میں اندازہ بہار

پھر جس طرح بہار کے نقین میں شاعر اپنے دل کو مرکزِ حوالہ قرار دیتا ہے اسی طرح وہ غزلان کی بھی توجیہ کرتا ہے۔

غزلان نہ تھی چمنستان دہریں کوئی

خود اپنا ضعف نظر پرودہ بہار ہوا (جگر)

اگر دل کی بستی آباد نہ رہے تو بہار میں کوئی لطف باقی نہ رہے۔

لطف بہار مجھ نہیں کرے وہی بہار دل کیا اجڑیالہ زمانہ اجڑا گیا  
(آرزو لکھوی)

ہنتر کے یہاں بھی درون مینی کے عناصر ملتے ہیں جن میں شاعر اپنی ذات اور اپنے  
اندرونی تجزیوں کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

میرے مذاق شوق کا اس میں ہزار رنگ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ مقصود یہ یاد کو  
اس میں وہی ہے یا مرا حسن خیال ہے دیکھوں اُنھما کے پر وہ ایوان آرزو  
کبھی شاعر کی دروں بینی اپنے تخیل اور جذبہ کی تشفی کا سامان اس کی  
ذات میں تلاش کرتی ہے جو اس کے دل میں براجمان ہے۔ یعنی اس کا محبوب۔  
اب وہ کائنات کو غیر خود کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔  
یہ بھی ایک طرح کی درون بینی ہے۔ اس کا اقتضا ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات  
خارجی کائنات پر طاری کر دے اور اس کی سن مانی تو جبر پیش کرے۔ موسم بہار  
کیا ہے؟ وہ کسی کے خرام جلوہ کے نقش قدم سے عبارت ہے اور بس۔

خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل  
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا (ہسی فازی پوری)  
کبھی محبوب کے ساتھ سین اور دست پر نگار کو دیکھ کر شاخ گل مثل شمع جلنے لگتی  
ہے اور گل پروانہ بن جاتا ہے۔

دیکھ اس کے ساتھ سین و دست پر نگار شاخ گل حلقی تھی مثل شمع گل روانہ تھا  
(غالب تنویری)

گل و نسرين و سن کی عزت ناشتی کی نگاہ میں اس وقت بڑھتی ہے جب  
اُس کا محبوب سیر و گلگشت کی غرض سے چمن کی جانب خرام ناز فرماتا ہے۔

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرين و سن کی  
لالی ہے چمن میں انھیں نقشہ یر چمن کی (حسرت)  
چمن میں غنچہ گل کر گل کیوں بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس مسئلہ

ہی ساعرانہ تعبیر و توجیہ سے۔ شاعر کا جو ب سلت سے ہے پن کی طرف جالفا۔  
اس کے انداز و ادائیت کو ایسے بھلے معلوم ہوئے کہ وہ آغوش کھول کر اس سے  
بغل گیر ہونے کا متمنی ہو گیا۔ غالب کا شعر ہے۔

گلشن کو ادائیری از بسکہ خوش آئی ہے  
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے  
اس مضمون کو آتش نے یوں ادا کیا ہے۔

گئے جس بزم میں روشن چراغ حن سے کڑی  
بہار تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے  
ناسخ خزان کی توجیہ اسی انداز میں کرتا ہے۔

اس رشک گل کے جاتے ہی بس آگئی خواں  
ہر گل بھی ساتھ ہو کے چین سے بھل گیا

جب محبوب چین میں آتا ہے تو فطرت نامیہ شوق بیکہ کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر  
گل کو اس کے گوشہ دوستار تک پہنچانے کے لئے بنے تاب ہو جاتی ہے۔

دیکھ کر تجھ کو چین بسکہ منو کرتا ہے  
خود بخود پیو پیو پیو ہے گل گوشہ دستان کے پاس (غالب)

میر صاحب نے قسیم سحری کے اترانے کی زلف محبوب سے توجیہ کی ہے۔  
لگ بھگ کی گویا مگر بھری زلف سے آنے میں باد صبح کو یاں اک دماغ ہے  
صبا کی بد دماغی پر اس مضمون کا دوسرا شعر ہے۔

شاید اس زلف سے لگی ہے میر باؤ سے اک دماغ نکلے ہے  
بہار میں جو رنگینوں کا جوش ہے اس کی دین بکتہ رس شاعر کی آنکھ کسی  
کے خون تنہا کو شریک دیکھ لیتی ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو رنگ بہار میں ایسا  
بھمارا اور چوکھا بن نہ آتا۔

ایسا کہاں بہار میں رنگینوں کا جوش شامل کسی کا خون تنا ضرور تھا (جگر)

اسی مضمون کے موطن خاں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ تخیل کی ایمائی قوت کا کمال دکھایا ہے۔

باد بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشت باغ کو کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کیساتھ پہلے شعر میں خوشبو اور دوسرے میں رنگ رمز کی علامت اور محرک جذبہ ہیں۔

نومن خاں کا خیال تھا کہ مرغ چمن موسم بہار میں اس لئے بیتاب ہوتا ہے کہ بہار نے محبوب کے مسکرا کے آنے کی ادا سیکھ لی ہے ورنہ اس میں کوئی دلکشی نہ ہوتی۔ شاعر نے اس شعر میں عاشق کے دل کی کیفیت کو مرغ چمن کے دل پر طاری کر دیا اور اس طرح بہار کی حیثیت ضمنی رہ گئی۔ مرغ چمن کی وارفتگی کی اصل وجہ مشوق کی مسکراہٹ ٹھہری جو دروں بینی کا کمال ہے۔

نہ جائے کیوں دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی

بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

نبہت گل کسی کے کوچے میں پہنچنے کے لئے ایسی بیتاب ہوتی ہے کہ صبا کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے تاکہ اس کے نہارے وہاں تک رسائی ہو سکے۔

گر نہیں نبہت گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردہ جولان صبا ہونا (غلام) اگر چمن سے شاعر کو جذباتی تعلق نہ ہو تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا اس کا مقصد محض خارجی مظاہر کا تماشا نہیں ہوتا بلکہ اندرونی اور تخیلی مطالبات کو پورا کرنا۔ اس مضمون پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زہنارے لطف اگر میر چمن کا ساتھ اپنے جو وہ سروں فراز نہیں ہے (حسرت)

سیر گل خوش نہیں آتی کسی عنوان نہیں جا کے لوٹ آتے ہں دیوار گلستاں کے قریب

(حسرت)

فصحا، ص ۱۰۰، سہ ماہی، لاہور، ۱۳۸۵ھ، ص ۱۰۰، سہ ماہی، لاہور، ۱۳۸۵ھ، ص ۱۰۰



ہنسی کہ عشق نہیں ہے گل و بسن مجھے <sup>۲۶</sup> دلِ فیر دے جاتا ہے چمن سے مجھے (رضاعی و سنت)  
 بعض اوقات جدائی کی حالت میں مرغِ چمن کی زمرہ سنجیوں سے لطف کے بجائے کوفت  
 ہوتی ہے اور سننے والے کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان میں زبردست  
 ایمانی کیفیت ہے جو یادوں کو تازہ کرتی ہے۔

از بس جنونِ جدائی گلِ پیرامن سے ہے  
 دلِ چاک چاک نغمہٗ مرغِ چمن سے ہے (ہون)

اسی مریخ کی نسبت میر صاحب فرماتے ہیں :-  
 محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے  
 کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا  
 اگر ایک دفعہ عاشقِ چمن سے بیزار ہو کر اٹھ جائے تو پھر اس کی کوئی دلکشی اس کو اپنی  
 جانب متوجہ نہیں کر سکتی۔ میر صاحب نے عاشق کی نازک دماغی کی تصویر اس شعر  
 میں کھینچی ہے :-

اٹھا جو بلغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکار ہے  
 میر صاحب کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں :-  
 گلِ لگے کہنے کہو منہ نہ اُدھر ہم نے کیا  
 کلِ دلِ آزدہ گلستاں سے گز رہم نے کیا

اب کی ہزار رنگِ گلستاں میں آئے گلُ  
 پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گلُ

گلشنِ بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب  
 پر اُس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

مجھ کو دماغ و صفتِ گلِ ویا سن نہیں  
 میں جوں نسیمِ بادِ فروشِ چمن نہیں

جہاں ہم بٹھائے لگا لگا کر بٹھائے  
 دماغ کا شکے اٹا بھی، تک وفا کرتا

م بن بن سے مل ہیں چڑ سے نظر جو یہ لیا روس ہے اوپے ماک دھر جو

گل پھول سے کب اُس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں لائی بہار ہم کو دور آوری چین میں

ابھی لگے ہے تجھ بن لگشت باغ کس کو صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

اسی مضمون کا جرات کا شعر ہے :-

یاد کس گل کی تھی یارب مے تن سے لگی آگ سی دل میں جو سیر گل و گلشن سے لگی  
کبھی عاشق چین سے کتر اگر گزر جاتا ہے کہ کہیں اس کے حال دار کو دیکھ کر  
ہر گل تر ایک چشم خونچکاں نہ بن جائے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

۱ ہر گل تر ایک چشم خونچکاں ہو جائے گا (غالب)

غم فراق کی حالت میں عاشق کو گل کی بے محل معنی بُری لگتی ہے اور گلشن سے  
اس کی طبیعت گھبراتی ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہا بجا کا (غالب)  
شاعر کے لئے بہار میں ایک طرح کی ایمانی قوت ہوتی ہے۔ اس سے اس کی یادیں  
تازہ ہوتی ہیں۔

جلوہ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد جو شش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے  
ابر شفق آلودہ کو دیکھ کر شاعر کو یہ یاد آیا کہ کسی کی فرقت میں چین ایسا معلوم ہوتا  
تھا جیسے اس پر آگ برس رہی ہو۔

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا

(غالب) کہ فرقت میں تری آتش برتی تھی گلستاں پر

اسی مضمون کو غافانی نے یوں ادا کیا ہے :-

بدلا ہوا مختار نگ گلوں کا ترے بغیر کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سا چمن میں تھی  
اصغر کا شعر ہے :-

نگاہ شوق کو یارائے سیر دید نہ ہو جو ساتھ ساتھ تجلی حسن یار نہ ہو  
چمن میں باد بہاری کے قدم بے جس طرح نئی زندگی جنم لیتی ہے اسی طرح  
ماریں اور شکستہ دل میں کرم یار کی یاد سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

دل پر شوق میں آئی کرم یار کی یاد  
کہ چمن میں قدم باد بہاری آیا (حسرت)  
ہماری شاعری میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں کہ شاعر  
گلشنِ فطرت کی نیرنگیوں کا تماشا اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے  
سے کرتا ہے اور ان کی شاعرانہ توجیہ پیش کرتا ہے۔ اردو کے مختلف دوروں کے  
شرا کے کلام سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔  
دلی کا شعر ہے :-

جاتا ہوں باغِ یادیں اس چشم کی دلی شاید کہ بوسے اس کی ہونگس کی باں میں  
میر صاحب کے دیوان میں گل و گلشن کے اصطلاحی استعاروں کی سینکڑوں  
مثالیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے دیوان میں اتنی  
مثالیں نہیں ملیں گی۔ یہاں صرف چند پیش کی جاتی ہیں۔  
مروست شاہ خاک میں مل گئے تو نے گلشن میں کیوں خرام بکھا

اس چہرہ کی خوبی سے عیث گل کو جتایا یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

گل کام آدے ہے ترے منہ کے نثار کے صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

ہر نقشہ، ماسے شہِ خزار شک بہار کہ گورثِ محمود سرتا۔ ج۔ ہند

ای۔ دو دہریں ہے بہ بہار اب یہ	سرمایہ چاہیں یہ
سرو گل اچھے ہیں دونوں مثنوی میں گلزار کی لیک	چاہے رُو اس کا سارو ہو قامت و ساق استہ
اگر چہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے	ولیک چاہئے ہے منہ بھی ناز کرنے کو
آفستہ میرے خون سے لے کاش جا کے پہنچے	کوئی پر شکستہ تک گلستاں تلک تو
پائے گل اس چین میں چھوڑا گیا نہ ہم سے	سر پہ ہمارے ابھی تہمت ہے بے پری کی
گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی چاہے	یعنی ہزار جی سے تسربان ہو رہا ہے
گل کھلے صدر رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم	مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جاتا گیا
گلگشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے	آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے
کیا جانیں وہ مرغان گرفتار چمن کو	جن تک کہ بعد ناز نسیم سحر آئے
سروت و بالا ہوتا ہے درہم برہم شاخ گل	ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک پلا تلے ہو
سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو	ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار آئے
گل نے ہزار رنگ سخن و اکیا و لے	دل سے گھٹیں نہ باتیں تری پیاری پیاری

۱۰۴۱۔ میرزا سائیں سے ساتھ یا سے دیکھا وادھ رہا ہے سارے پن لے بیچ

بیچ پوچھو تو کیا ہے گا اس کا سا دھن غنچہ تسکین کے لئے ہم نے ایک بات بنائی ہے

برسوں سے گل چین میں نکلتے ہیں رنگ رنگ دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اے کہیں نکلا نہیں ہے ایک رخ یا رسا ہنوز گل حیرتی ہے صورت دیوارسا ہنوز

کھلتا کم کم کلی نے سیکھا ہے اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھے تھے منہ و زور بھول چین کے کس کے منہ سے ایسی غبت کتنے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

چمن میں گل نے جو گل دعوے جال کیا جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

مصطفیٰ کے شعر ہیں :-

لے مانتا بھی اپنے محبوب کے ترسا سے گلشن فطرت کی دھار جی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بہئے زلف و رخت می روند وی آیت صبا بنیالہ سائی و گل بمسودہ عمری  
فرخندہ لؤلؤ تو چمن را حیات وہ جد بنفشہ تو صبا را حمرہ کشائے  
مرغول سینں از دم کوئے تو خوش نسیم زلف صبا ز خاک جناب تو شک سائے

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جبے چمن میں <sup>۳۲</sup> ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ  
 کھول دیتا ہے توجہ جاکے چمن میں انھیں پا بہ زمزمیہ نسیم سحری نکلے ہے

غائب کے یہاں یہ مضمون طرح طرح سے ملتا ہے۔ مثلاً اپنی وارفتگی اور حیرانی کو  
 فطرت پر اس طرح طاری کرتے ہیں :-  
 آئینہ خانہ ہے صحن چمنستان یکسر بسکد ہیں بنخود و واغہ و چران گل و صبح <sup>۳۳</sup>  
 گل اور صبح دونوں فطرت کے کس قدر لطیف منظر ہیں۔ ان دونوں کی حیرانی اور ظلم  
 میں کس قدر شغرت ہے۔ پھران کی حیرانی انھیں کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ  
 پورے چمن پر چھا جاتی ہے اور اسے آئینہ خانہ بنا دیتی ہے۔ حیرانی کی مناسبت سے  
 چمن کا آئینہ خانہ بن جانا شعری رمزیت کا کمال ہے۔  
 ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

چشم بے خون دل و دل تہی از جوش نگاہ زباں عرض فنون جوس گل تا چند (منوچہ)  
 یعنی اگر آنکھ خون دل سے نا آشنا ہے اور دل جوش نگاہ سے بے گمان ہے تو ہنس گل  
 کی فنون کا رویوں کا ذکر بے معنی ہے۔ یا یوں کہیے کہ تماشا نے گل و گلشن اس وقت وجہ  
 جواز رکھتے ہیں جبکہ آنکھ خون دل سے اور دل جوش نگاہ سے آشنا ہو۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ لالہ زار کا ہر ورق،  
 ورق انتخاب ہے۔ اس کی سیر اسی کو زیب دیتی ہے جو صاحب دل و نظر ہے۔  
 ہر کس و نا کس کا یہ منصب نہیں کہ سیر گلشن کی آرزو کرے۔

بے چشم دل نہ کر ہو کس سیر لالہ زار یعنی یہ ہر ورق اور لالہ زار کا (منوچہ)  
 گلستان کی تمام لہزمہ بنیوں کی قیہ غائب اس طرح کرتے ہیں۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان محل گیا بلبلیں سن کر مے نالے غزل خواں ہو گئیں  
 شام کو اے لالہ زار اور صبح کے نظر فریب ہونے کا احساس ہے لیکن زندگی

سے شکایت ہے کہ بہت کم ہے۔ فرصت نظر جتنی ہونی چاہیے اتنی نہیں۔  
میں چشم واکشاہ وگلشن نظر فریب لیکن بحث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں  
اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے:

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے اسے عندلیب جل کے چلے دن بہار کے  
شاعر کے نزدیک گلوں کی برگ ریزی ایک طرح کی ذرا نشانی ہے جو محبوب کی  
گل ادا می بلج کے طور پر جن سے وصول کرتی ہے۔

برگ ریزی ہائے گل ہے وضع ذرا نشاندہی باج یمنی ہے گلستان سے گل اندامی تری (منوچہر)  
گلشن میں محبوب کی بے جا بیوں کو عاشق پسند نہیں کرتا اور اپنے ہند بر رشک  
کو احساس حیا سے تعبیر کرتا ہے۔ نہکت گل سے عاشق کو نرم آنا عجیب غریب نزاکت  
خیال پر دلالت کرتا ہے۔ مہشوق کی بے جا بیوں سے پہلے نہکت گل کی بے جا بیوں پر وہ  
حرف گیر ہوتا تھا لیکن اب اسے خاموش ہونا پڑا۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے جا بیو آنے لگی ہے نہکت گل سے جیا مجھے  
کبھی محبوب کی سیر گلشن کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ وہ اس بہانے سے  
اپنے زخمیوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا  
گئے تھے سیر گل کو دیکھنا تو جی بہانے کی

شاعر جب زندگی کو سمجھنے کے لئے اپنے محبوب یا غیر خود کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے  
تو اس طرح قطع نظر ہوتا ہے۔

فسر دہی میں ہے فزاید بے دلاں تجھ سے چراغ صبح و گل موسم خزاں تجھ سے  
یمن یمن گل آئینہ و دستار ہوس امید محو تماشا ہے گلستان تجھ سے  
اتند! یہ موسم گل و طلسم کج قص خرام تجھ سے عبا تجھ سے گلستان تجھ سے  
(سید صاحب)

اور جب اپنی ذات کے توسط سے کائنات کی بزم تماشا کو سمجھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے:

درسِ عنبران تماشا پہ تغافلِ خوشتر ہے نگہ رشتہ شیرازہ مرگان مجھ سے  
اثرِ آبلہ سے چادہ صحرائے جنوں صورتِ رشتہ گوہر ہے چراغِ مجھ سے  
بگڑ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد ہے چراغانِ خس و خاشاکِ گلستانِ مجھ سے  
پھر اپنی ذات اور محبوب دونوں کی اہمیت اس شعر میں واضح کی ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوہ رنگین مجھ سے آئینہ داری یک دیدہ حیران مجھ سے  
غالب نے ایک اور جگہ ذاتِ باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے  
کہ شعلہ ایمان کی آتشِ افروزی تیرے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو  
نہیں کہ انسان کی اہمیت کسی طرح کم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی رونق انسان ہی کی  
ذات سے وابستہ ہے اس لئے کہ تمدن کا خالق وہی ہے۔

آتشِ افروزی یک شعلہ ایمان تجھ سے  
چشمِ آرائی صد شہرِ چراغاں مجھ سے

بعد میں اقبال نے اس تصور کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا اور کائنات کے نظام  
میں انسان کی اہمیت واضح کی۔ انسانی فضیلت کا مضمون اقبال کے کلام میں  
قدم قدم پر ملتا ہے۔ لیکن اس تصور سے غالب بھی نا آشنا نہیں ہے۔ اس کا شہرہ  
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم نے یا مجھ سے مری بہت عالی نے مجھے  
غالب نے ایک پوری غزل ہوس گل کے اسرار و طلسم پر لکھی ہے۔ گل  
یہاں شاعر کے تخیل کا خارجی نمونہ ہے۔ کہتے ہیں۔

بے کس قدر ہلاک فریب و فائے گل بلبیل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل  
بلبل کے اس بھوکہ پر کہ گل کا رنگ و بو قائم رہتے والا ہے گل نہیں رہے ہیں۔  
بلبل کی دیوانی حرکتوں پر گل کہ جی نہیں دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے

ہیں کہ جس چیز کا نام عشق ہے وہ اہل میں دماغ کا خلل ہے۔  
بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشقِ خلل ہے دماغ کا  
گل والی غزل شے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔



ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار میرا رقیب سے نفس عطرائے گل  
گل کی خوشبو سے عاشق کی رقابت عجیب و غریب مضمون ہے یہ رقابت  
اس لئے ہے کہ بہار نے یہ خوشبو محبوب کی خاطر پیدا کی اور اس کو محبوب سے  
قرب و اتصال نصیب ہوگا۔ چنانچہ گل کی ہر ادا ناگوار ہے۔ ایک تو اس  
کی خوشبو سے رقابت کی وجہ سے ناگوار ہے اور دوسری وجہ اس شعر میں بتائی ہے  
سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی خون ہے میری نگاہ میں رنگ آدائے گل  
محبوب کا حسن غیور اپنی ماضیت کو عار سمجھتا ہے اور اسے یہ بات پسند نہیں  
کہ مجھے کسی اور کی اداسی معلوم ہو۔ چنانچہ گل کی رنگینی اور اس کی اداسی میری  
نظر میں خون معلوم ہوتی ہیں۔

اب محبوب کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے کر گلوں کے شگفتہ ہونے کی  
اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔

یرے ہی جلوے کا بے وہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل دستفائے گل  
یعنی گل جو ایک دوسرے کے بعد جن میں برابر کھلتے رہتے ہیں تو اصل  
میں یہ تیرے جلوہ کا ذوق دیدار ہے جو انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔  
مقطع ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل  
یعنی مجھے اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے  
اپنی جیب قبائے گل میں بنایا ہے۔ اس طرح میرا محبوب صرف میری محبوب  
نہیں ہے بلکہ کائنات کے لطیف ترین مظاہر بھی اس کے حلقہ بگوش  
ہیں۔ اس سے اپنی اور محبوب دونوں کی بڑائی ثابت ہوتی ہے۔

گلشنِ فطرت کا مشاہدہ ہمارے دوسرے شاعروں نے بھی اپنی اپنی سب  
کے موافق کیا اور اس کے نظامِ عام میں اپنی اور کبھی اپنے محبوب کی اہمیت  
واضح کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ذوق کا شعر ہے۔

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چین میں ہے ذوق  
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ظفر کچے ہیں۔

نہ ہوں سیرِ چین کی نہ گلِ ترکی ہوا  
سر عاشق میں ہے اس سروِ من کی ہوا

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک

پھیلا رہا ہے سرو لب جو بسا رہا تھے  
(جلی علی شاہ)

اے عنذلیب تجھ کو بے راحت چین میں کیا

اس رشک گل کا جلوہ ہے سروِ من میں کیا  
(زکی دہلوی)

کھولے ہوئے رہتے ہیں گل ویا سمن آغوش

بننا ہے غرض شوق میں تیرے چین آغوش  
(زکی دہلوی)

رونقِ محفل جو وہ رندِ شہرابی ہو گیا

پھولِ ساعربین گیا غنچہ نگلابی ہو گیا  
(امیر لکھنوی)

بہارِ گل کیا ہے اسکو بھونچو چین میں چل کر یہ دیکھو

کشمِ رخسار پر تہا رے جلے گی میلِ تنگ بوکر  
(داغ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا

اگر چلے تو نیم بسا رہو سکے چلے  
(داغ)

چپک چپک کے کہیں گل بنا کہیں لاال

چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا  
(شریف لکھنوی)

گل ہیں پڑ مردہ تو غنچہ بھی گرفتہ دل ہے

جاتے ہی یار کے رونق گئی گلزاروں کی  
(رند)

اس روش سے وہ چلے گلشن میں

بچھ گئے پھول صبا لڑے گئی  
(امیر بیانی)

گھوٹی کو دیکھ کے سودائے زلف یار ہوا  
بہار آئی تو سر پر جنون سوار ہوا

(است بناری)

گلی گلی سے مجھے بوسے یار آتی ہے

(جلیل)

ساغر کسی سے چوٹ پڑا ہے شراب کا

(جلیل)

پھول توڑوں تو ہاتھ جا دم آئے

(جلیل)

کچھ اٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خواب ناز میں

(جلیل)

جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

(جلیل)

گھوٹی پر پڑ گیا شاید پسینہ دے جان کا

(اشرف)

دامان عاشقان ہے گلستان عاشقان

(حسرت)

گر چشم شوق میں اک حسرت کا گھوڑا پیا ہے

(حسرت)

چلی کہ دیکھے تماشائے تری سواری کا

(حسرت)

عجب ادا سے چین میں بیدار آتی ہے

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ

آج ہے وہ بہار کا موسم

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اتنے صبح

موسم گل میں حسینوں کا موقع ہے چمن

چمن میں ہر طرف بٹے محبت مچھوڑتی ہے

زیغنی سرشک محبت کے حسن سے

تسے دے دل آرا کے تصویر کا عالم تھا

چمن میں باد بہاری بھی گل کی آنکھوں سے

غالب کے ان گلشنِ فطرت کی رنگارنگی کے مشاہدے کے ساتھ ایک اور  
نیا خیال بھی ملتا ہے جو اقبال سے پہلے شاید غالب ہی نے بیان کیا ہے۔ غالب  
نے بھی فطرت کا مشاہدہ اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے سے کیا ہے۔  
اس لئے صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ خارجی فطرت کا صرف تسبیح و تعریف کو ترجیح  
دیا کہ وہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس لئے تمنا ہے کہ گلشن کے ساتھ  
تنائے چیدن کی کسک محسوس کی۔ انسانی خواہشات سے منظر فطرت کا جب ربط  
قائم ہو جاتا ہے تو ان کے مہل انہار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ غلبہ کے نزدیک  
گلشن بہار خود تنائے چیدن کی متقاضی ہوتی ہے اس لئے لکھتا ہے سوہرا اگر گلشن ہے  
تاجہ نہ ہے تو غلط۔ غالب بہار گلشن کو پیدا کرنے والے کو اس طرح خطاب کرتا ہے۔

تاشائے گلشن تنائے چین بہار آفرینا بگنہ گار ہیں ہم  
غالب کے اس شعر میں اقبال کے تصورات کی حرکت اور قوت نہایت لطیف  
انداز میں نظر آتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ حکیمانہ موضوع شعریت کو مجروح کرتے ہیں  
اس شعر میں حکمت کو نغمہ کے ساتھ بڑی خوبی سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ تعجب  
اس امر پر ہے کہ غالب کے انتخاب میں یہ شعر چھوٹ گیا۔ اس غزل کے دو اور  
شعر نہایت بلند ہیں۔ کہتے ہیں :-

ذوق گریباں نہ پروائے داماں بنگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم  
اسد اشکوہ کفر و دعائے ناسپاسی ہجوم تناسے لاچار ہیں ہم  
آپ نے مندرجہ صدر مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ کس طرح تخیل کی گلکاری  
سے غزل گو شاعر کی دہون بینی انسانی جذبات کے طلسم کو فطرت پرطاری کرنے کی کوشش  
کرتی ہے اور کائنات مہر کہ میں اس کو بس وہی نظر آتا ہے جس کو اس کا اندرونی احساس  
دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ تخیل و جذبہ دونوں منظر الوہیت ہیں اور اس لئے تقدس کے  
حامل۔ یہ زندہ اور موثر حقائق ہیں جو خارجی کائنات کے حوادث کو اپنی گرفت میں  
لینے اور ان پر اپنا رنگ طاری کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں کے  
اشارہ چشم و ابرو پر انسانی دنیا کی ساری حرکت اور رقص منجی ہے۔ اگر یہ نہیں تو  
پھر کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا کیفیت و سرور دل زندہ کار ہیں منت ہے :-

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیسرے جینے سے  
تخیل اور جذبہ کی آمیزش اور ہم آہنگی اپنے تخلیقی جوش میں ان ابدی  
السرار کو ہم پر منکشف کر دیتی ہے جن تک پہنچنے کے لئے تعقل کے پر جلتے ہیں  
ان کے باد پیر حوار ہو کر انسان ابدیت کی واویلوں کی سیر کر سکتا ہے۔ وہاں  
اسے جو طلسم اور مٹاشے نظر آتے ہیں انھیں رمز و ایما ہی کے ذریعہ بیان  
کرنا ممکن ہے۔ دراصل غزل کی مزیدہ گلکاری کی بھی یہی وجہ ہے کہ رمز و کنایہ کو  
منطقی تسلسل بیان کی حاجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں بھی شدت احساس کی

کار فرمائی ہوگی وہاں کلام میں عدم تسلسل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ سامع کے تخیل کا فرض ہے کہ وہ عبارت کے خلا کو اپنی ذہنی کاوش سے پُر کرے۔ دنیا کی اکثر الہامی کتابوں میں آپ ہی خصوصیت پائیں گے منطقی تسلسل خارجی واقعات اور حقایق کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے منطق عقل کی زبان ہے۔ وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہے جو منطقی استدلال و تسلسل سے بے نیاز ہے اور اسی وجہ سے اس کے جذب و تاثیر کی کوئی انتہا نہیں۔

یہ درست ہے کہ جذبہ کارمزی بیان صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں۔ اعلیٰ پایہ کی نظم میں بھی یہ ممکن ہے لیکن شاد و نادر نظم میں عمرانی اور فطری حقایق کے خارجی احوال کے علاوہ اندرونی کیفیات بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور خاص حالات میں سامع کے دل میں انبساط و انقباض اور جوش و نفرت و محبت کے جذبات برانگیختہ کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن نظم کی ٹیکنک کا اقتضایہ ہے کہ مطالب واضح طور پر اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ ابہام اور اجمال نظم کے لئے سازگار نہیں۔ اور غزل کی یہی دونوں چیزیں جان ہیں۔ رمز و کنایہ میں اگر تفصیل آگئی تو وہ بے مزہ ہو جائیں گے۔ پھر اس کے علاوہ چونکہ غزل میں واردات حسن و عشق کو بیان کیا جاتا ہے جو نہایت گہری اور پراسرار ہوتی ہیں اور تفصیل کی تحمل نہیں ہو سکتی اس لئے رمز و کنایہ کے بغیر چارہ نہیں۔ قلبی واردات ہمیشہ ابہام اور اجمال کی تقاضی ہوتی ہیں۔ شہج درد و اشتیاق اور ذکر جمال اجمال چاہتا ہے، کنایہ چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات کہی جائے مبہم طور پر کہی جائے۔ دل کو کنایہ اور اجمال پسند ہے اور دماغ کو تشریح و وضاحت۔ استعارہ اور رمز و کنایہ کی ایمانی قوت سے شاعر کے محدود مشاہد میں بے پائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہیے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے جن سے تحت شعور کی بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور تازہ ہوتی

ہیں۔ غالب نے اپنے کلام کی جہاں خصوصیات بتائی ہیں ان میں اجمال، ابہام اور کنایہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ انھیں پر تاثیر کا دار و مدار ہے۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی نفرداد کے متعلق کتنی گہری اور وسیع تھی۔ وہ کہتا ہے :-

فکر میری گہرا اندوز اشارات کثیر کلک میری رقم آموز عبارات قلیل  
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق توضیح میرے اجمال پر کرتی ہے تراوش تفصیل  
یہ اشعار اگرچہ ایک قصیدہ میں کہے گئے ہیں لیکن ان میں تفریل کی روح بیان کر دی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے قصائد میں بھی غزل کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس کے قصائد دوسروں کے قصائد کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے بلکہ ان میں استعارہ اور رمز و ایما کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔  
رمز و ایما کی اہمیت کے متعلق غالب کے کلام میں اور بھی اشارے ملتے ہیں۔ وہ یلداے سخن کو محل نشین راز ہی رکھنا چاہتا ہے :-

شوخ، اظہار کو جزو حشت بنوں اسد  
بسکہ یلداے سخن محل نشین راز ہے (نسخہ حمیدیا)  
سخن عشق کی سوختہ نفسی اس کے دل کی اندرونی بہار کی آئینہ دار ہے جسے وہ  
رمز و چمن ایما کی خوشنما ترکیب سے ظاہر کرتا ہے :-

بانغ خاموشی دل سے سخن عشق اسد  
نفس سوختہ رمز چمن ایما کی ہے (نسخہ حمیدیا)

یہ یقینی ہے کہ غزل گو شاعر اپنے کلام میں جو لفظ برتا ہے ان سے ظاہری معنوں کے علاوہ بھی اس کا کچھ مقصود ہوتا ہے۔ لفظوں کو وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بظاہر جتنا وہ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقت میں کہہ جاتا ہے۔

مقصود ہے نام و غمزہ و لے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشمنہ و مخبر کہے بغیر

ہر چند ہوشا بدہ حق کی گفتگو<sup>۴۱</sup> بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے پھر  
غالب نے فارسی میں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے -  
رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد  
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نرود

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

فرقیست نہ اندک زدلم تا بدل تو

معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

غزل گو شاعر رمز و کنایہ کی ایمانی قوت سے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا کرنا چاہتا  
ہے جو موسیقی میں بولوں سے پیدا کی جاتی ہے جو صوتی رموز ہیں۔ وہ چیزوں کے  
نام نہیں لیتا اور نہ واقعات کو مفصل بیان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف خفیف سا  
اشارہ کر دیتا ہے۔ درد کے اس شعر کی ایمانی کیفیت ملاحظہ ہو۔

ان لبوں نے نہ کی میسمائی ہم نے سو سو طرح سے مردیکھا

سودا کے اس شعر کی ایمانی قوت کی کوئی حد نہیں۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو بھیے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں  
خفہ کا شعر ہے :-

لے جنون ہاتھ سے تھے نہ رہا آخر کار چاک دامن میں اور چاک گریبان میں فرق  
غالب اور مومن کے ہاں رمز و کنایہ کو بڑی خوبی اور نزاکت سے برتا  
گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں جن پر ہماری زبان اور ادب جتنا ناز  
کریں بجا ہے۔

## غالب

درد منت کش دوانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برانہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی غمان گیر بھی تھا  
قید میں ہے تے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک سنج گراں بارلی رنجیر بھی تھا

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا  
دم لیا تھا نہ قیامت نے مہود پھر ترا وقت سفر یاد آیا  
سادگی ہائے متنا یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا  
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا  
کوئی ویرانی سی ویرانی کی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
میں نے مجنوں پہ لڑکین میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا  
غائب کی غزلیں کی غزلیں کنایوں سے بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ کنائے محض  
کنائے نہیں بلکہ لطف شعری میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس  
کے کلام کا بیشتر حصہ رمز و کنایہ کی کیفیت میں رچا ہوا ہے۔ پورا دیوان  
دیکھ جائیے کوئی غزل ایسی نہیں ملے گی جو لطف سے خالی اور محض بیانیہ  
ہو۔ بیانیہ غزلیں بھی جن میں تسلسل ملتا ہے زیادہ تر استعارہ کی زبان میں  
کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کا تسلسل رمز و کنایہ کا تسلسل ہے نہ کہ منطقی تسلسل۔  
اس کی بزم خیال کی رنگارنگی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں صرف دو غزل لیں  
ملاحظہ طلب ہیں۔

ظلمت کردہ میں میرے شب غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر سو غموش ہے  
نے مژدہ وصال نہ نفقہ رہ جمال مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے  
منے کیا ہے جن خود آرا کو بے حجاب اے شوق یاں اجازت بتلک و بوش ہے  
گوھر کو عقد گردن خواب میں دیکھنا کیا اوج پرتا رہ گوھر فروغش ہے  
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خروش ہے



## قطعہ

لے تازہ وارد اں بساط بھائے دل  
دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو  
ساقی یہ حلہ دشمن ایمان و آگہی  
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط  
لطف خرام ساقی و ذوق صدے چنگ  
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں  
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی  
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

زہنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے  
میری سنو جو گوش نصیحت نبوش ہے  
مطرب ہو نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے  
دامان باغبان و کف گل فروش ہے  
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے  
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے  
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے  
غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

پھر کچھ اک دل کو بیتیاری ہے  
پھر جگر کھودنے لگا ناخن  
قتلہ مقصد نگاہ نیاز  
چشم و لال جنس رسوائی  
وہی صد رنگ نالہ فرسائی  
دل ہوائے خرام ناز سے پھر  
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے  
پھر اسی بی وفا پہ مرتے ہیں  
پھر کھٹا ہے در عدالت ناز  
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر  
پھر دیا پارہ جگر نے سوال  
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب  
دل و شرکان کا جو مقدمہ تھا

سینہ جویائے زخم کاری ہے  
آمد فصل لالہ کاری ہے  
پھر وہی پردہ عمارتی ہے  
دن خریدار ذوق خواری ہے  
وہی صد گوشت اشکباری ہے  
عشرتستان بے قراری ہے  
زور بازار جان پیاری ہے  
پھر وہی زندگی ہماری ہے  
گرم بازار فوجداری ہے  
زلزلت کی پھر سرشتہ داری ہے  
ایک فریاد آہ و داری ہے  
اشک باری کا حکم جاری ہے  
آج پھر اس کی رو بجاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؒ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے  
 ان دونوں غزلوں میں جو تسلسل ہے وہ رمز اور استعارہ کا تسلسل  
 ہے اگر ضمنی طرز پر مضمون کا تسلسل بھی آگیا۔ غزل کی اصلی خوبی مضمون کا  
 تسلسل نہیں۔ شاعر کو اختیار ہے کہ اگر اسے باقی نہ رکھنا چاہے تو ہر شعر  
 میں علیحدہ رمز کی کیفیت پیش کرے۔ اس کے ہر شعر کو بجائے خود مکمل حقیقت  
 حاصل ہوگی اور وہ اندرونی تجربہ کے ہر لمحہ کی طرح کافی بالذات ہوگا۔  
 اس طرح غزل گو شاعر رمز میں کچھ چھپاتا ہے اور کنایہ سے کچھ بتاتا ہے لیکن اس  
 طرح کہ اشاروں کو سمجھنے والے ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

مومن خاں کے کلام میں بھی رمز و کنایہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور  
 چونکہ وہ کنایہ کے ساتھ بہت کچھ مطالب اور ان کی منطقی گڑیاں حذف  
 کر جاتے ہیں اس لئے مسامح کو ٹھٹک کر ذرا سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا کہہ گئے۔  
 ان کے کلام میں خالص کنایہ کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ جیسی اردو کے نثری اور  
 شاعر کے یہاں نہیں۔ مثلاً

دشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں لے ہم نفسِ نزاکت آواز دیکھنا

فعلہٗ دل کو ناز تا لبس ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

دیدہٗ حیران نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

یہ مذر استخوانِ جذبِ دل کیسا گل آیا میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا گل آیا

کچھ نفس میں ان دلوں نگہاے جی آشیانِ اپنا ہوا بر باد کیا  
 دل ربانی زلفِ جاناں کی نہیں بیچ و تاب طرہٗ ششدا دکیا

۴۵ ان نصیبوں پر کیا خستہ شناس آسمان بھی ہے ستم ایسا دیکھا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا  
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سوہتا رے سوا نہیں ہوتا

پوچھنا حال یار ہے منظور میں تے ناصح کا مدعا جانا  
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تو نے موہن بتوں کو کیا جانا

امتحان کے لئے جفا کب تک التفات ستم ناکب تک

مانگا کریں گے اب سے دعا بھاری کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گزرے صیاد کی نگاہ سوئے آشاں نہیں  
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فرق ملج ہی کہے آؤ گرا فسانہ خواں نہیں

نہ جائے کیوں دل مرغ چین کی سیکھ گئی بہار وضع ترے سکر کے آنے کی  
خیال زلف میں خود رنگی نے قبر کیا امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

صبر و حشمت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے  
کثرتِ سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں یا مال سر نہ ہو جائے  
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

معانی کی ایمانی رمزیت اردو کے سب بڑے شاعروں کی کلام میں ملتی ہے  
چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے  
 اتنی بھی بُری ہے بے قراری اب آپ سے اُس کم کریں گے (آتش)  
 کج ادائی یہ سب ہیں تک تھی اب زمانہ کو انقلاب کہاں (شفق)  
 صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی (بمقروح)  
 تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے (گستاخ رامپوری)  
 اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی چاک دامان بھی بانداڑہ دامان نکلا (امیر مینائی)  
 کیوں جنوں پھر نہ بیاہاں میں بہا آئی ہو بڑھ چلا ہے میرے دہن سے گریاں میرا (فانی)  
 بہت خجل ہے تیرے درد سے دعا میری یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری (فانی)  
 زندانیوں کو آکے نہ چھیڑ کرے بہت جان بہارِ زر گس رسوا کہیں جسے (خست)  
 مرگ عاشق تو کچھ نہیں سکیں اک میحانِ نفس کی بات گئی (صغز)  
 گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا (جگر)  
 انسانی شعور اور تحمت شعور میں بہت کچھ ہے جسے لفظوں میں صراحت (ثاقب لکھنوی)

ظاہر نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اس کے کوئی خارجی معین خطوط نہیں ہوتے بلکہ ایک مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کے شعوری یا تحت شعوری تاثرات و احساسات کو صرف رمز و ایما ہی کے ذریعہ سے بیان کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے جو مسرت یا تاثر حاصل ہوتا ہے اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو نغمہ و موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب ہے اور اسی میں اس کی پائنداری اور قوت کا راز مخفی ہے۔ لیکن شعر اور موسیقی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر الفاظ کا جامہ زیب تن کرتا ہے جن کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور وہ عمرانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے صرف ان تصورات کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں۔ ہر لفظ حقیقت میں ایک تصور ہے جو اپنے اندر بعض مخصوص تاریخی اور تمدنی لوازمات پوشیدہ رکھتا ہے۔ لیکن موسیقی لفظوں سے بے نیاز ہو کر رمز و علامت سے جمالیاتی اثر آفرینی کرتی ہے۔ شعر میں وزن اور بحر اور قافیہ اس کی ایمانی کوتاہی کو بڑی حد تک دور کر دیتے ہیں۔ اور خود لفظ اپنی مکانی اور عمرانی نوعیت کے باوجود زبردست ایمانی قوت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں ٹھیک طور پر استعمال کیا جائے۔ بعض بحریں ایسی پھڑکتی ہوئی اور قافیے بولتے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ بجائے خود شعر کے معنی سے زیادہ جاذبِ قلب و نظر ہوتے ہیں۔ سنتے ہی ان سے احساسِ متاثر ہوتا ہے۔ بعد میں دماغ معنی پر غور کرتا ہے۔ معنی اور لفظ دونوں سے زیادہ اہم خود شعر ہے جو اگرچہ بادی النظر میں لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں سے الگ اپنا آزاد طلسمی وجود رکھتا ہے۔ شعر صرف احساس و خیالات کو منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ بھی ہے وہ لوگ جو شعر کے مقصد کو سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ انھیں

اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ خود شعر کیا ہے۔ اس قسم کے نقاد اکثر و بیشتر شعر کی موسیقیت کو نہیں محسوس کرتے۔ تحلیل و تجزیہ شعر کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔ شعر کے بنیادی تصور کی جب توجہ کی جائے تو وہ نثر بن جاتا ہے۔ شعر کی شعریت بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس نقطہ پر پہنچ کر نقاد کا نقد و نظر سکوت سے بدل جاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا وہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی سب کچھ کہنا باقی ہے۔ شعری رمز کے آگے نطق و بیان سر بجر بیان نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غزل کے شعر کو صرف اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت الگ ہے اسی طرح ہر ایک کے ذاتی تجربے علیحدہ ہیں۔ اس لئے شعر ہمیشہ کے علیحدہ علیحدہ معنی ہمیشہ رہیں گے اور انفرادی احساس کی طرح شعر کی شعریت کا تعین بڑا دشوار رہے گا۔ ممکن ہے دو اشخاص کم و بیش ایک ہی قسم کے اشعار کو پسند کرتے ہوں لیکن ان اشعار سے جو تاثرات مترتب ہوتے ہیں وہ دونوں کے لئے مختلف ہوں۔ ہر عہد کی تنقید میں شعر سے مختلف مطالبے کئے جایش گئے اور مطالبہ کرنے والے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہوں گے کسی زمانے میں بھی کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا کہ شعر کو ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہ ہونا چاہیے صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر زمانے میں شعر غزل سے جو مطالبہ کیا جائے گا اس میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر ملیں گی۔ مثلاً یہ کہ وہ موسیقی میں رچا ہوا ہو۔ ہمارے جذبات و شعور میں نزاکت پیدا کرے اور زندگی کے واقعات اور تجربوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں اس انداز سے پیش کرے کہ ہم اپنی طرز پر انھیں پہلے سے بہتر محسوس کر سکیں اور پہلے سے بہتر سمجھنے لگیں۔ الفاظ "زندگی" بہت وسیع اور جامع لفظ ہے۔ اس میں ان حقائق حیات کا تعین کرنا پڑے گا۔ جو غنائی شاعری یا غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔ پن چکی

اور ریل گاڑی نظم کے موضوع ہو سکتے ہیں لیکن غزل کے موضوع نہیں بن سکتے۔ داستانِ حسن و عشق کے علاوہ جو کبھی فرسودہ نہ ہوگی حکمت و اخلاق اور تصوف کے نکات بھی غزل کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن انھیں محض گوارا کیا گیا ہے۔ اس کا اصل موضوع ہمیشہ عشق مجازی ہی رہا۔ غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علانی کا جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں تعلق بھی ضرور ہوگا۔ غزل گو شاعر کی رمز آفرینیاں اور استعارے زندگی کے فلسفی علانی کی تصویریں ہیں۔ ممکن ہے بظاہر معلوم ہو کہ یہ تصویریں زندگی کی ہو بہو نقل نہیں۔ لیکن نقل تو شاعر کے پیش نظر کبھی ہوا ہی نہیں سکتی۔ وہ اشیاء اور حقایق کو ویسا نہیں دیکھتا جیسے کہ وہ ہیں یا بظاہر نظر آتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے مظاہر کو اپنے جذبہ کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ ان کی کیا شکل نکلی۔ وہ اپنے جذبہ درون سے زندگی کی تصویر میں رنگ آمیزی کرتا ہے، جیسی تو وہ جاذبِ نظر بنتی ہے۔

غزل گو شاعر کی درون بینی اور تخیل نگاری کا مقصد حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایمانی انداز سے بیان کرنا ہے۔ اس داستان کا وہ خود ہیرو ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا ہر شعر اس کھمبول کا ایک قطرہِ حقیق ہو اور اس کے اندرونِ تجربہ کے کسی ایک لمحہ کا اس میں مل اظہار پایا جاتا ہو۔ عشق جذباتِ انسانی کا مترج ہے۔ عالم کی رونق اور ہماہمی اسی کی کرشمہ زائیں کی رہیں منت ہے۔ زلیست کا مزہ بغیر عشق کے ممکن نہیں۔ یہ دوسکی دوا بھی ہے اور پھر خود ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں۔ بقول غالب۔

عشق سے طبیعت نے زلیست کو زپایا درو کی دوا پائی درد لا دوا پایا  
فسادِ محبت اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی زندگی۔ اس دل پذیر افسانے کے جتنے محوئے جہے یادیں وہ انھیں سائے بغیر نہیں رہتا۔ جھوٹے کیا خوب کہا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فنا کی ۔ نانا تاجار باہے جسکو قربانیا دہوتا ہے  
 بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزل لکھنے والے شاعروں کا ادعا ہے عشق مصنوعی  
 اور ان کا معیار محبت پست ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے ۔ اگرچہ  
 اس میں شبہ نہیں کہ جب وہ حسن و جمال کا ذکر کرتے ہیں تو بالعموم ان کی  
 مراد مجاز ہوتی ہے سو اے چند صوفیانہ رجحانات رکھنے والوں کے بھروسے  
 حقیقت مراد لیتے ہیں ۔ سو اے تیر درو ، نیاز بریلوی ، اصفغر گوندوی  
 اور چند دوسرے شعرا کے غزل نگاری میں عشق مجازی ہی کو کمال بینی کے  
 انداز میں پیش کیا گیا ہے اور حبیبی محبت کے وارداتوں اور معاطوں کو  
 لطف بیان میں سمو کر دل پذیر بنایا گیا ہے ۔ پھر اس وادی کا کوئی نشیب فراز  
 ایسا نہیں جو ہمارے غزل گو شاعروں کی نظر سے بچ گیا ہو ۔ ان کو محبت  
 کی دنیا کے حقائق پسند ہیں ۔ ان کے علاوہ خارجی عالم کے حقائق ان کے  
 نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے ۔ اس واسطے وہ ان کی طرف اگر کبھی نظر  
 اٹھاتے ہیں تو نظر پلٹ آتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں ۔  
 ان کے ذہن و فکر پر عشق کا جذبہ ایسا طاری رہتا ہے کہ وہ اسی کی بصیرت  
 سے دنیا کو دیکھتے ہیں ، چاہے وہ حقیقت کی دنیا ہو یا مجازی ۔

بقول ولی -

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا  
 بعض غزل گو شاعروں کے ہاں شاید بازی اور کامجوبی کے اشارے ملتے  
 ہیں لیکن بالعموم بواہر ہوس اور محبت میں فرق و امتیاز کیا گیا ہے ۔  
 میر صاحب فرماتے ہیں :-

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر  
 غالب کا شعر ہے -

ہر بواہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی



میر صاحب نے عشق بتان کے شعری رمز کو ایک جگہ صاف طور پر واضح کر دیا ہے صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا ہے عشق سے بتوں کے مراد علاقہ کچھ اور جذبات عشق کی پاکبازی اسی طرح لازمہ شعر ہے جس طرح حسن کی معصومیت کا تصور عشقیہ واردات اور اپنی رنڈ مشربی کے لئے غزل گو شاعر جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ بطور علامات و رموز کے ہیں جن کے ذریعہ ان کہنی باتیں بھی کہی جاتی ہیں اور اس سلیقہ سے کہی جاتی ہیں کہ کیا کہنا۔ اس باب میں ہمارے شاعروں نے رمز نگاری کا جو کمال دکھایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں ملنی دشوار ہے۔ رمز و کنایہ کی ایمائی قوت اور تشبیہ و استعارہ کی بدولت کلام کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور لفظ و معانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ سامع پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ مجاز و حقیقت میں جس طرف چاہے اپنی توجیہ کے رخ کو پھیر دے۔ میر تقی میر کے اس شعر کو آپ دونوں طرح سے سمجھ سکتے ہیں اور دونوں طریقے پر اس کے معنی میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ اگرچہ میر صاحب عام طور پر مجاز ہی سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا عشق خالص انسانی عشق ہونے کے علاوہ کوئی اور دعویٰ نہیں کرتا۔ شعر ہے۔

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں بوجھوں کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی  
یا مثلاً غالب کا یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر حاوی ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گل جب قبائے گل  
غزل میں دیدہ و دانستہ محبوب کے جنس کو نہیں ظاہر کرتے اس لئے کہ رمز و ایما کا یہی اقتضا ہے۔ جب کبھی اس کا ذکر آتا ہے تو مذکر صفت

و افعال استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ بات غیر فطری

ہے۔ لیکن جو شخص روح غزل کا راز دہاں ہے اس کے نزدیک اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزل کی رمز نگاری کا یہی اقتضا ہے چاہے

کہ جس طرح حقیقت و مجاز کے فرق و امتیاز کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ ذوق خود اس کا فیصلہ کرے اسی طرح معشوق کے جنس کو بھی ابہام کے نقاب میں لپیٹ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مشرقی آداب اسے گوارا نہیں کرتے کہ محبوب کی نسوانیت کو بے پردہ کیا جائے اور دوسرے غزل کی ٹیکنک رمز و کنایہ کو تفصیل و تشریح پر مقدم قرار دیتی ہے۔ پھر چونکہ اردو غزل نے اپنی خوشہ چینی فارسی غزل سے کی تھی جس میں محبوب کی جنس کو مذکور ظاہر کیا جاتا تھا اس لئے اردو میں بھی یہی طریقہ مستقل ہو گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ایرانی تہذیب و معاشرت سے اتنی مشابہ تھی کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اگرچہ بعض جگہ غزلوں میں محبوب کی نسوانیت ظاہر ہو گئی ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہے۔ جہاں نسوانیت ظاہر کی گئی ہے وہاں بھی ایک خاص سلیقہ پیش نظر رہا ہے۔ نسوانیت کا جہاں اظہار ہو گیا ہے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ تیر صاحب کا شعر ہے۔

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے غالب کے شعر ہیں :-

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز      بیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس      سر سے تیز دشنہ و مڑگاں کئے ہوئے  
اک تو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ      چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہیں  
چاہے پھر کس کو مقابل میں آرزو      زلف سیاہ رخ پر پریشاں کئے تھے

مٹ نہ کھلے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں      زلف سے چڑھ کر نقاب اس شوخ کے نہ کھلا

مومن خاں کے شعر ہیں :-

چاکر پے سے یہ غم ہے یں قول پردہ نشین      ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریاں ہوں گے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی جنوں کا      سایہ سے میرے وحشت لے رشک پئی اتنی

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشین      تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

حسرت کا شعر ہے      پردہ سے اک جھلک جو دکھلا کے رو گئے      مشتاق دید اور بھی لہجہ کے رہ گئے

ایسی شاہوں سے تو دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں جن میں معشوق کے      لئے مذکور صفات افعال لائے گئے ہیں تاکہ اس کی پردہ دری نہ ہو۔ چند      مثالیں ملاحظہ ہوں۔

### میر تقی میر

یار عجب طرح نگاہ کر گیا      دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا  
تنگ قبائی کا سماں یار کی      پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

اے نیکے یہ تھی کہاں کی ادا      کھب گئی جی میں تیری بانجی ادا  
بات کہنے میں گالیاں دے کر      سنتے ہو میرے بد زبان کی ادا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا      سنبھل چین کا مفت میں پامال ہو گیا  
دعویٰ کیا تھا گل نے تے رخ سے باغ میں      سیلی نگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

### غالب

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا      بات کرتے کہیں لب تشنہ تندر یہ بھی تھا  
البتہ ہو تم اگر دیکھے تو آئینہ      جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

خوب پردہ ہے کہ چلین سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی ہیں  
نظامِ رامپوری  
انگلائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا مجھے تو چھوڑ دے مسکرا کے ہاتھ

### حسرت

بنے وہ رونقِ محفل جس انجمن میں ہے رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں رہے  
اسی سے چھپتے ہیں ہونی ہے جس پر انکی نظر اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں  
نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا — تو حلِ دل نے کہا: آشکارا ہم بھی ہیں

ناگوار ہے بہت تلخی، ہجرانِ مسکین تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی  
اربابِ اشتیاق سے پروانہ چاہیڈ اے حسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کرے ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کرے  
ہم جو پرستوں پہ محماں ترکِ وفا کا یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے

لطف یہ ہے کہ بعض خواتین صاحبِ دیوان گزری ہیں۔ وہ بھی اپنے  
لئے صفات و افعالِ مذکر استعمال کرتی ہیں اور اس طرح آدابِ غزل کی پوری  
پوری پابندی کی جاتی ہے۔ صبا بی بیگم شہزادہ آتش، نواب شاہ جہاں بیگم  
شیریں والیہ ریاست بھوپال اور شمس النساء بیگم ترمذی مکھنوی کے کلام میں  
اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ رمز و ایما کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھانے  
کے لئے غزل گو شاعر محبوب کے لئے عام طور پر ایسے الفاظ بطور استعارہ

استعمال کرتے ہیں جن سے جس ظاہر نہ ہو جیسے بت، صنم، نازنین، شوخ،  
گلرو، گل، جاناں، دلدار، دلربا، دلبر، ظالم، تغافل، شمار، خانہ خراب،  
تند خو، جفا جو، بے وفا وغیرہ۔ یہ الفاظ بغیر اسم اشارہ کے استعمال کئے جاتے  
ہیں اور ان سے مراد محبوب ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بسانِ کاغذ آتش زدہ میرے گلرو تیرے جلے بھنے اور جی بہار رکھے ہیں

(درد)

سرو برگ رنگین نگاری کہاں تک

(حسرت)

جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

(درد)

خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

(درد)

میں بے صبر اتنا ہوں وہ ندخو ہے

(درد)

دیتا ہے جان عالم اسکی جفا کے اوپر

(میر)

اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

(میر)

اس کی دیوار کا کسے سے سایہ نہ گیا

(میر)

کوئی بھیجیو ظالم کہ تسی تو کر آوے

(میر)

جی پہ کیا جلتے کہ کیا گذرا

(میر)

بیاں ہو چکی ہم سے اس گل کی خوبی

تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا

کون دل پہ کہ جس میں خانہ خراب

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا

میلانِ دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر

برقع سے اٹھا چہرہ وہ بت اگر آئے

بیتے جی کوچہ دلدار نے جایا نہ گیا

نک بعد مرے میرے طرفداروں کئے تو

آج اس راہِ دل ربا گذرا

خدا شرما ہاتھوں کو رکھتے ہیں ناکش میں کبھی میسے گریاں کو کھجی جانان کے دہن کو

(غالب)

کیوں نہ ہو دلبروں کو شوقِ بستم اہل دل کو ہے بے کسی کی ہوس

(احسرت)

ظالم کہیں روا نہیں عاشقی سے احتراز کہدے اگر ہوشک سخن داد خواہ میں

(مومن)

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

(مومن)

کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن اب چھپاتے ہو عبت بات بناتے کیوں

(مومن)

خوشی نہ ہو مجھے کیونکو قضا کے آنے کی خبر ہے لاش پہ اس یوفا کے آنے کی

(امومن)

کسی طرح جو نہ اس بُت نے اعتبار کیا میری وفاتے مجھے خوب شرمسار کیا

(داغ)

کیا صبا کو چہ دلدار سے تو آتی ہے مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بو آتی ہے

(داغ)

اس نازنین نے جب سے کیا ہے وہاں مقام گلزار بن گئی ہے زیں و کن تمام

(احسرت)

اس جفا جو سے یہ ایمائے تنہا تک ہوس لطفِ عنایت چلی جاتی ہے

(احسرت)

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعرا کو کیا اب جواب دوں منگہ انتظار کو

(جلیل)

ہے تیری جوانی کہ پھٹی پڑتی ہے ظالم پر کوئی سنبھالے دل بے تاب کہاں تک

(جلیل)

غالب نے سخن محبوب کو بلائے جان بتایا اور اس کی گہری شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزا میں تقسیم بھی کر دیا۔ عبارت، اشارت اور ادا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات  
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیسا

یہی تینوں اجزا تغزل کے اصلی عناصر ہیں۔ غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر۔ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا اول الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جو نثر نے اپنے ذمے لے لیا۔ شعر کا اور خاص طور پر غزل کے شعر کا سرمایہ اثر و تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبہ کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔ ان رنگوں کی آمیزش کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ مثلاً اگر غزل کے کسی شعر میں صرف اشارت کی خوبی موجود ہو اور عبارت اور ادا میں بھدایں پایا جاتا ہو تو شعر اوصحرا اور بے اثر رہے گا۔

عہد حاضر کے سب سے بڑے غزل گو شاعر حسرت نے بھی اس باب میں غالب کے خیال کی تائید کی ہے۔ اس کا شعر ہے۔

ہر حرف میں اس نامہ رنگین کے ہیں پنہاں

جدت کے، عبارت کے، اشارت کے نذایذ

فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا غالب نے جس شے کو ادا سے تعبیر کیا تھا اس کو حسرت نے جدت کہا ہے۔ مرزا غالب نے عبارت، اشارت اور ادا کی

---

لے اگرچہ اس جگہ شاعر نے ادا سے ناز و ادا مراد لیا ہے لیکن ادا حسن اظہار کے لئے وسیع معنوں میں بھی آتا ہے۔ حسن اظہار مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے زبان و بیان کے ضمن میں یہی حسن ادا اسلوب و طرز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

عجبیوں کو محبوب کی گفتگو میں محسوس کیا اور حسرت نے دوست کے نامہ رنگیں میں لیکن حقیقت میں بات دونوں نے ایک ہی کہی ہے۔ ادا میں جب تک جدت نہ ہو وہ ادا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک ہی ادا بار بار دہرائی جائے تو وہ لازمی طور پر بے مزہ اور بے کیف اور بے اثر ہو جائے گی۔ جدت ہی حسن ادا کی ضمانت ہے۔ غرض کہ مرزا غالب اور حسرت نے سخن محبوب کا جو تجزیہ کیا ہے وہ غزل کی خارجی اور معنوی خوبیوں پر حادی ہے اور اس کے محاسن کا معیار کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارت اور حسن ادا کی کارروائی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ عاشق کی گفتگو ان شعری عناصر سے خالی رہے۔ غزل محض شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ اس پر وہی اصول عاید ہونے چاہئیں جن کی جھلک غالب اور حسرت جیسی حساس طبائع رکھنے والوں نے محبوب کے کلام میں دیکھی۔ بقول سبیر شاعر، عاشق اور دیوانہ ہم کیف ہتیاں ہیں جنہیں عقل نے ایک ہی سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان میں بہت سی باتیں قدر مشترک کے طور پر ملتی ہیں۔ چنانچہ بے غلب نہ ہونا چاہیے کہ ان کے معیار حسن و قبح میں بہت کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے عاشق کی گفتگو بہت کچھ محبوب کی گفتگو کا انداز اور رنگ و بھنگ اڑالتی ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دل بھی تیسے ہی رنگ سیکھا ہے    آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے  
جگر نے اسی مضمون کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔  
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں    کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر  
دوسری جگہ کہا ہے۔

عشق کا سحر کامیاب ہوا    میں ترا تو میرا جواب ہوا  
ایک جگہ اس طرح جذب عشق کی تاثیر کو ظاہر کیا ہے۔  
تاثیر جذب عشق کا اندر سے کمال    آئینہ بن گئے تیری ایک اک داکہ ہم (جگر)



عاشق اور معشوق کے انداز فکر اور کلام کی یکسانیت اس لئے ضروری نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ معاملات شوق زبان و منطق سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس منزل میں بغیر زبان جانے ہوئے بھی سب مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

بکے است ترکی و تازی دریں معاملہ حافظ

حدیث عشق بیاں کن بہ ہر زباں کہ تودانی  
اسی مضمون کو حسرت نے بھی ادا کیا ہے۔

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرفِ کرم کو

مگر جند وہ اردو ہے نہ ترکی ہے نہ تازی

حسن و عشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعران کے ذریعے

سے رموز حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ

ایک فطری کشش ہے جو دل میں ذوق اور شورش پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی انسان

چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے

ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اسی کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائلی صفات

بناتی ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور اس کی منزلیں اتنی ہی

وسیع ہیں جتنی کہ کائنات۔ حسن کی قدر افزائی چراغِ عشق کی روشنی ہی میں ممکن ہے

عشق اور حسن دونوں اپنی اپنی جگہ کائناتِ مدرک کے اہم مظاہر ہیں شاعران دونوں

کو برابر کا رتبہ دیتا ہے۔ جس طرح بغیر عشق کے حسن کا وجود بے معنی ہے اسی طرح بغیر حسن کے

عشق کے مقصود و نہاد کا مین کرنا ممکن نہیں اس مضمون پر حسرت کے متعدد شعر ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

بچ پوچھئے تو حسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق یہ جان عاشقان ہے وہ جانانِ عاشقان

اس شعر میں اگرچہ حسن و عشق کا مرتبہ برابر تسلیم کیا گیا ہے لیکن حوالہ کامر کو عاشق کی

ذات ہے نہ کہ محبوب۔ عشق میں ایک طرح کی داریوں بینی اور خودی کا احساس

شدت سے پایا جاتا ہے۔ عشق کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ جذبہ کو ہر چیز پر فوقیت دے۔

یہاں تک کہ بعض اوقات خود حسن پر بھی۔ جذبہ ذات الہی کی طرح مطلق محض بننا چاہتا ہے۔  
 حسرت حسن کی عظمت تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں  
 بیان تمنا اور زبان محبت سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔  
 نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی بیان تمنا زبان محبت (حسرت)  
 عشق چلے کتنا ہی رام حسن رہے لیکن اس کو اپنے وجود کی اہمیت کا ہمیشہ  
 احساس رہتا ہے۔

عشق ہر چند رام حسن رہا پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس (حسرت)  
 پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ عشق صادق حسن  
 کامل سے نہ ذکر برتری کرے اور نہ سے۔

عشق صادق نے حسن کامل سے نہ سا ذکر برتری نہ کیا (حسرت)  
 لیکن کبھی کبھی نیا زندی کے عالم میں عشق حسن کی فوقیت کو عارضی طور پر تسلیم  
 کر لیتا ہے۔ قافی کا شعر ہے :-

خود حسن کمال حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے اور عشق مال عشق ہے یعنی عشق میں کامل کی نہیں  
 کبھی کبھی حسرت نے بھی حسن کے رتبہ کو عشق سے بلند کر دیا ہے۔  
 رتبہ تر سے حسن فنوں کا رکا شوق کے رتبے سے بھی فوق ہے (حسرت)  
 دوسری جگہ کہا ہے۔

بڑھا تو خوب مگر نار عاشقی کا جلال حریف جلوہ نور جمال ہو نہ سکا  
 اور چونکہ عشق وجدانی طور پر جانتا ہے کہ سوائے حسن کے اس پر کوئی دوسرا حکمران  
 نہیں ہو سکتا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی گردن نیاز اس کے آگے خم کر دیتا ہے۔  
 سرعجز حسرت بھی خم کیوں ہوتا ترانا ہے حکمران محبت (حسرت)

(۱۱) میر حسن دہلوی  
 عشق کا اب مرتبہ پہونچا مقابل حسن کے بن گئے بت ہم بھی آخر اس صنم کی یادیں

نیاز شوق کے موضوع پر حسرت کی زمزمہ سنجی ملاحظہ ہو۔

روشن جمال یار سے دینائے عشق ہے گویا شرابِ حسن بہ مینائے عشق ہے  
کیا کیا فراقِ حسن میں ہے نغمہ ریزِ غم جانِ حریف کہ بیل گویائے عشق ہے  
لے حسن بے مثال تری دید کے لئے درکارِ دیدہ دل بینائے عشق ہے  
تیرا خیال منزل مقصود آرزو تیرا جمال شاہدِ رعنائے عشق ہے  
مدت کے بعد پھر وہ ہوئے نالِ کرم یہ بھی تو لاک طریقہٴ احیائے عشق ہے  
پہناںِ حجابِ ناز میں ہے صورتِ جمال پیدا صرف شوق سے معائے عشق ہے  
حسرت کو پائے بندیِ ایمان سے کیا غرض وہ کافرِ جمال ہے ترسائے عشق ہے  
اردو کے تغزل کا میلان زیادہ تر عشقِ مجازی کی طرف رہا۔ اگرچہ بعض شاعروں  
نے مجازی کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت کے رموز و اسرار کی بھی نقاب کشائی  
کی ہے۔ دراصل عشقِ مجازی ہی میں انسانی قلب پر وہ وارداتیں گذرتی ہیں  
جن کا براہِ راست اس کو تجربہ ہوتا ہے اور جو اس کے لئے جذباتی اصلیت  
رکھتی ہیں۔ مجازی حسن چاہے کتنا نامکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گیر لیا  
عالمگیر ہیں۔ جمالِ لیاقتی تجربہٴ خود علم کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کی بدولت  
صدائق اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ اس تجربہ میں محفل کے  
خواب سے حقیقت پیدا ہوتی ہے جس کی پرورشِ جذبہ اپنے آغوش میں کرتا ہے  
اور اشیاء اور حقائق کے تعلق کا تعین من مانے طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے  
غزل گو شاعر کا نقطہٴ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کو استعاروں اور کنایوں  
کے جال میں اس طرح پھانسا چاہتا ہے کہ اس کا تعلق اس کے خیالی پیکروں سے  
ٹوٹنے نہ پائے جو اس کے دل کی دنیا میں براجمان ہیں۔

۷۔ انفرادیت خود مکفی ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی  
خارجی منظر سے چاہے وہ کتنا ہی جمیل و حسین کیوں نہ ہو دل بستگی پیدا نہیں  
کرنا چاہتی اس لئے کہ یہ اس کے ضعف اور بے کمالی پر دلالت ہوگی۔

لیکن فطرت نے انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک پیدا کر دی تاکہ وہ کافی بالذات ہونے کے احساس کو شکست دے اور اپنے بعض دوسرے مقاصد عالیہ کی تکمیل کرے۔ درو اشتیاق کی کسک نے کافی بالذات خودی کو غیر خود کی کشش سے وابستہ کر دیا جسے فطرت کی زبردست کامیابی تصور کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی اپنی انفرادیت کی تنہائیوں میں گھٹ کر رہ جاتی اور اس کی افسردگی اس کی دائمی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی۔ غائب نے اس نکتہ کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو انسانی خودی کی خواہش ہے کہ وہ آزاد رہے اور اپنے آپ کو کسی سے وابستہ نہ کرے اور دوسری جانب فطرت یعنی غیر خود کی دلبستگی اس کو اپنی محبت کے دام میں پھانسنے کی فکر میں ہے۔ غرض کہ انسانی شخصیت کو عجیب و غریب کشکش آتے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ تو ہی میرے آزاد منشی کے دعوے کی شرم رکھ لے اس لئے کہ اگر میں اس کی زلف میں گرفتار ہو گیا تو میرا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ شر ہے۔

وہ حلقہ ہائے زلف کین میں ہیں خندا رکھ لیجو میرے دعوے وارستگی کی شرم دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ محبت سے مفر نہیں۔ سرو باوجود اپنی ساری آزادی کے گلشن کے زنداں خانہ میں گرفتار ہے اس لئے اس کا آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

افت گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی سرو ہے باوصف آزادی گرفتار حرم فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان تنہے دل میں درو اشتیاق پیدا کر دیا بلکہ اس کے نفس کو جمالیاتی حس سے آشنا کر دیا اور اس کو یہ صلاحیت دی کہ وہ تخلیق حسن کرے جس طرح وہ آفرینش اخلاق کرتا ہے۔ جمالیاتی حس عقل و ارادہ دونوں سے مختلف ہے لیکن ان دونوں کی طرح اس کا وجود بھی ذہنی ہے۔ جس طرح عقل صداقت،

کی اور ارادہ نیکی کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح جمالیاتی حسن عالم فطرت اور عالم انسانی میں حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تخلیق حسن خارجی محرکات کی محتاج ہے؟ اس سوال کے جواب میں ارباب فکر میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے عشق و حسن کی داستان کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ تخلیق حسن کیلئے کسی نے اپنے اندرونی تجربوں کو کافی خیال کیا اور بعض نے تھوڑا بہت خارجی محرکات کا استعمال کیا۔ ہماری شاعری میں فکر و احساس کے یہ دونوں انداز ملتے ہیں اور دونوں میں جمالیاتی قدروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

چونکہ درون بینی تغزل کی بنیادی خصوصیات میں ہے اس لئے بعض غزل گو شاعروں میں یہ میلان قدرتی طور پر پیدا ہو گیا کہ تخلیق حسن کو خارجی محرکات سے بے نیاز کر لیا جائے۔ یعنی عشق کیا جائے بغیر محبوب کے۔ درون بینی نے یہ راہ بتائی کہ خود اپنی ذات کو ہی اپنا معشوق کیوں نہ بناؤ۔ یہ خیال اردو شاعروں کی ایجاد نہیں۔ اہل یونان کے ہاں بھی اس کا پتہ چلتا ہے یونانیوں کے دیو مالان دریاے سے قنر کے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو بڑا ہو کر پورے یونان میں سب سے زیادہ خوش رو و نوجوان مانا جاتا تھا ایک دن کسی چشمہ کے پانی میں اس نوخیز خوش جمال نے اپنا عکس دیکھا تو دل و جان سے خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گیا۔ اپنے عکس کو دیکھنے میں اس پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ چشمہ میں گر کر ڈوب گیا۔ اہل یونان کا اعتقاد تھا کہ اس خوش رو نوجوان کی روح ایک خوبصورت پھول کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اہل یونان نے اس کو زرخس کے نام سے موسوم کیا۔ زرخس کا پھول آج سے شا بہت رکھتا ہے۔ اس وقت سے آج تک وہ کائنات حسن کا تماشا بنی ہے۔

یونانی نوجوان زرخس کے نام پر یورپ کی مختلف زبانوں کے ادب میں ”زرخسیت“ (زرخس ازم) کی اصطلاح رائج ہوئی جس کا مطلب یہ

ہے کہ آرٹسٹ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے۔ اس اصول کے حامیوں میں انتہائی دروں بینی اور انفرادیت پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات کو مصد رخیہ و شہرہ تصور کرتے ہیں اسی طرح اس کو خالقِ حسن بھی خیال کرتے ہیں۔ چونکہ تخلیقِ حسن کا تعلق اپنی ذات سے ہے اس لئے نہ کسی خارجی محبوب کی حاجت ہے اور نہ جذبہٴ عشق کی کارفرمائی کی۔ اس مسلک کے شاعروں اور ادیبوں نے حسن کو مطلق تجریدی شکل میں پیش کیا جو زندگی کی حرارت اور حرکت سے یکسر محروم ہے۔ یہ ایک طرح کا زندگی سے گریز ہے۔ اس قسم کے تصورات کا یہ اثر ہوا کہ احساسِ جمال کو عشق سے بے تعلق کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے انفرادیت پرست آرٹسٹوں نے اپنی ذات کو عشق و محبت کا مرکز ٹھہرا کر خارجی حسن سے بے نیازی کا اظہار کیا۔ لیکن ادب اور آرٹ کے یہ دونوں رجحان انتہا پسندی پر مبنی ہیں۔ اس لئے انھیں قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ دراصل جذباتی حقیقت دونوں انتہاؤں کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔ اردو و غزل نگاروں میں بعض کے ہاں یہ رجحان ملتا ہے کہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر لیا جائے۔ خاص طور پر عہدِ جدید کے شاعروں میں جگر کے یہاں اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مایوس ہو کے پٹلیں جب ہر طرف سے نظیراں      دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے گفتگو کی

کوئین کی ان بھول بھلیوں سے نکل جا      اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جانہ اُدھر جا

کہاں کا مئےِ فائدہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بے خودی کو  
یہی بنائے گی جام و ساغر۔ یہی کرے گی شراب پیدا

بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا      آخر پٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

دستِ جنونِ عشق کی گھلکاریاں نہ پوچھ ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہاریں

فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا دغ ہو جو بہارِ بزمِ مجھ میں ہے سارے گلستان میں نہیں

نازک مزاجِ عشق کی اللہ سے خاطرین اپنی نزاکتوں کو مرا دل بسا دیا

ایک گوشے میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں  
ان شہزادوں میں یونانی دیوانہ کے کیر کمر زنگس کی تنقید کی گئی ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

دیکھئے کیا شورا ٹھٹھا ہے حریمِ ناز سے سامنے آئینہ رکھ کر خود کو ایک سجدہ کریں  
تجگر کے چنڈ اور اشعارِ ملاحظہ ہوں یہ۔

بھرم کھونا کہیں اے دل! عشقِ معتبر ہو کہ گزرجا ہاں گزرجا حسن سے بھی بے خبر ہو کہ

عشق ہے اعتماد کے مقابلِ حسن کا اعتبار کون کرے

ہیں بن جائیں کیوں نہ صورتِ یار دل کو پا بند یار کون کرے

جس طرح عشقِ حسن سے بے نیاز ہو کر اپنی علو درہ ہستی کا تحقق کر لیتا ہے

اسی طرح وحشی بہار سے بے نیاز ہو کر صحرا کی طرف بھل جاتے ہیں۔

سوئے صحرا بھل چلے وحشی انتظارِ بہار کون کرے

عشق کیا پیر ہے! اک حشرِ در آغوشِ خیالِ حسن کیا! خواب ہے اک چشمِ تاشانی کا

اللہ اللہ زری وار ہو گئی عشقِ میری اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

صیاد میرے دم سے ہیں سائے یہ چھپے جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

بھڑے ہوئے میں نگاہوں میں حسن کے جلوے یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہو  
کہاں کے سر و صفت پر کہاں کے لالہ و گل نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہو

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جگر نے ہمیشہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے  
وہ عشق کے لئے حسن کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی وسعتوں سے بخوبی  
واقف ہے اس کا شعر ہے۔

وہ بھی نکلی اک شمع برق حسن میں جسے اپنی نظر سمجھا کیسا  
جگر ہر موقع پر خودی کو غیر خود کے عشق سے بے نیاز نہیں کرتا۔  
حسن برق و ش کی ادائیں اسے بھی گھائل کرتی ہیں اور بے تابی محبت و جھکون  
غم بنتی ہے۔ اس کی اس غزل کا موضوع یہی ہے۔

سب ان پر ہیں تصدق وہ سائے تو آئیں اشکوں کی آرزو میں آنکھوں کی التجاں  
اُس سے بھی شمع تر ہیں اس شمع کی ادائیں کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں  
اس حسن برق و ش کے دل سوختہ وہی ہیں شعلوں سے بھی جو پھیلیں دامن کو بھی پچائیں  
آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اسکو ناصح دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سماؤں  
بیتابی محبت وجہ سکون غم ہے آغوش مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں  
اشار بن کے نکلیں جو سینہ جگر سے سب حن یار کی تھیں بیاختہ ادائیں

دوسری غزل ملاحظہ ہو جس میں اپنی خودی کو غیر خود کے جمال سے وابستہ کر دیا ہے۔  
طا کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے مجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے  
میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے  
یہ تیرا نہ ہیں تو شوق سے چلائے جا خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے  
ازل سے حسن تو عاشق فواز ہے لیکن جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہے دے



جگر نے کبھی تو عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خودی حسن برق و ش کی اداؤں سے بری طرح گھائل ہے۔ کبھی ایسا عکس ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اساسی حقیقت عشق ہے یا حسن؟ مرکز حوالہ خود ان کی ذات ہے یا محبوب؟ اس شعر میں اس کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز تم جان آرزو ہو کہ ہم جان آرزو عاشقانہ شاعری کا اعلیٰ ترین مقام عشق الہی یا عشق اقدار ہے۔ درمیانی مقام عشق مجازی اور اسفل مقام ہوس پرستی کے جذبات۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں فرق و امتیاز ناممکن ہو جاتا ہے۔ جگر نے ایک موقع پر عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پرتو سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ صوفیاء تغزل میں مجاز کو حقیقت کا پرتو بتاتے ہیں۔ جگر کے اس نقطہ نظر میں تغزل کی حقیقی روح کا رفرمان ہے۔

صوفی نے جس کو شاہد مطلق سمجھ لیا اک پر تو لطیف تھا حسن مجاز کا اردو تغزل میں عشق مجازی کے واردات و معاملات کو پیش کرتے ہوئے

ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کی مثال شاید فارسی کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ عشق و محبت کا مضمون بظاہر چاہے کتنا فرسودہ ہی لیکن حقیقت میں اس کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ اس جذبہ کی نمایاں خصوصیت اس کی وسعت ہے جسے تغزل کے سینے سروں میں ظاہر کیا گیا ہے جو اپنی خود رفتگی اور درد مندی کے سبب سے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی خواہشات اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔ اگر حدیث شوق بیان کرنے والے کے لب و لہجہ میں اخلاص اور اس کے احساس میں شدت ہے تو دل چوٹ کھائیں گے اور سننے والے متاثر ہوں گے۔ لیکن اگر اس کے پیش نظر محض لفظوں کا الٹ پھیر یا ایسی مصنوعی آفرینہ ہے جو تصنع کے پرت پرتاؤ کرنا

چاہتی ہے تو اس کی بات بے اثر رہے گی اور خود کہنے والے کو جھٹلائے گی۔  
 غزل میں عشق کی واردات کے علاوہ محبوب کے حسن و جمال، ناز و  
 ادا اور جرجر و جفا کا بیان اس طور پر کیا جاتا ہے کہ سامع کے حافطہ میں بھولی  
 پسری یا دیں تازہ ہو جائیں اور وہ شاعر کے تجربوں میں خود بھی شریک ہو سکے۔  
 لیکن غزل گو شاعر ہر حالت میں ایک قسم کا لحاظ اور پردہ برقرار رکھتا ہے تاکہ  
 اسے جو کچھ کہنا ہے اس میں ابتذال اور رکاکت راہ نہ پائے۔ بیان مجاز میں  
 بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس واسطے کہ اس کے ڈانڈے ہوس پرستی سے  
 آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ غزل کے بڑے بڑے استادوں نے ہمیشہ اس  
 کا خیال رکھا ہے۔ میر صاحب کی شاعری قمار مجازی عشق کی شاعری ہے۔  
 انھوں نے انسانی عشق و محبت کے لطیف اور نازک جذبات کی سچی تصویریں  
 کھینچی ہیں جن میں نقشہ نام کو نہیں۔ ان کے ہاں معاملہ بندی اور واقعہ گذاری  
 ہے لیکن اس کی سطح بہت بلند ہے۔ ان کی سادگی پر لاکھ تکلف قربان ہیں  
 ان کا ہر لفظ بلاغت اور سوز و گداز میں رچا ہوا ہوتا ہے اس لئے نثر کی  
 طرح دل کے بار ہوتا ہے۔ ان کا سنجیدہ ذوق سخن اور اسلوب بیان بے مثل  
 ہے۔ ان کے عشق و محبت میں مجازی اور انسانی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔  
 ان کا کلام سن کر سامع لطف اندوز ہونے کے ساتھ اپنی فطرت میں بلندی اور  
 بالیدگی محسوس کرتا ہے۔ سینے وہ کیا فرماتے ہیں۔  
 جو تو ہی صنم ہم سے بسینار ہوگا تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا

جمن میں گل نے جو گل دعوے جمال کیا	جمال یار نے مت اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو	جمن کو میں قدم نے ترے ہمال کیا
لگانہ دل کو کہیں کیا نہ نہیں تو نے	جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی  
 لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کلم

دل سے شوقِ رخِ نمونہ گیا  
 ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک  
 جھانکنا تاکت کبھو نہ گیا  
 سرے سودائے جستجو نہ گیا  
 ایک پیش اس کے روبرو گیا

اے نیکلے یہ تھی کہاں کی ادا  
 جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیج  
 کھب گئی جی میں تیری بانگی ادا  
 دل چلے جائے ہے خرام کے ساتھ  
 ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا  
 خاک میں مل کے میسر ہم سمجھے  
 دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا  
 بے ادائی تھی آسمان کی ادا

جھائیں دیکھیاں بے وفائیاں دیکھیں  
 بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

میں تو خواباں کو جانتا ہی ہوں  
 فتن و فزا د کے وہ عشق کے شور  
 پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں  
 عشق کرتے ہیں اس پڑی رو سے  
 اب مرے عہد میں فسانے ہیں  
 میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آرزو اس بلند و بالا کی  
 دیدنی ہے شکستگیِ دل کی  
 کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے  
 مے تھنکے کہ لعل ہیں وہ لب  
 کیا عمارتِ غموں نے ڈھائی ہے  
 مرگ مجنوں سے عقلِ مگم ہے میر  
 یعنی اک بات سی بسائی ہے  
 کیا دوانے نے موت پائی ہے

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے ۴۰ پتھری اک گلاب کی سی ہے  
میں جو بولا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے  
میں ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

خدا کرے میرے دل کو تک اک قرار آئے کہ زندگی تو کروں جب تک کہ یار آئے  
ہیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے خدا ہی جانے کہ اب کب تک بہا آئے  
نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر تیر کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت پیار آئے

میر صاحب کی غزل گوئی انسانی اور مجازی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن کہیں  
بھی طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف راغب نہیں کرتی۔ یہ ایک عشق باز  
کی نازک قلبی وارداتوں کا بیان ہے جو اپنے خلوص اور سوز و گداز کے  
سبب سے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت کے تغزل میں  
چوچلا پن اور لطیف سی خارجیت اور ہوس پرستی ہے۔ جرأت کو الفاظ  
کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے لیکن وہ بلند جذبات براہِ نیچر نہیں کرتا۔ اس  
کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان باتوں کو جو درد پر وہ کہنے کی تھیں صاف صاف کہہ دیا  
اور اس طرح اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی جس سے وہ چاہتا تو بیچ سکتا  
تھا۔ وہ معاملات جو رمز و ایما کی زبان سے بیان کرنے کے ہیں تفصیل کے  
کس طرح متعل ہو سکتے ہیں۔ غزل میں معاملات کے اشارے ہونے چاہئیں نہ کہ  
معائنہ۔ کا بیان جرأت کے کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

م جاگلے سے تاب اب نے، نازن نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں  
کیا رکے وہ کہے ہے جو کمال سے لگ چلوں بس بس پے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں  
کیا جانے کیا وہ اس میں ملنے ہے حق جی یوں اور کیا جہان میں کوئی نصیب نہیں

قفسہ جو وہ کھینچے تو کھینچی جائے ادھر جان اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس باری ڈالے  
بے ہوش سا غفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا ڈرتا ہے کہ ایسا ہو کچھ منہ سے نکالے

تو گیا اور ہم تری صورت کو تکئے زہ گئے غمزدہ روتے تڑپتے سر پٹکتے زہ گئے  
عاشقوں کے دل بلاق یار کے موتی کی طرح بوسہ کی خواہش میں اس بربکتے زہ گئے  
اس غزل کے اشارے ذہن کسی بلند خیال یا نازک احساس کی طرف مائل  
نہیں ہوتا۔ لیکن اسی غزل میں ایک نہایت بلند شعر بھی ہے جسے سن کر سانس  
ٹھنک جاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی رمزی اور ایمانی قوت موجود ہے۔  
کارواں جاتا رہا باب اور ہم گم کردہ راہ گرد کے مانند صحرا میں بھٹکتے زہ گئے  
اس غزل کے مقطع میں لفظوں کا چخاؤ اعلیٰ درجے کا ہے لیکن چونکہ شاعر نے رفو  
کنایہ کی کوئی طلسمی کیفیت پیدا نہیں کی بلکہ حقیقی خارجی منظر کو پیش کرنے کی کوشش  
کی ہے اس واسطے سامع کے ذہن میں لطف کے ساتھ ایک قسم کا مضحکہ خیز تصور  
راہ پاتا ہے۔ مقطع یہ ہے۔

ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ اور ہم جرات پلک اپنی بھیسکتے رو گئے

اور دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اجل گر اپنی خیال حال یار میں آئے تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے  
انٹھے جہاں سے نہ جرات اٹھا کے در و دریاں الہی موت بھی آئے تو وصل یار میں آئے  
پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر جمال یار کے تصور میں موت آئے تو مزار میں بجائے  
فرشتہ کے پری آئے گی اور دوسرے شعر میں خدا سے تنہا کی ہے کہ موت وصل یار  
کی حالت میں آئے۔ دونوں تصورات بھونڈے، غیر شاعرانہ اور رکاکت کا پہلو  
لئے ہوئے ہیں جو ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔

کرو منع نامع کو ہم سے نہ بولے کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے

کہے کہ کوئی اس سے ملے کہ جرات تو کہتا ہے وہ از رہ طعن "ہاں جی۔ یہی تو حریف ار پیدا ہوا ہے" تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے

بھٹکے در پہ کہ کس حشر وہ بپا نہ کہیں زیرِ پیا اس دل مضطر کو دبائے رکھیے بیٹھیں کیا دور کہ چاہے یہی کثرتِ شوق آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے یہاں بھی جرات کی معاملہ بندی مجاز کی منزل سے عمل کر لیا ہو سی کے کوچے میں قدم رکھتے ذرا نہیں جھبکتی لیکن وہ لفظوں کا استعمال خوب جانتا ہے۔ آخری شعر میں جرات کی جگہ "ملائے" یا "لگائے" لائے تو شعر بے مزہ ہو جائیگا اگرچہ اس شعر میں رمز و ایما کی کوئی معنی یا داخلی خوبی موجود نہیں لیکن لفظ "بھڑائے" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ بعض لفظوں میں انہماک کی ایسی زبرد توت اور تازگی ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے مطالب کی سچی کایب بڑی حد تک چھپ جاتا ہے۔

جرات سے قبل خواجہ میر درد کے ہاں بھی "بھڑانے" کے لفظ کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا بھڑا دے منہ سے منہ ساتی ہمارا اور گلابی کا حسرت نے بھی اس لفظ کو برتا ہے۔

آج تو منہ لب ساغر سے بھڑائے میر سا قیام تجھ کو میری سستی پیاں کی قسم شعرائے متوسلین میں موتن خاں موتن نے عشیقہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کو عشق مجازی کے اظہار ذریعہ بنایا اور اس کی حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ ان کی مضمون آفرینی انسانی محبت کی وارداتوں اور معاملات تک محدود رہی لیکن ان کی خوش مذاقی نے انھیں کبھی پستی کی طرف نہیں جانے دیا۔ ان کی جذبہ نگاری کا دامن سستی اور مرخصانہ جذبہ فروشی کے

داغ سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں حسن کی ادائوں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنایہ اور استعارہ کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دلنشین تغزل کی مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

صبر و حُشت اثر نہ ہو جائے	بکریں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم	بکریں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تینوں رنگ کو مت دیکھ	تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے	وہ بت آرزوہ گر نہ ہو جائے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی میرے قتل کی باتیں	اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ	اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے	کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
-------------------------------------	-----------------------------------

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی  
کہا ہے غیر نے تم سے میرا حال  
کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن  
کہا ”میں کیا کروں مرضی خدا کی“  
داغ کی غزلوں کا عام رجحان بھی عشق مجازی کی طرف ہے لیکن اس نے  
رمز و ایما کی کیفیات کو اکثر برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب سے اس  
کا تغزل جرات کے تغزل کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے۔ اس کی شونہی  
اور اسیلے پن میں ایک خاص شان ہے جسے خوبی بیان اور حسن ادا نے اور  
بھی چمکا دیا۔ اگرچہ اس کے یہاں وہی پرانے فرسودہ مضمون ملتے ہیں۔  
جنھیں قدما کے وقت سے اب تک باندھتے چلے آئے ہیں لیکن وہ انھیں

میں نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی زبان میں خاص نزاکت، لطافت اور لہجہ ہے جو اس کے ہمعصروں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ امیر مینائی نے بہت زور لگایا لیکن وہ بات نہ پیدا کر سکے اور سامع کے لئے اس دل بستگی کا سامان فراہم نہ کر سکے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ترے غمروں کو اپنے کام سے کام کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے  
تم آؤ جب سوار تو سن ناز قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں اُن کی پھر آرزوئیں کرو گئے حیا کے آنے کی

مرے سوال کے معنی وہ نجم سے کہہ دیتے مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا  
نگاہ شوق پر الزام بے قراری کا تمہارے برق تجلی کو اضطراب نہ تھا  
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی اسے بتو ایمان داری اٹھ گئی  
بے طرح پھیلا ہے ان زلفوں کا جال اب اُمید رستگاری اٹھ گئی  
دور میں اس چشم مست ناز کے لذت پر ہیز گاری اٹھ گئی  
کس سے رکھے داغ چشم دوستی اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

بات میری کبھی سنی ہی نہیں جانے وہ بُری بھلی ہی نہیں  
لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد بائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں  
اڑ گئی یوں وفا زمانے سے کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں  
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتے وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں



مندرجہ ذیل غزل کے اکثر شعر موسیقی میں رچے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویر کشی جاذب نظر ہے ایسا ہی محاکات اور ترنم کی خوبیوں نے داغ کے آرٹ کو اس غزل میں بہت بلند کر دیا ہے۔ خصوصاً دوسرا شعر خوب ہے۔

حیا نے روک لیا جذب دل نے کھینچ لیا  
چلے وہ تیر کی صورت کھینچے کمان کی طرح  
جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود جیسے وہ آنکھ  
گری ہی جاتی ہے بیمار ناتواں کی طرح  
ادائے مطلب دل ہم سے سیکھ جائے کوئی  
انہیں سنا ہی دیا حال داستان کی طرح  
ایک اور شعر سن لیجئے۔۔

دل میں ساگنی ہیں قیامت کی شوخیاں  
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

ہمد جدید کے شعرا میں عشق مجازی کی کیفیات کو حسرت نے جس نزاکت اور لطافت سے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ رنگینی اور جوش بیان کے امتزاج سے وہ خیالات کا ایک طلسم سا باندھ دیتے ہیں جس میں داخلی تجربہ اور خارجیت کی جھلکیاں ایک دوسرے میں سموی ہوتی ہیں۔ ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ وہ میر تقی میر کی طرح مجاز کی منزل سے آگے بڑھنے کے کبھی دعویدار نہیں بنے۔ خیالات کی رفعت اور مٹھاؤ اور جذبات کے خلوص کے باعث انہیں اگر اس زمانے میں غزل کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انہیں بندشوں کی جست، لفظوں کی نشتر، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت میں کمال حاصل ہے۔ وہ عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات اور ان کے اتار چڑھاؤ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کی مثال شکل ہی سے مل سکتی ہے۔ وہ اس وادی کے ذرہ ذرہ سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ریخ و کلفت کا ذکر ملتا ہے جو اس وادی میں قدم رکھنے والے کو پیش آتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ پُر امید رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے غزل گو شاعروں میں کوئی بھی اتنا پُر امید نہیں جتنے کہ وہ ہیں۔ انہیں ہمیشہ اس ہایتیں رہنا ہے کہ آخر

میں ان کی سب آرزوئیں پوری ہوں گی۔ ان کے ہاں تیر کا سونہ و گداز اور داغ کی نشاط انگیزی دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ ثانی الذکر کا پلازما بھاری ہے۔ وہ زندگی کے امکانات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اپنے نغزل کو شریعت کے علاوہ اور کسی دوسرے خارجی محرکات سے آلودہ نہیں کیا۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ اگر انسانی جذبات زندگی کا جز ہیں تو ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ حسرت زندگی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ایسے رنگوں میں پیش کرتے ہیں جن کی آب و تاب آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی میں جو دل بستگی اور بے ساختہ پن ہے وہ دور جدید کے کسی غزل گو کے ہاں موجود نہیں۔

حسرت کے ہاں صنف غزل اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں غالب اور مومن کی نازک خیالی نے نیا روپ اختیار کیا ہے۔ آئیے ذرا ان کے کلام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ عشق و محبت کی داستان کو انھوں نے کس طرح سے بیان کیا ہے۔ حسرت کے یہاں انسانی زندگی محبت سے مبدلت ہے۔ اگر یہ نہیں تو زندگی بے رنگ اور بے کیف ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عشق کے مختلف مذاہج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اپنے تخیل کی مدد سے جنسی جذبہ میں تنزل کی کمال بنی پیدا کر دی ہے۔ اس کمال بنی میں جنسی جذبہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور ترکیب بھی۔ وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی چیز ہے۔ اس کی شدت اور حرکت کے ہر راز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ شریعت شرع میں اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ دل چاہتا کیا ہے، فطرت کی شدت اپنے کسی منشا کی تکمیل کے لئے پراسرار طریقے اختیار کرتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پردہ راز سے کوئی پیکار رہا ہے۔

جذبہ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے پردہ راز سے کیا تم نے بھارا ہے مجھے؟  
وادئ عشق کا مسافر جذبہ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اُسے

کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ چلتے چلتے تھک کر چور چور ہو جاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوت عشق اس کو سنبھال لیتی ہے۔

قوت عشق بھی کیا شے کہ ہو کر مایوس جب کبھی کرنے لگا ہوں میں سنبھال ہے مجھے آغاز محبت کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

دل کو تیری دزدیدہ نظر کے گئی ہے اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے  
اس بزم سے آرزو نہ آئے گی محبت آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے  
جب آلے کے گئی ہے ہنس تا کوئے ملاست مجبورئی دل خاک بسرے کے گئی ہے  
پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں دعا کو قسمت مری محروم اثرے کے گئی ہے  
لیکن واضح رہے کہ حسرت اپنی داستان محبت کو مایوسی کے بے پر ختم نہیں کرتے  
وہ بڑے پُر امید واقع ہوئے ہیں۔ باوجود ناکامیوں اور نامرادیوں کے امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ محبت کے ابتدائی تجربوں میں مایوسی ہوتی ہے۔ اس سے وہ بے خبر نہیں۔ کبھی مایوسی اور محرومی میں عاشق محبت سے دستبردار ہو جانا چاہتا ہے اور محبوب کو جتا دیتا ہے کہ دشمن وفا ہو کر دل کی خریداری ممکن نہیں۔ یہ جنس گرامی بے وفاؤں کے لئے نہیں۔

وفا سے دشمنی رکھ کر میرے دل کی طلب گاری بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری  
لیکن بالآخر حسن و عشق کی کشمکش میں حسن کو کامیابی ہوتی ہے اور وہ جنس گرامی  
جس پر عاشق کو بڑا نامزد تھا خرید لی جاتی ہے۔ ایک دفعہ پھنسنے تو ہمیشہ کے لئے  
پھنسنے۔ اب اس جال سے رستہ گاری ممکن نہیں۔ ہجوم غم میں دل عشق کی زیر نگین  
کا جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں عاشق اس طرح گنگنانے لگتا ہے۔  
ہوئیں ناکامیاں، بنائیاں، سوائیاں کیا کیا نہ جھوٹی ہم سے لیکن کوئے جانوں کی ہواد  
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں نہ چالاک کی بجائے عشق آتی تھی نہ عیاری  
نہیں غم حبیب دامن کا گراں فکر بہت تھی نہ اٹھنے کی میرے درست جوش سے بڑھ چکا تھا

نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ممکن ہے  
 و فوراً شک بہم سے ہجوم شوق بے حد میں  
 غضب و عینیاں نکھیں گریہ ہائے ابتدائی کی  
 نہیں کھلتی مری نسبت تیری لئے حیلہ جو مری  
 نہ کرتا ستم ہم درد مندوں پر کہ دنیا سے  
 نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے  
 یہی عالم رہا اگر اس کے خون سحر پرور کا  
 وہ جرم آرزو پر جس قدر چاہیں نئے یوں  
 نسیم دہلوی کو وجہ ہے درد و سہم حسرت  
 ہجر کی کلفتوں میں مشتاق دید اپنے آپ کو طرح طرح سے دھو کے میں  
 مبتلا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبوب کا حجاب اس کی حیرت سے ہم کلام ہے۔  
 تھا حجاب ان کا میری حیرت سے سرگرم کلام  
 حتی بغا پر غاشی در پردہ خاموشی نہ تھی  
 تناسل پردوں میں لطف و عنایت کی خواہشیں پیدا کر لیتی ہے وہ دھو کے  
 کھاتی ہے اور آئندہ اور دھو کے کھانے کے غدر تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر یہ  
 قریب نظر نہ ہوں تو زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہو جائے غمنا کی خواہش  
 لطف و مراعات ملاحظہ فرمائیے۔

روش من مراعات چلی جاتی ہے ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے  
 اس جنا جو سے بایاے تمناب تک ہوس لطف و عنایت چلی جاتی ہے  
 یہ جانتے ہوئے کہ کرم یار ہم رنگ جانا ہوگا پھر بھی دل اسی کا مستحق  
 رہتا ہے۔

پھر اسی لطف ستم کو ش کا مشتاق ہے دل ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جانا دیکھا تھا  
 ہجو و محرومی کی راتوں کو کانٹے کے لئے لطف ستم کو ش کا متنی کبھی یہ ترا  
 محبت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

ترے گشتے لے جانِ جانِ محبت      حقیقت میں ہیں کاروانِ محبت  
 کرم بھی تر یا دگارِ وفا تھا      ترا جو بھی ہے نشانِ محبت  
 جانِ آفریں کھی بہارِ تمنا      بہارِ آفریں ہے خزانِ محبت  
 جو سرگشتہ ریاس و حیرانِ غم ہو      وہی عقل ہے کامرانِ محبت  
 زہے قبلہ دین و ایمانِ حسرت      خوش رہتے رہے آستانِ محبت  
 کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روئے دلار کے تصور سے عاشق کے خیال میں رنگ و  
 بوئے یار پیدا ہو جاتی ہے جسے اس کی درونِ بینی کی کرامات کہنا چاہیے۔  
 خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے      یہ رنگیں ماجرا اے شفقِ شیریں کا پیرا ہے  
 عاشقِ جو رجوا جفا بہتا ہے اور دل میں اس کی تاویلیں کرتا جاتا ہے تاکہ معشوق  
 پر حرف نہ آئے۔

اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے ہفتا      سخی تاویل خیالات چلی جاتی ہے  
 کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب بھولا بھالا ہے مکن ہے وہ اپنی ستم رانیوں کی  
 توجیہ نہ کر سکے اور شمش و پنج میں پڑ جائے اس لئے معاملات کو اس طرح سمجھ اور  
 سمجھاؤ کہ اس کو پیشیان نہ ہونا پڑے۔

ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کرنس      کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی  
 کبھی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ تغافل انھیں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کے ساتھ  
 خصوصیت ہوتی ہے۔

ہماں شانِ تغافل ہیں ہر مرتا تیا زانِ کجا      بانداز جفا ہے التفاتِ دلنوا زانِ کا  
 کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کی وفا شعاری کا اس کو کوئی صلہ  
 نہیں ملا اس واسطے کاوش درو جگر کی لذتوں کو فراموش کر کے بے نیاز  
 رہنا ہو جائیے۔

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش ہے      اب نہ ملے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائے  
 دل سے یاد روزگارِ عاشقی دیکھ نکال      آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائے

کاوش درد و جگر کی لذتوں کو بھول کر مائل آرام و شقائق ثنا ہو جائیے  
ایک بھی ارمان نہ رہ جائے دل مایوس میں یعنی آخریے نیاز مدعا ہو جائیے  
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر کئے زیاد اس قدر بیگانہ، عہد وفا ہو جائیے  
لیکن ان عزائم میں کامیابی نہیں ہوتی۔

بانے ری بے اختیار یہ تو لب کچھ ہو سکر اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے  
یہ کہکروں کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے کہ جب اس میدان میں قدم رکھا ہے تو اب  
واپس جانا کیسا؟

کوئی خشقبازی کا شغلہ نہیں کھیلے دل مبتلا گمراہ کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نابالغا  
عاشق عوس کرتا ہے کہ درد اشتیاق کی کسک میں ایک خاص قسم کی لذت ہے  
جسے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی خواہش اور تنہا ہی رہتی ہے کہ کوئی بیرونی  
عاشقی سیراب غم کر دے تاکہ تشنگان عاشقی کی پیاس بجھے۔ عاشقان عاشقی کا  
احوال اس غزل میں نہایت پرتاثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے  
ایک ایک لفظ میں تذل اور شعریٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایسا معلوم  
ہوتا ہے کہ شاعر کو محبوب سے بھی زیادہ خود عاشقی سے محبت ہے۔ وہ محبت  
کرتا ہے محبت کی خاطر نہ کہ محبوب کی خاطر۔ محبت کا یہ اخلاص خود محبت کے مرتبہ کو  
بلند کر دیتا اور اس کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔ عاشقان عاشقی کی زبان سے  
حسرت سوز نہاں کی کیفیات اس طرح بیان کرتے ہیں :-

حسرت کشان درد ہیں ہم تشنگان عاشقی  
مطلوب آہ سرد ہیں تجوب رنگند دہیں  
پس واقف انجام ہم کون میں بھول نہ تم  
راحت سے دل بھر گیارہ کے غم یاد آئیگا  
منظیر دلداری رہا لطف نہاں لبران  
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ آتا ہے کہاں  
سیراب غم کر دے کہیں بیرونی عاشقی  
معتوق اہل درد ہیں ہم عاشقان عاشقی  
جب تک رہیں ناکام ہم ہیں کامران عاشقی  
کیونکر بھلا یا جائیگا عین زمان عاشقی  
مقصود رسوائی رہی شان عیان عاشقی  
باقی ہے اک سوز نہاں اب تک نشان عاشقی

بادِ جو امید پرست ہونے کے حسرت کا عقیدہ ہے کہ عشق کی روح پاک تحفہٴ غم کے بغیر شاد نہیں ہو سکتی۔

عشق کی روح پاک کو تحفہٴ غم سے شلا کر اپنی چٹا کو یاد کر میری وٹسا کو یاد کر  
جان کو جو غم بنا دل کو دفا بنا دکر بندہٴ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کو  
حسرت بادِ جو وادویٰ عشق کی مایوسیوں اور محرومیوں کے اچھی طرح جانتا ہے کہ

ایک نہ ایک دن ستم یار ہتھیدِ کرم بن جائے گا۔

ستم ہو جائے ہتھیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے  
بھلا دیتی ہیں سب رنج و المِ جزائیاں میری تری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے  
جائے یار کا شکوہ نہ کر لے رنجِ بکا می اسید و یاس دونوں ہوں ہم ایسا بھی ہوتا ہے  
تری دلدار یوں سے صورت بیگانگی نکلی خوشی ایسی بھی ہوتی ہے الم ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی عاشق محض یادِ یار سے فراق کی گھڑیوں کو گوارا بناتا ہے۔ عشق کی ایذا  
پہلے دل کو راحت ملتی ہے۔ کرم یار کی جھلکیاں اب عالمِ خیال میں نظر آنے لگتی ہیں۔

از بسکہ یادِ یار میمائے عشق ہے راحتِ فزائے دل ہے جو اذائے عشق ہے  
تیرا خیال منسل منقصودِ آرزو تیرا جمال شاہِ رعنائے عشق ہے  
حسرت کہاں وہ شاہ کہاں لگدگئے حسن زہار اگر تجھے سرو سودائے عشق ہے  
مدت کے بعد پھر وہ ہوئے مائلِ کرم یہ بھی تو ایک طریقہٴ احیائے عشق ہے

حسنِ جانان سے عشق کا خطاب تو ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ خطاب کرنے والے کے  
تجربہ بتاتے ہیں کہ اس کو اپنی عظمت کا احساس ہے۔

حسنِ جانان سے یہ کہتا ہے تیرا تھڑ عشق دور پہنچا ہے میرے نام سے افسانہ تیرا  
بے خود ہو کے محبت کی بدلتی عقل نام بھی اب نہیں لیتا دلِ فردانہ تیرا  
فکر کو نین سے بیگانہ ہوا تو حسرت خوب ٹھہرا غمِ جانانہ سے یارانہ تیرا

محبت کی مختلف آزمائشوں میں سے گزر کر شوقِ مغلّ جن میں پایہ پاتا ہے۔

عظاہر ہر پہنچ کر دل اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا ہے۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا  
 جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا  
 بلاخر جذبہ شوق کی رہسری میں وادیِ عشق کا مسافر شہرِ وصال پہنچ جاتا ہے  
 کچھ بھی شہرِ وصال دور نہیں جذبہ شوق ہو جو راہ نما  
 منزل پر پہنچ کر مسافر کو جو خوشی ہوتی ہے عاشق کو وہی مسرت اپنی کا مرانی پر  
 ہوتی ہے جسے شاعرانہ زبان میں وصل کہتے ہیں۔  
 اب حسرت کا ترانہ وصل سینے۔

لہذا الحمد کہ تارِ یکی فرقت ہوئی دور  
 چمن جاں میں نسیم ہو س انگیز چلی  
 بادہ عشق سے طنائے مٹا زنجیں  
 بند کر دے گلاب یار کو بوسوں کا ہجوم  
 مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر نے اپنے مطالب کو صاف صاف بیان کر دیا ہے  
 کہ سات کے ذہن میں اس کی مقصد براری پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے  
 لیکن آپ دیکھیں گے کہ لب و لہجہ میں ضبط و اعتدال ہے کہیں اعتدال اور  
 عریانی کا شائبہ نہیں جو ذوق پر نگراں گذرے۔ پھر بیان کی تازگی اور صفائی  
 کے ساتھ مرکزی کیفیت پر قرار رکھی ہے جس پر تغزل نازاں ہے۔  
 چاندنی راتوں میں بھولوں کا ہے زور کیا تو  
 روشنی بخش تمنا ہے جواک ماہِ منیر  
 دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا جان لیا  
 قابل دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار  
 بن گئی ہے بدل گردش گردوں ماتی  
 داستانِ ماضی کا آخری منظر ملاحظہ ہو جس میں حسنِ شادابی کی اداس اور شوق  
 بے عجاب کی گستاخ دستیاں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں



لایا ہے دل پر کتنی خرابی اے یار تیرا حسن شرابی  
 پیرا ہن اس کا ہے ساوہ نگین یا عکس مئے سے شیشہ نگلابی  
 عشرت کی شب کا وہ دور آخر نور حسد کی وہ لاجوابی  
 پھرتی ہے اب تک ل کی نظریں کیفیت ان کی وہ ہم خرابی  
 بزم طرب ہی وہ بزم کیوں ہو ہم غمزہ دوں کو داں بارابی  
 اس ناز میں نے باوصف عصمت کی وصل شب وہ بے حجابی  
 شوق اپنی بھولا گستاخ دستی دل ساری شوخی حاضر جوابی  
 وہ روئے زیبا ہے جان خوبی ہیں وصف جس کے سائے کتبانی

خیال تھا کہ مقصد برآری کے بعد عاشق اطمینان کی نیند سوئے گا۔ لیکن یہ  
 سارا ماجرا فریب نظر ثابت ہوا۔

وصل میں بھی نہ ہوئی وجہ سکون کثرت شوق ڈھونڈ لیتا ہے یہاں دل مضطر کیا خوب  
 پھر عاشق کو یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ وصل زوال شوق کا سبب نہ بن جائے۔  
 غرض دل کو چین نہ بھر و محرومی میں ہے اور نہ مقصد باری میں۔ اضطراب اور  
 بے تابی زندگی کے ساتھ ہیں۔ جب تک جان ہے اس وقت تک ان سے  
 چھٹکارا نہیں یہ ہی غم آرزو محبت کے نیت نئے جادو جگاتا ہے۔

دل طالبِصال ہے بے شک گر نہیں حسرت یہی عروج نہ ٹھہرے زوال شوق  
 غالب نے بھی وصل میں زوال شوق کے خیال کو اپنے خاص انداز میں ادا  
 کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے رمز کی کیفیت کا ایک سماں باندھ دیا ہے  
 گزرتے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

مطلب یہ ہے کہ اگر تیرے دل میں شبیہ ہے کہ وصل کے بعد شوق میں  
 ضعف پیدا ہو جائے گا تو اپنے دل سے اس شبہ کو نکال دے۔ موج کو دیکھ  
 کہ باوجود مجرے ہم آغوش ہونے کے اس کی بے تابی اور اضطراب میں کوئی

کمی نہیں پیدا ہوتی ۔

ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وصل کے بعد حریص  
دل کا شوق اور زیادہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساعر کا جب خراب  
سے وصل ہو جاتا ہے تو اس میں جھاگ اوپر آنے لگے ہیں جو اس کی  
تمشہ بی پر دلالت کرتے ہیں ۔

ہوا وصال سے شوق دل حریص زیادہ

لب قح کہ کف بادہ جوش تشنہ بی ہے (نسخہ حمید)

ایک اور جگہ وصال کے مضمون میں غالب نے عجیب ندرت پیدا کی ہے ۔  
وہ کہتا ہے کہ عاشق پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جبکہ وصال داخلی  
تجربہ اور ذہنی لطف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ اس کیفیت میں اس  
انجمن کی آمیزش ضرور ہوتی ہے کہ اگر وصال میرزا ہوا تو کہاں جائیں گے اور  
اگر ہوگا تو کیونکر ہوگا ۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو  
اس کے برخلاف داغ کے یہاں وصال کے تصور میں خارجیت کا پہلو نمایاں  
ہے ۔ وہ کہتا ہے :-

شب وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے  
عشق اور موت شاعری کے دائمی موضوع ہیں ۔ عاشقانہ شاعری  
کو آپ درد و الم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ سکتے ۔ عشق کا خاصہ جذب  
غم ہے جسے محبت کی جاتی ہے اس کے لئے غم ہے جاتے ہیں کہ بغیر اس

لحا بقول حافظ شیرازی :

دوام عیش و تنعم شیعہ عشق است اگر معاشہ مائی بنوش جام غم  
اسی خیال کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے  
گریزداد ز صنف ماہر کہ مردھو تا نیست  
کے کہ کشتہ نشہ از قبیلہ مایہ نیست

کے اخلاص مشتبہ رہے گا۔ عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا بغیر ادراک غم خود انسانی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ غم کی دھیمی آنچ میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انہیں اس سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ خوشی اور مسرت کے گریز پالمحوں کی یادیں جلد فراموش ہو جاتی ہیں۔ لیکن غم کی یاد کبھی دل سے نہیں جاتی۔ اس کے نقوش ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ زمانے کے ہاتھ سے بڑی مشکل سے بھرتے ہیں۔ غزل میں جذبہ غم وہی حیثیت رکھتا ہے جو مغربی ادب میں تریجڈی (المیہ) کو حاصل ہے۔ ہر زبان کے ادب میں المیہ ہی کا مرتبہ آپ بلند پائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم زندگی کی ایک اساسی شے ہے۔ زندگی کی یہ کوشش کہ اپنی تکمیل اور تکمیل کی راہ پر گامزن ہو اپنے جلو میں غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتی ہے۔ انسان کا یہ احساس کہ زندگی کی ابھی تکمیل باقی ہے، بجائے غم آگین ہے۔ پھر ہر قسم کی سعی و جہد جو اس راہ میں کی جاتی ہے الم انگیز ہوتی ہے۔ زندگی کچھ عجیب اسی چیز ہے۔ جتنا اس منہ کو بوجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی وہ الجھتا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الجھاؤ کبھی سلجھنے والا نہیں اس واسطے کہ زندگی کا بننا ہی یہ ہے کہ یہ کبھی نہ سلجھے اگر سلجھ جائے تو زندگی اپنی قوت محرکہ سے محروم ہو جائے گی جو نشانائے قدرت کے خلاف ہے۔

انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ غم سے بیزار ہو کر مسرت کی منزل کی طرف رواں دواں جاتا ہے۔ جب وہاں پہنچ جاتا ہے تو کچھ کمی اور تشنگی محسوس ہوتی ہے اور کچھ دنوں میں وہی مسرت جس کا وہ دل و جان سے خواہاں تھا اجیرن ہو جاتی ہے۔ ایک مہر کی بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے اسباب اکثر اوقات نامعلوم ہوتے ہیں۔ تمنائیں منزلوں کے خواب دکھانے لگتی ہیں۔ حاصل شدہ مسرت ایک زندان بن جاتی ہے

جس سے رہائی کے لئے دل بے تاب ہوتا ہے۔ دست جنوں اس زندان کی زنجیر کھڑکاتا ہے اور از سر نو تمنا کی دادیوں میں دشتِ فردی شروع ہو جاتی ہے۔

رخصت اسے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے

مژدہ خار دشت پھرتو امیرا سمجھائے ہے (ذوق)

سوزِ آرزو کی نیرنگیاں نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بقول میر انصاری:

کلیجا یک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے

ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیال خام رہتا ہے

قد مائیں میر تقی میر نے اپنے کلام میں دردِ عالم اور ناکامی اور مایوسی کی جھلکیاں

دکھائیں اور اس سلیقہ سے دکھائیں کہ ان کی نظیر آج تک پیدا ہوئی۔ میر کے

سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر بے پناہ ہے۔ وہ دل پرچوں

کے ایک جام سے عمر بھر بہش رہے۔ ان کی مہوشی غمِ زیست کی مہوشی ہے

دل پرچوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ان کے نزدیک جن حیات کا ہر گل لہو سے بھرا ہوا ساغر ہے۔

یہ عیشِ گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا ہوا کا

میر صاحب کا کلام غمِ عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا ہے اسی لئے اس میں بے پناہ

تأخیر ہے۔ انھوں نے جس غم کا ذکر کیا ہے وہ زندگی کی اساسی حقیقت ہے۔

اس کے بغیر انسانی سیرت نہیں بن سکتی اور اس کی پوشیدہ قوتیں اور صلاحیتیں

نہیں ابھر سکتیں۔ عشق کی آگ میں جب جذبات تپائے جاتے ہیں تو ان میں

نکھار پیدا ہوتا ہے۔ میر صاحب کا عشق بھی خالص انسانی عشق ہے۔ وہ مجازے

بہت کم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ان کے کلام

کی بڑی خوبی ہے۔ چونکہ ان کے جذبات اصلی ہیں اس لئے وارداتِ عشق

کی مصوری میں فطری سوز و آہ و ہوا پیدا ہو گیا ہے۔ انسانی عشق و محبت کی ککھ

انھیں صاحبِ نظر بنا دیا اور ان کی ہر بات میں گہرائی پیدا کر دی۔ ان کے

کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

کروں جو آہ زمین و زمان جل جائے پہرہ سیلی کا یہ سائبان جل جائے

نبول میرے مظلوم عشق ہے وہ غریب اگر وہ آہ کرے سب جہان جل جائے

بک نیا ز عشق ناز جن سے کھینچے ہے ہاتھ آخر میرے سر بر آستان مارا گیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا غم کے جانے کا نہایت غم رہا

قائل ہیں ہم تو میرے بھی ضبط عشق کے دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ پروتھا

ابتداء عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا داغ چھاتی کے عیث دھوتا ہے کیا

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں ایک سب آگ ایک سب پانی

عالم عالم عشق و جنوں دنیا دنیا تہمت ہے صبح آئے اسنو تو میدان جیسے دوائی آتا تھا دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے آج کو خواہش کی شاید دل ہے ہکے رخصت ہے

دل جادے ہے جون کے شبنم نے کہا گل سے  
 اب ہم تو چلیں گے تو رہ جو رہا چاہے  
 رنگ گل و بوئے گل ہوئے ہیں بواہ و نول  
 کیا فائدہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

آج کل بھتسار ہیں ہم بھی  
 بیٹھ جا چلتے ہاں میں ہم بھی  
 منع کر دے تو اسے ناصح  
 اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

بہنہ و دل حسرتوں سے چھایا گیا  
 بس ہجوم یاں جی گھبرا گیا  
 ہمد جدید کے شعرا میں فانی نے غم کے معنوں کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اسی کا  
 ہو گیا۔ میر کے غم اور فانی کے غم میں فرق ہے۔ میر کا غم محض ایک انفرادی تجربے  
 کا بیان ہے۔ برخلاف اس کے فانی کے ہاں غم ایک جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا  
 ہے۔ اس کا سارا نظام نقصورات غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے  
 جس پر کائنات کے حقائق کے کھرے کھوئے کو پرکھا جاتا ہے۔ رنج و الم  
 سے حواس و ادراک میں ایسی تیزی اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان  
 کی مدد سے انسان کو زندگی کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے جس کی تک  
 مسرت نہیں پہنچ سکتی۔ میر نے غم کے جن خیالات کو انتہائی سادگی سے  
 بیان کیا انھیں فانی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ فانی نے غم کی  
 پرورش کی تاکہ اس سے لطف اندوز ہوں۔ انھیں غم میں ایک طرح کی  
 لذت محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لذت الم و عش غم کے جواریا رہے۔ ان  
 کی یاس غیر مخلوط یاس ہے جس میں کسی قسم کی امید اور کما کیابی کی آئینہ نش  
 نہیں۔ انھیں ہر قسم پر وہ دار غم نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں غم کا تصور اور  
 غم کا احساس دو ذل خالص رنگ میں ہیں۔

ہر قسم پر وہ دار غم نظر آیا مجھے  
 گل خزان کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

اس میں شبہ نہیں کہ غم زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ اگر آرت کے ذریعہ حیات اجتماعی میں اس کی قدر حد سے زیادہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ جماعت کی عملی صلاحیتوں پر اس کا برا اثر پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی جماعت کے افراد احساس غم سے بے اعتنائی برتتے ہیں جبکہ جدید مادی تمدن میں نظر آتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری جماعت کا تحت شعوری احساس متاثر ہوگا اور وہ بے رحمی کے ایسے وسائل دریافت کرے گی جو دوسروں کو بھی مبتلائے غم کرے اور خود اس کو بھی۔ مثلاً جنگ کے ذریعے غم کی ضرورت کی تکمیل کی جائے گی۔ جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب دل غم کی لطیف کسک سے آشنا نہیں ہوتا تو وہ بے رحمی پر اتر آتا ہے اور دوسروں کو مبتلائے غم کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے، اس لئے آرت میں غم کے عنصر حیات کو اس طرح سے پیش کرنا چاہیے کہ جذبات کی تہذیب ہو سکے۔ فانی نے غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا ہے جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

فانی نے غم کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے۔ اس نے حیات کو غم سے ہم آہنگ کر دیا۔ غم کی ہر اداسی اس کو نئی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ امیر اور داغ کی شوخ نگاریوں کے بعد فانی کا تراہ غم تکملہ کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن بعض جگہ انھوں نے احساس غم میں اتنا غلو برتا کر ان کے اکلام کی شریعت مجروح ہو گئی۔ زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی آہ و نالہ بھی ہے اور غم اور خوشی بھی۔ ناکامیاں بھی ہیں اور کامرئیاں بھی۔

ع زمانہ جام بدست و جوازہ بردوش است  
فانی نے موت میں جو غم کا نقبہ ہے کمال بینی کی تصویر دکھی اور اس تصویر کے بنانے سنوارنے میں انھوں نے ایسے تیز رنگ استعمال کئے کہ بعض دفعہ ذوق شری پر گراں گزرتے ہیں۔ جب کوئی مضمون رمز و ایما کی حد سے

باہر نکل جائے اور سامع کو یہ خیال ہونے لگے کہ شاعر جو کہہ رہا ہے اس سے  
 یادوں کو تازہ کرنا مقصود نہیں بلکہ بعض تصورات کے متعلق مطلع کرنا تو وہ  
 بالکل دوسرے نقطہ نظر سے شعر کو چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موت  
 ایک زبردست محرک شعری ہے لیکن اگر کفن اور جنازہ سے واقعی کفن اور جنازہ  
 مراد ہو تو اس انداز بیان سے لازم ہے کہ ایک قسم کی کراہت پیدا ہونے لگے  
 مثلاً ان شعروں کی شعریت میں مجھے کلام ہے۔ چاہے یہ شعر ہوں لیکن غزل کے  
 شعر نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں اس لئے کہ انھیں سن کر ذہن مرنے  
 کے بجائے امر واقعہ کی طرف رجوع ہوتا ہے جو دل آویز نہیں۔  
 ہڈیاں ہیں کٹی پٹی ہوئی زنجیروں میں لئے جاتے ہیں جنازہ تھے دیوانے کا

پلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ تم اپنے مرنے والے کی شانی دیکھتے جاؤ  
 سنے جاتے نہ تھے تم سے مے دن ایکے شکو کفن سداؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ  
 وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر اب اٹھا چاہتی ہے نقش فانی دیکھتے جاؤ

وہ ادھر رخ ادھر ہے میت کا لوگ فانی کو قبیلہ رو تو کریں

داغ اگرچہ عام طور پر خوش باشی اور لذت پرستی کا علمبردار ہے لیکن تبرکاً کہیں  
 کہیں غم کا مضمون بھی باندھ جاتا ہے۔ ایک جگہ موت کا نقشہ اس طرح چھینچا  
 ہے کہ عبرت کی بجائے کراہت ہوتی ہے۔ اس کا شعر ہے۔  
 میت پر میری آنکھیں دل ان کا دل گیا تعظیم کو جو لاش میری اٹھ کھڑی ہوئی  
 چاہے کسی کے احقرام کس لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن لاش کا کھڑا ہو جانا ایسا مضمون  
 نہیں جسے غزل میں برنا جاسکے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر رمز و ایما کی کوئی  
 کیفیت نہیں پیدا کر سکا۔ سامع کو اس قسم کا شعور سن کر معایہ خیال ہوتا ہے کہ



وہ اپنے سامنے کسی لاش کو اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے جو یقیناً  
ایک کریہہ منظر ہے۔ اسی مضمون کا ماہر لکھنوی کا بھی شعر ہے :-

ماہر یہ کس ادا سے وہ شام ہلا گئے یوں دل ہلا کہ قبر میں لاشہ ہلا کیا  
فانی کے شعر میں جو کفن سر کانے کا مضمون ہے وہ بھی اسی نوعیت  
کا ہے۔ لیکن ویسے فانی کے ہاں غم کے متعلق بے نظیر اشعار ملتے ہیں۔ جو  
تغزل میں اچھی طرح کھینچتے ہیں، انھیں اس کر سماع کے ذہن میں غم کا وہ تصور  
آتا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے مقدر سے الجھ آڑا  
ہو۔ یہ غم زندگی کا تخلیقی عنصر اور اس میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان  
اشعار پر ہمارا ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش  
کی جاتی ہیں۔

تو نے کرم کیا تو بے عنوان رنج زیت غم بھی مجھے دیا تو غم جادواں تھا  
آزادہ تھا کہ ضبط فغاں میں اثر نہیں شرمندہ ہوں کہ ضبط فغاں رائیگاں تھا

مرے نکلے پاس غم کی بے یں دل سے اٹھے تو خان کو میں نے آہنگ طرب کا ہم نوا پایا

دل ہیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر  
نامراد رہنے تک نامراد بیٹے ہیں سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر  
بڑھاپے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں بیٹے ہیں درد پر خدا کی مار دل میں ہو گیا رہ کر

غم خاں دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں  
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں  
سننے تھے حجت آسان ہے واللہ سب گناہیں ہر گز  
اس محل میں جو دشواری ہے شکل سی شکل میں نہیں

گوراحت و رنج میں فرق نہیں یہ فرق مراتب کیا کم ہے  
 جو سعی حصول عیش میں ہے وہ عیش غم حاصل میں نہیں  
 جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اہل ہے آگے بڑھ  
 منزل کا نشان ہے ہر منزل اکرام کسی منزل میں نہیں  
 ہم بھی ہوں خیال یار بھی ہو اس فکر محال سے کیا محال  
 بس اب فانی ہم ہی نہیں یا کوئی ہمارے دل میں نہیں

فانی کتِ قاتل میں شمشیرِ نظر آئی      لے خوابِ محبت کی تعبیرِ نظر آئی

آگئی ہے تیرے بیمار کے منہ پر رونق      جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

ہاں تاخنِ عزمِ کمی نہ کرنا      ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

زبانِ حالِ ٹھہراستانِ عشق نہ چھوڑ      کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

غم کے بھڑکنے شعلوں سے جب جل کے کیلجہ خاک ہوا  
 داغِ وجودِ حسرت سے تب دل کا دامنِ پاک ہوا  
 میرے سوا تجھے اور جو بردے سارے کے سارے چاک ہوئے  
 یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دم میں چاک ہوا

یہ غزل فانی کی ہمیشہ زندہ رہنے والی غزلوں میں سے ہے :-  
 شوق سے ناکامی کی بدولت کوچہِ دل ہی چھوٹ گیا  
 ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آپہو پنا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا  
اس شعر کی بلاغت اور طلسمی رمزیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے  
کہ نقاش نے اپنے قلم کی خفیت سی کشش سے جہان معنی پیدا کر دیا ہے۔ کچھ  
باتیں کہی گئی ہیں اور کچھ اودیدہ و دانستہ نہیں کہی گئیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ  
جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں لطافت زیادہ ہے یا ان میں جو ان کہی چھوڑ دی  
گئیں۔ ایک زنداں کا منظر پیش نظر ہے۔ کوئی قید و بند میں مبتلا اس پر غور کر رہا ہے  
کہ آخر در زنداں کے کھلنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا موسم بہار آ گیا یا اجل کی آمد  
آمد ہے؟ کیا کسی قیدی کو چھوڑا جا رہا ہے یا کسی نو گرفتار کا خیر مقدم مقصود ہے۔  
جو مطالب اس شعر میں صدف کئے گئے ہیں اور وہ جو بیان کئے گئے ہیں ان  
دونوں کا مجموعی اثر تغزل کی اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس غزل کے  
باقی شعر بھی نہایت بلند ہیں۔

یہ گئے کیا دامن کی خبر اور دست جنوں کو کیا کیسے

اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزاری چھوٹ گیا  
منزل عشق پر پہنچا پہونچے کوئی تنہا ساتھ نہ تھی  
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھ چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گورو کفن

فربت جس کو اس نے آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا  
فانی نے اپنے مخصوص انداز میں عشق و حسن کے معاملات اور زندگی کے  
اسرار بیان کئے ہیں جن کی تشریح وہ غم ہی کی زبان سے کرتے ہیں۔ ان کے  
خیالات فرضی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہیں  
اس لئے ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گا۔ وہ بھی زبان کے پاس و تمنو طبیعت  
کے رجحان کو زندگی کی مکمل توجیہ نہیں سمجھتے ان کے کلام کی تاثر مستانت

اور خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شعر محسوس کر کے لکھتے تھے اور ان کے احساس میں ایک خاص قسم کی گہرائی تھی جسے تحفہ غم سمجھنا چاہیے۔

زندگی کی کیا خوب توجیہ کی ہے۔

ایک سہمہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہے کوہِ خواب سے دیوانے کا ایک خواب اور وہ بھی ایک دیوانہ کا خواب۔ رمز و ایما کی انتہائی کیفیات آن چند لفظوں میں موجود ہیں۔ دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مرم کے جسے جلنے کا بھمت کی ایک کیفیت اس شعر میں کیا خوب بیان کی ہے  
محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی  
بعض دفعہ رند شرب جگر بھی ایسی چہ کی بات کہہ جاتا ہے کہ انسان پر ایک قسم کی حیرت سی طاری ہو جاتی ہے۔ آنسوؤں کے خشک ہونے کے مضمون کو ادا کیا ہے

اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا

رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں ہے

اس شعر کا ایک ایک لفظ اثر و بلاغت میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی تلافی مافات کا تصور بالکل نیا ہے۔ اور اس خیال میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں کہ جب آنسو خشک ہو گئے تو دل کو رونے کی تمنا ہے۔ جو حصہ حذف ہے یعنی یہ کہ جب آنکھوں میں آنسو تھے تو ان کی پوری طرح قدر نہ ہوئی کس قدر لطیف اور باکیف ہے۔

اسی مضمون کو غالب نے بھی ادا کیا ہے لیکن جگر کا شر بڑھا ہوا ہے۔

زبان کے لحاظ سے بھی اور اجمالی کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ غالب کا شعر ہے۔

غالب زبیکہ سوکھ گئے چشم میں رشک  
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی (منہج حیدر)  
جگر کے شعر کا مضمون داغ کے یہاں دوسرے پیرائے میں ملتا ہے۔  
جب باور تھکے تو جستجو کی جستجو نہ رہا تو اندھ کی  
غالتابی کی جستجو بھی نہ رہی سو نہ وہ گداز کو صدمہ ہی بنایا اس کے نزدیک  
کلام میں اس وقت تک رہا نہیں بلکہ ہر شے کا جب تک کہ کبھی دماغ کا دل غم کی  
لذت سے آشنا نہ ہو۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد پیسے دل گداختہ پیدا کرے کوئی  
ایک جگہ اپنی غزل سدا ئی کی اس طرح توجیہ کی ہے۔

مجھے استعانت غم نے اپنے عرض حال بخشی ہوس غزل سرا ئی تیش فناء خوانی  
ہی بار بار جی میں مے آئے ہے کہ غالب کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی مہمانی  
غالب نے غم کی حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے کلام میں اسے بڑے وسیع  
معنوں میں استعمال کیا۔ لیکن وہ ہر وقت اور موقع بے موقع مانتے کناں نہیں  
نظر آتا۔ اس کا غم ضبط کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ زندگی میں  
غم کی اس سی حقیقت کو اس شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

خانے پائے خزان ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا  
بہار کو موسم خزان کے پاؤں کی ہندی کہا جس کا رنگ بہت جلد غائب  
ہو جاتا ہے۔ دنیا کا عیش بھی رنگ خاک کی طرح نمائشی اور عارضی ہے۔ زندگی  
کی اصلی حقیقت غم ہے۔

دوسری جگہ زندگی اور غم کو ایک ہی چیز بتایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ  
غم غم عشق ہے جو زندگی کا محرک عنصر ہے۔

تبدیلیات و تبدل غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا کر  
ایک موقع پر کہا ہے کہ غم دل کے محبت میں انسان ہمیشہ سبقت لیتا رہتا ہے

اور ہمیشہ اس کی حیثیت ایک مستی کی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے عیش و فراغت کی انتہا پر انسان بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور اسی لئے اس سے آنا ہی جلدی اکتا بھی جاتا ہے۔

نیکتا ہوں محبت غم دل میں سبقِ سنوز لیکن یہی کہ "رفت گیا اور بود تھا" غالب کے یہاں غم مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ کبھی غم روزگار کی اور کبھی غم عشق کی اور کبھی دائمی تنہا اور انتظار کی۔ غم عشق کی بدولت غم روزگار سے بے بسی کی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

غم اگرچہ جانِ نعلِ پیہ کہاں بھرنے کے دل ہے غم عشق اگر نہ ہو تا غم روزگار ہوتا اسی غم عشق سے زندگی کا مزہ ملتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا غم عشق کا چمکا ایک دُفِ پڑنے کے بعد چھٹتا نہیں۔ اس کے اندازِ جنوں سے دل بصیرت اندوز ہوتا ہے اور پھر اس کے آگے کسی دوسرے کی نہیں مانتا۔

گر کیا نامح نے ہم کو قید اچھالوں یہی یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے۔ عشق و محبت میں زندگی ایک دائمی ہجوری کی کیفیت بن جاتی ہے اس فراق و محرومی کی حالت میں دل کو سیرِ گلشن کی تاب نہیں رہتی۔

غم فراق میں تکلیف سیرِ باغِ زدو بجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا اس احساسِ ہجوری کا سبب محرمیِ حسن کی تڑپ ہے۔ اس جستجو میں انسان ہمہ تن چشمِ شوق بن جاتا ہے۔

ہنودِ محرمیِ حسن کو تڑپتا ہوں کرے ہے ہر بنِ مو کا م چشمِ بیکا کا حسن کی نارسائیاں تنہا کی آگ کو بھڑکاتی ہیں یہاں تک کہ عشق میں ایک ایسا مقام آتا ہے کہ عاشقِ حسنِ محبوب سے بے نیاز ہو کر تنہا کی خاطر تمنا کرتا ہے۔ تنہا تنہا کی خاطر اچھوتا مضمون ہے جو صرف غالب ہی کے یہاں

مٹتا ہے۔ کہتے ہیں۔  
ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تما مطلب نہیں کچھ اس کے مطلب بڑے  
بہل مقصد حسرت و غم کی لذت ہے۔ دل کے ٹوٹے ٹوٹے ٹھوسوں سے  
آئینہ خانہ مراد لیتے ہیں اور پھر مدعا کے محروم کو اس کی سیر کراتے ہیں۔

مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے  
تناخیرت کا روپ بھر کر کسی کے سراغِ جلوہ کے لئے انتظار کی کڑیاں ٹھینتی ہے۔  
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کوئے خدا آئینہ فرشتہ شمشیرِ جہت انتظار ہے  
اس غزل کے ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ کا استہرام  
اسی شکل میں ممکن ہے کہ باوجود اس دشمن کے کہ وہ دے دے گا اہم برابر اس کا  
انتظار کئے جائیں۔ جس طرح تما، تنہا کی خاطر تھی ابتدا انتظار کی خاطر ہے۔

ہج آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پر یاں انتظار ہے  
تنا، حسرت اور انتظار سب غم کی شائیں ہیں جن کے ذکر سے کلام غالب بھر اڑا ہے  
غالب کے غم میں غم کی حقیقت کا سراغ ملتا ہے جس کا قصداً سوت ہے جو ایک  
زبردست شعوی محرک ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کا رکھا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیسا  
فانی نے جسے ”مر مر کے جسے جانا“ کہا ہے اسے غالب ذوق فنا کی

ناتامی سے تعبیر کرتا ہے۔  
جی جھے ذوق فنا کی ناتامی پندریوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بارے  
اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے۔

جلتا ہے جی کیوں نہ ہم اک بار جل گئے اے ناتامی نفس شعلہ بار حیف  
اپنے داغ ناتامی کو اس شمع کی تشبیہ و رعایت سے بیان کیا ہے جسے کسی نے  
بھجا دیا ہو اور اسے پورا جلنے کا موقع نہ ملا ہو۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بھجائے میں بھی جلے ہوں میں ملے ناتامی

دوسری جگہ پھر شمع ہی کے استعارہ کو لے کر کہا ہے کہ غم کی فطرت ہے کہ وہ جاگداز ہے۔ دوسروں کی غمخواری سے اس کی یہ فطرت نہیں بدل سکتی۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں لیکن ذوق فنا کی نامتائی خود حیات کا اقتضا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر غم زبست کیسے حاصل ہو؟ اور اگر غم زبست نہ ہو تو متنا کی زیرنگیاں کیسے جلوہ افروز ہوں؟ نفس شعلہ بار کی نامتائی کے ذکر کے ساتھ اس کو زندگی کے ساتھ کسی خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے۔

نالے غم میں چند ہمارے سپرد تھے جو داں نہ کھینچ سکے وہ ہاں آ کے دم ہو رہی نالے جو عالم ازل میں کھینچے جاتے وہ وہاں نہ کھینچے جاسکے تو دنیا میں سانس بن گئے۔ اس طرح زندگی کی بنا غم و الم ٹھہرتے ہیں۔ کبھی عاشق پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ فرط غم سے اس کو اپنے وجود کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے سوز غم نے جگر کو ایسا پھونکا کہ سوائے داغ کے اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اب اگر میں کسی سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے تو کوئی باور کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس سے یہ استدلال کیلئے جو لطف اور بلاغت سے خالی نہیں کہ غم کی وجہ سے ہستی کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ بعض جگہ غالب کے ہاں غم کے مضمون میں بھی ایک خاص قسم کی شوخی ملتی ہے جو اس کے مزاج شعری سے سازگار ہے۔ موت اور کفن کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب بر تنگی میں ورنہ ہر لباس میں تنگ وجود تھا

اک خون چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر جو سکی



غالب کا تصور غم فانی کے تصور غم سے مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب بھی اس کے قائل ہیں کہ زندگی کی بنیاد غم پر قائم ہے۔ لیکن ان کے نزدیک اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جو برسرِ اہلِ جانبِ نظر ہیں اور جن میں اتنی کشش ہے کہ وہ احساسِ غم کو بھی بھلا دیتے ہیں چاہے وہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ غم اور ناامیدی کی تاریکی بر غبی غالب کی حقیقتِ بخیر آنکھ نے امید کی کرن دیکھی کہ یہی حیات کی فنانس ہے۔ چنانچہ زندگی کے پُر امید گوشوں پر اس کی نظر گئی اور اس نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی جس کا اظہار اس شعر میں بڑی خوبی سے کیا ہے

سرایا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی  
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افوسِ حاصل کا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ فطرت نے جب دیکھا کہ انسان اپنی انفرادیت اور خودی کے خول میں ایسا بند ہے کہ اس سے باہر آنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تو اس نے انسانی دل کو غمِ عشق کی کک سے آشنا کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خودی اپنے آپ میں گھٹ کر فنا ہو جاتی۔ غمِ عشق بھی فنا (ٹریجڈی) کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور بے جاتا ہے اگر اس پر مذہب و اخلاق کی بندشیں نہ عاید ہوں جن کے بطن سے تہذیب جنم لیتی ہے۔ غالب کا اوپر کا شعر ہمیں عالمِ تہذیب کی سیر کرانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ میری فطرت سرایا رہنِ عشق ہے لیکن اس کے ساتھ میری فطرت میں زندگی سے الفت و دیست ہے۔ غمِ عشق کا فہتا چاہے ٹریجڈی ہو لیکن باوجود اس کے زندگی کی گہرائیوں میں سے کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ حیرا مقدر فنا نہیں بچا ہے۔ زندگی کی یہ عجیب و غریب اور پُر اسرار کشش ہے کہ وہ ایک طرف تو برق کی پریش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حاصلِ جبات کو سنتِ سینت کراہتی چا

کر رکھنا چاہتی ہے اس احساس نے غالب کو امید پرست بنا دیا جو باوجود غم و عشق کی حقیقت کو ماننے کے زندگی کے خوشگوار اور پرست تجربوں کی بھی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی قدر کریں۔ غم و مسرت کی دھوپ چھاؤں جس سے انسانی زندگی عبارت ہر کائنات ہستی کا ایک طلسمی رمز ہے۔ اگر غم و مسرت ایک دوسرے کے پہلو میں موجود نہ رہیں تو زندگی کی حقیقت سادہ اور یک طرفہ ہو جائے غالب کا زندگی اور آراء کا یہ نقطہ نظر حقیقت پر زیادہ حاوی اور صحت مند ہے۔ اس کو غم کی تادیب میں بھی اسیہ کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں کہ یہی حاصل حیات ہیں۔

عہد جدید کے شاعروں میں حسرتِ ربانیت پسندی میں لیکن لذتِ آزار سے وہ بھی بالکل بیگانہ نہیں۔ ان کی پُر اسیہ کی تہ میں سوز و گدازِ دردِ مندی کی جھلکیاں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہیں۔ جن سے ان کے تغزل کے اثر و آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں۔

ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا لپٹکا مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے  
کچھ حد بھی ہے اس شور و خاموشی کی سر یہ کشمکش غم تجھے بے کار نہ کر دے

عشق کی رُوح پاک کو تھو غم سے شاد کر اپنی جفا کو یا دکر میری دفا کو یاد کر  
جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر بندہ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر  
جگر کے غم و الم میں بھی رنگینی ہے کیا خوب کہا ہے۔

رنگینی الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر اسے دل! وہی تو جلوے مرزا یہ نظر ہیں  
غزل گو شاعر عاشق ہوتا ہے اور عاشق کی ہر بات دنیا والوں سے  
الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر اندازِ نرالا اور اس کی ہر شان میں انوکھا پن ہوتا ہے  
وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر نہیں چلتا بلکہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے چاہے  
وہ سیدھی ہو یا ٹیڑھی اس سے اسے محبت نہیں۔ اگر ٹیڑھی بھی ہے تو ہوا  
کرے۔ اس کو یہ اطمینان کافی ہے کہ اگر وہ بھٹکے گا تو بھی اپنی ہی راہ پر بھٹکے گا

اس کی اصل منزل تو خود اس کا اپنا دل ہے جس تک اس کی رسائی رہنی چاہیے اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں چاہتا۔ دوسرے غم سے بھرا تے ہیں لیکن عاشق غم کی پرورش کرتا ہے۔ لذتِ الم اس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے جس کی وہ چھپا چھپا کر حفاظت کرتا ہے۔

دنیا والوں کا قاعدہ ہے کہ بچ و الم اور مصیبت کو دور کرنے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا مانگنا تاکہ تمہاری احتیاج پوری کی جائے اگر شدتِ خلوص سے کوئی چیز طلب کی جائے تو ضرور ہے کہ وہ حاصل ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر میں دعا مانگوں گا تو وہ ایک طرح کی شکایت ہوگی۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا سے بہت سی آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ میں تو بلاؤں کو دعوت دیتا ہوں۔ ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب تک غمِ زیست کی خلش نہ ہو زندگی کس کام کی؟ وہ زاہد ناداں کو اس طرح خطاب کرتا ہے :-

نہ مانگ زاہد ناداں ذرا سمجھ تو ہسی  
شکایتیں ہیں کیس کی دعا کے پرے میں (مال و طوی)  
اگر کبھی اس کی زبان سے دعا کے لفظ نکل گئے تو بہت جلد انھیں واپس لینے کی فکر کرتا ہے۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔ وہ اپنی ذامت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

بہت بخلی ہے ترے درد سے دعا میری  
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری (حسرت)  
دعا قبول نہ ہونے کی وہ دعا مانگتا ہے۔

کسی کی خاطر نازک کا آگیا ہے خیال  
دعائیں مانگ رہا ہوں دعا قبول نہ ہو (جنگر)  
غالب کو جب احابت دعا کا یقین ہو گیا تو اس نے سوائے دل بے

دعا کے اور کوئی چیز طلب نہ کی ۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل بے دعا نہ مانگ  
داعی کی دعا کو در قبول تک جانے میں اسی طرح تامل رہا جس طرح  
اس کے محبوب کو اس کے ہاں آنے میں ۔

آئے وہ بے وفایہاں اس کی ہلا کو کیا غرض

جائے در قبول تک میری دعا کو کیا غرض  
فانی اسے محبت کی توہین خیال کرتے تھے اگر عاشق دعائیں اثر کا طالب  
ہو ۔ ان کا شعر ہے اور اخلاقی حیثیت سے بڑا بلند شعر ہے ۔

تنگ ہے سنی عرض محبت فرض محبت پورا کر

اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ  
دعا سے گزر کر جب نالوں تک لوبت آتی ہے تو عاشق کو اندیشہ پیدا  
ہوتا ہے کہ کہیں ان کی رسائی نہ ہو جائے ۔ اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگر آفلک  
سوز اپنا کام کر گئی تو پھر شب بھراں میں کس سے شکوے بیان کئے جائیں گے  
اگر فلک رہا تو پھر ان شکوؤں کا سننے والا کون ہو گا ؟ ۔ یہ عجیب و غریب  
شاعرانہ اندیشہ ہائے دور و دراز ہیں ۔ مجروح کا لاجواب شعر ہے :-  
پھر کس سے شکوے شب بھراں میں میں گئے کام اپنا کہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے  
کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں نالوں کی وجہ سے محبوب بے تاب محبت نہ ہو جائے  
جگر کا شعر ہے ۔

کون دیکھے اسے بے تاب محبت لئے نل تو وہ نالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے  
خوگر غم کے لئے نالہ کشی حسن طلب ہے ۔ اس کے نالے شکوہ جفا کے لئے  
ہیں بلکہ تقاضائے جفا کے لئے ہوتے ہیں ۔ غالب نے اس مضمون کو اس  
طرح ادا کیا ہے ۔

نالہ جز حسن طلب لے ستم ایجا دہیں ہے تقاضائے جفا شکوہ پیدا دہیں

اب تک مشقیہ شاعری کے اس رجحان کا ذکر کیا کیا جس کا خطاب مجاز سے ہے لیکن انسانی ذہن و وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کرنا دشوار ہے۔ حافظ کہہ گئے ہیں۔

مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ

اے بے خبر ز لذت شرب مدام

اپنی نظر کو مجاز میں حقیقت کا پر تو نظر آتا ہے۔ معرفت الہی بغیر معرفت نفس اور معرفت کائنات کے ممکن نہیں۔ ذات احدیت جو واجب محقق ہے اسما و صفات سے منزہ اور خلق و مجاز سے ماوراء ہستی لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مظاہر کو نیہ کی احوالیت کیا ہے؟ بقول غالب

جب نہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ کی جہرہ و گیسے ہیں نغمہ و عشوہ واد کیا ہے؟

شکن زلف عنبریں کیوں نغمہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟  
ان سوالوں کا جواب غالب نے وہی دیا جو معارف و سلوک کے واقف کاروں نے اس سے پہلے دیا تھا۔

اصل شہود و شاہد شہود ایک ہے حیراں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں ہنگامہ ہستی کی کرشمہ سازوں میں اور پری پھروں کے غمزہ و عشوہ و ہوا اور ان

کی شکن زلف عنبریں اور نگاہ سرمہ سائیں ارباب عرفان کے لئے تجلیات الہی کی جلوہ فرمایاں موجود ہیں جو انسان کا حقیقی مطلوب ہے۔ اصلی حسن و جمال شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے اس لئے وہی عشق و محبت کے قابل ہے۔ دوسرے مظاہر جمال قریب نظر سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کا تصوف اتنا وارداتی نہیں جتنا کہ میر درد یا نیا زبیری کا۔ اس کا تعلقی اندرونی احساس کے مقابلے میں ذہن سے زیادہ اس کے اسس ذہنی رجحان نے اس کی وسیع مشربی کو اجاگر کیا جو تغزل کی روح رواں ہے۔

غائب سے پہلے تیر و تو کے یہاں خاص طور پر عالم انوار و اقدار اور عشق حقیقی کی رمز و خیال ملتی ہیں۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ تصوف تغزل سے ایسا ہم آہنگ ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے غزل گو کے کلام میں اس کی ضروری بہت چالشی موجود ہے۔ یہ خیال بجائے خود اپنے اندر شاعریت رکھتا ہے کہ وہ خود بخود غیبی جب اپنے تعین کی طرف مائل ہوا تو عالم رنگ و بھرا درمناظرہ کو تخیل کا منہور ہوا۔ عالم میں خالق تعالیٰ جاری و ساری ہے جو کچھ ہے وہ اسی کے اسماء و صفات کا منہور ہے۔ کثرت اور تحدید کی ترقی میں اصول وحدت کا روبرو ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر شے میں ذات باری کا جلوہ موجود اور اسکی پوز آتی ہے۔ اس واسطے مظاہر اپنے اندر کشش اور دبستگی کا سامان رکھتے ہیں۔ جو اس ظاہر کی رسائی چونکہ محدود ہے اس لئے، عشق حقیقی کے مقامات تک رسائی وجدان کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اگر ذات واجب انسانی خودی اور مظاہر کو نیہ سے بالکل ماورا ہوتی تو اس کی موجودگی اور تاثیر کو انسان کیسے محسوس کرتا؟ ہمہ ادستی فلسفہ میں انسانی خودی کا غائب ہے کہ وہ انانے مطلق میں اپنے آپ کو ضم کر دے اور حقیقت سے علمگی کا احساس باقی نہ رہے۔ غرض کہ ہمہ ادستی فلسفہ کے تمام تصورات بجائے خود شعر ہیں اور ان میں تغزل کے تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جنہیں نئے نئے پیرایوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔

تصوف کے مسائل کو اردو غزل میں شروع ہی سے برتا گیا اس لئے کہ یہ موضوع رمز و کنایہ کے ساتھ خاص طور پر مناسبت رکھتا تھا۔ ولی اور میر تقی میر کو زیادہ تر مجاز سے دل بستگی رہی۔ لیکن ان اساتذہ کے ہاں بھی آپس کو ایسے اشعار طبع گئے جن میں تصوف کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اور اسلوب تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملات کی طرح حقیقی

عشق کی کیفیات بھی تفصیل، منطقی تسلسل اور مصراحت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ غزل میں تصوف کے مضمون اچھی طرح کھپ گئے۔ تصوف کے سہارے فلسفہ و حکمت نے بھی ایوان غزل میں بارپایا جن کی بدولت کلام میں تنوع پیدا ہوا اور لطافت، علوم و فنون بیان ہونے لگے جافظ سے لے کر غالب تک مشرقی ممالک کے علم و فن کی ساری ذہنی ترقی ہمیں غزلوں میں نکات شعری کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ غزل کی حقیقی اساس جذبات ہی رہے لیکن جذبات جذبات میں فرق ہوتا ہے۔ ایک اس شخص کے جذبات ہیں جس کا سینہ علوم و معارف کی روشنی سے منور ہے۔ ایک اس کے جذبات ہیں جو مادی حیوانی زندگی سے آگے اپنی نظر نہیں لے جاسکتا۔ ضرور تھا کہ اس فرق کا اثر غزل کھینے والوں کے کلام پر پڑتا اور پڑا۔

اردو میں میر و درد کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رچا ہوا ہے لیکن وہ تغزل اور شعریت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا  
ان بوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مرد دیکھا

ہمت چند اپنے ذمے دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے  
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس بیچنے کے ہاتھوں مر چلے  
دوستہ دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے  
شمع کے ماتہ ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے  
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ بھی آڑے آگیا جدھر چلے  
جوں شرر اسے ہستی بے بودیاں بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تک بس چل کے ساغر چلے  
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

بسان کاغذ آتش زدہ میرے گھرو ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں  
فلک سمجھ توہی ہم سے اور گلو گیری یہ ایک جیب ہے سوتا رتا رہ پکتے ہیں  
متوہمیں میں غالب اور نیاز بریلوی کے یہاں تصوف کا رنگ ملتا ہے۔ خاص  
طور پر نیاز بریلوی نے جو اپنے زمانے کے مشہور صاحب حال صوفی گذرے ہیں  
اپنے کلام میں سلوک کے اسرار اور رموز بیان کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

دید اپنے کی تھی اسے خواہش آپ کو ہر طرح بنا دیکھا  
صورت گل میں کھل کھل کے ہنسا شکل ببل میں چہچہا دیکھا  
شعش ہو کر کے اور پروانہ آپ کو آپ میں جلا دیکھا  
کر کے دعویٰ کہیں انا الحق کا پر سردار وہ کھنپا دیکھا  
تھا وہ برتر شامائے نیاز پھر وہی اب شامائے نیاز دیکھا  
کہیں ہے بادشاہ تخت نشین کہیں کا سہ لئے گدا دیکھا  
کہیں عابد بنا کہیں زاہد کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا  
کہیں وہ در لباس معشوقان بر سر ناز اور ادا دیکھا  
کہیں عاشق نیاز کی صورت سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

تو نے اپنا جلوہ دکھانے کو جو نقاب منہ سے اٹھا دیا  
دیں محو حیرت بخودی مجھے آئینہ سا بنا دیا  
وہ جو نقش پا کی طرح رہی کھتی منور اپنے وجود کی  
سو کشش سے دامن ناز کی اسے بھی زمیں سے مٹا دیا  
کیا ہی چین خواب عدم میں تھا تھا زلف یار کا کچھ خیال



سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

رگ دپے میں آگ بھڑک اٹھی پھونکنے پر اسی بدن  
مجھے سا قیائے آتشین کا یہ جام کیسا پلا دیا  
جی جی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا کیا  
جو لکھا پڑھا تھا نیا ز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

خاک کے تیلے نے دیکھ کیا ہی چایا ہے شور  
عشق کے میدان میں آ صورت انسان بنا  
جن و ملک کے اوپر کر رہا ہے اپنا زور  
بل بے سلمیٰ تیری افسے سمندر کے چور  
یہیں میں قلم کو لے قطرہ کا قطرہ رہا

خوشی کا عالم ہے اپنا مقام  
مبارک رہے تجھ کو دوا عطا بہشت  
نہیں آستانِ بحث و تکرار کے  
میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے۔  
غالب کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے اس کی چشم  
بینا نے حیات اور کائنات کو ہر ممکن نقطہ نظر سے دیکھا اور ان کی اس طرح  
ترجمانی کی کہ اس میں سب کچھ آ گیا۔ مجاز اور حقیقت جی شرح درد اشتیاق  
بھی اور حسن کرشمہ ساز کی معجز نمایاں بھی۔ شوخی اس بلا کی ہے کہ خود اپنے  
آپ تک کو نہیں چھوڑتے اور کبھی خود اپنے اوپر بھی چوٹ کر جاتے ہیں۔

یہ سائلِ تصوف یہ ترایانِ غالب  
مسائلِ تصوف کے ساتھ پری و شوں کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں کہ ہمیں تجزیہ  
حکمت کی خشکی انسانیت کی شگفتگی پر غالب نہ آ جائے۔

ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیان اپنا  
بن گیا تیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مجاز کو بعد میں دیکھیں گے۔ آئیے دیکھیں وہ حقیقت کی نسبت کیا کہتے ہیں انھیں جو کچھ کہنا ہے بڑی بلند آہنگی سے کہتے ہیں۔ مقبذل اور پیش پا افتادہ تشبیہوں سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ ان کے طرزِ ادا کی جدت کا یہ اقتضا تھا کہ خود اپنے تخیل سے نئی نئی ترکیبیں بندھیں اور اچھوتے استعارے اور کنائے ایجاد کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ ہر بات کو انوکھے طریقے سے بیان کیا۔ واجب الوجود کے مسئلہ کو کس معنی آفرینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہر چند ہر ایک شے میں توہن ہے      پر تجھ سے تو کوئی شے نہیں ہے  
ہاں کھائیو مت فریب ہستی      ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے  
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب      آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے

ہے تجلی تری سامان وجود      ذرہ بے پر تو غور شید نہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پر سارئی ہم      کر دیا کا فرمان اصنام خیالی نے مجھے

ہر جز جلوہ یکنائی معشوق نہیں      ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

ہے مثل نمود صور پر وجود مجسّم      یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج جباب میں

بحر کا وجود ان صورتوں کے تحت درپنہ ہے جو کبھی قطرہ کا کبھی موج کا اور کبھی جباب کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ مختلف صورتیں بحر کے علیحدہ کوئی وجود نہیں رہتیں بلکہ اس کی شانیں ہیں۔ وہ جیلو گر ہوتا ہے۔ اگر شائیں نہ ہوں۔ بحر کی ہستی نامکمل رہ جاوے۔ شاعر نے یہ ہی لطیف اور یلغ

طریقے سے انسانی وجود اور مظاہر خارجی کو اس طرح خالق کائنات سے وابستہ اور خود ان کی وجہ وجود کو آشکارا کیا ہے۔

بے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں غیب الغیب سے تصوف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے جو عقل و اور اک کی حدود سے پرے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کو تم عالم ظاہر سمجھ رہے ہو جو کثرت و تعدد کی صورت میں نظر آتا ہے وہ ذات احدیت ہی ہے۔ اس کی جلوہ فرمایاؤں سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مظاہر کوئی اس سے کوئی علیحدہ ہستی کھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے جدا نہیں ہیں۔ غالب نے بڑی دقیقہ سنجی سے مندرجہ بالا شعر میں خواب کی تمثیل سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ وضاحت تفصیل سے بے نیاز ہے۔ شاعرانہ وضاحت میں بھی رمز و ایسا کی مبہم کیفیت موجود رہتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ کوئی شخص اگر خواب کی حالت میں یہ دیکھے کہ وہ بیدار ہے تو کیا وہ واقعی بیدار ہوگا۔ نہیں۔ خواب میں اپنی بیداری کا خواب دیکھنے والا خواب ہی میں ہوگا۔ کائنات کے جلوؤں کی بوقلمونی اور انسان کی طاقت دید کے محدود ہونے کو اس طرح ظاہر کیا۔ صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائے دیوان غالب میں اسی طرح کے اور اشعار ملتے ہیں جن میں سلوک تصوف کے ملو پیش کئے گئے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسرب جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے  
یعنی کجس گردش پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

محرم نہیں ہے تو ہی تو پاسے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا  
لیکن غالب کے کلام کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیت پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں بڑی دقیقہ رسی سے زندگی کی گہٹیوں کو حکیمانہ انداز میں رمز و ایما کے ذریعے

بلھایا ہے۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دوسروں سے متاثر کرتی ہے اس کا طرز ادا ہے جس کو اردو شاعری کے لئے سرمایہ نازش سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے اکثر شاعر ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں۔ جولدت پرستی کی طرف مائل ہوا تو وہ کائنات میں سوائے اس کے اور کچھ دیکھتا ہی نہیں مجراندہ و الم سے متاثر ہوا تو اسے حسرت و غم کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن زندگی تو بڑی وسیع شے ہے۔ وہ مسرت اور غم اور لذت پرستی سب پر حاوی ہے اور پھر ان سے بالاتر بھی ہے۔ غالب نے اس نکتہ کو پا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں تنوع نظر آتا ہے جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہے۔ اس کے یہاں غم بھی ہے اور مسرت بھی، جوش جذبات بھی ہے اور عکسانہ نکتہ رسی بھی۔ تلخیل کے نقش و نگار بھی ہیں اور حقائق و محسوسات کی ترجمانی بھی۔ دیوان کا دیوان ایسی دل آویز موسیقی میں رچا ہوا ہے کہ اسے فردوس گوش کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔

غالب اور نیاز بریلوی کے بعد بھی غزل میں تصوف کے نکات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فانی 'اصغر اور جگر باد' تصوف کے ذوق شناس ہیں۔ مارفانہ مضامین میں اگر جدت ادا کی دلاویزی بھی شامل ہو جائے تو یہ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے اور اہل ذوق کے قلب پر بجلیاں گرنے لگتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فانی

تجلیات و ہم ہیں مشاہدات آب و گل	کرشمہ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری	ہوں تو میں شمع مگر بجھیں ہے پروانہ کا
اٹھتی نہیں تہمت نظارہ جمال	منہ دیکھتا ہوں جلوہ نظارہ ساز کا
کوئی چٹکی سی کلیجہ میں لئے جاتا ہے	ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے
حسن مطلق بھی ہے حجاب ان کا	اعتبار است بر ملا کی قسم

ہزار ڈھونڈئے اس کا نشان نہیں ملتا  
تعمیلات کی حد سے گزر رہی ہے تنگ  
تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا  
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک  
جبیں ملے تو ملے آستان نہیں ملتا  
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہوں کا  
ہم تمہارے ہیں ورنہ بھرہم کیا  
اس مرحلہ سنی، ماشائے گذر جا

## اعتراف گونڈوی

شورشِ دل جو وہ ہوتی تھی بدستور ہے آج  
جس سے کل تک دل قیاب بھینکا جاتا تھا  
نہیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دور ہے آج  
اسی شکلہ کو جو دیکھا تو سر طر ہے آج

بزدلہ حیران میں آ کر کوئی ہے اس کے سوا  
میں تو ان عجوبوں پر بھی سراپا دید ہوں  
لے خوشا ور ہے کز نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے  
اس کے جلوے کی ادال شان ستوری بھی ہے  
میری عروسی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا  
قرب کی راہوں میں میری ایک راہ دوری بھی ہے

اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف  
میں ہوں ازل سے گرم روعہ وجود  
ایسا حجاب چشم تماشا کہیں جسے  
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

یہ عشق نے دیکھا ہی عقل سے پہناں ہے  
لے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں  
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے  
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدہ حیراں ہے  
سوار تیرا دامن ہاتھوں میں میسے آیا  
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

## جگر

حسن کے مجرہ وحدت و کثرت کی قسم  
تجھ کو دیکھا مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں  
چشم حیرت میں ہے رب کچھ سرِ حیرت کی قسم  
اپنی کلم مائیگی جرات و ہمت کی قسم

مجھ سے چھپتا تجھے زیبا نہیں ہے پیکر حسن میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

کرشمے ذات و صفات کے ہیں بحال قدرت دکھائے ہیں  
کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں  
کہاں کی دید اور کس کا عرفاں جو اس گم ہیں نظر پر نشان  
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں  
یہ حادثات زمانہ کیا ہیں اسی کے حسن طلب کے جلوے  
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں  
کرشمے ہیں حسن بے جہت کے فتنوں ہیں شہم مناسبت کے  
ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں  
نفس نفس میں صفات تازہ محبت تازہ حیات تازہ  
انھیں میرے ذات تازہ جو خود کو تجھ میں مارت ہیں

لگا و شوق ہی کچھ جانتی ہے راز ستوی وہ خود جلوہ ہے ان کا نبض پر داسمجھے یہا

یہ فریب جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دل بے خبر  
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر  
میں رہیں درد ہی سگر بنے اور چاہئے کیا جگر  
عزم یار ہے میرا شیفتہ میں فریفتہ عزم یار پر

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلہ طور ہو کر  
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر  
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

۱۱۳  
 لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم جلوہ بہ جلوہ آئے جا  
 تشنہٴ حسن ذات ہوں تشنہٴ لبی بڑھائے جا  
 لطف سے ہو کہ قہر سے ہو گا کبھی تو روبرو  
 اس کا جہاں پتہ چلے شور و ہیچ چائے جا

عراج شوق کیلئے یا حاصل تصور جس سمت دیکھتا ہوں تو سرگرداں ہے  
 شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے  
 لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ابہام کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے  
 لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارہ اور کنایہ سے وسعت پیدا کی  
 جاتی ہے۔ تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہوتی جو استعارہ اور کنایہ  
 میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ اس میں رمز و ابہام کا ایمانی عنصر نسبتاً  
 کم ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت  
 آجاتی ہے۔ اگر استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کا استعمال اس لئے کیا جائے  
 کہ معنی کی تفصیل اور وضاحت ہو تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جائیں گے اور ان  
 کی قوت و تاثیر میں کمی آجانا لازمی ہے۔ استعارہ سے حقیقت کی تصویر کشی  
 مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت  
 کثرت متنوع، اس کی بلندیاں اور پستیاں، زمان و مکان کی کبھی نہ ختم  
 ہونے والی پہنائیاں، ذہن کی شعوری اور غیر شعوری کیفیات دقیق اور  
 الجھی ہوئی ہوتی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب  
 سے زیادہ الجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور اس کے جذباتی  
 حقایق ہیں جنہیں حرف و صوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ہر انسان  
 دوہرا مطلب رکھتا ہے۔ ایک کی جگہ دو تصورات ذہن کے سامنے آتے ہیں  
 لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ رہتی ہے۔ استعارہ اور کنایہ کی مدد سے

جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحہ میں دلتی ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ استعارہ ایک فن ہے کہ اس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غزل میں استعارہ اور کنایہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو اس لئے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمران کر سکتا ہے دل نشین کرتا ہے اور اول الذکر کا رمز و ایما کے ذریعہ تحریر میں اضافہ کرتا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جنت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں بہت شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں کہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔ مثلاً غالب اس مضمران کو تشبیہ و استعارہ کی زبان میں کیا خوب بیان کرتا ہے کہ انسان کی عمر گزری چلی جاتی ہے اور اس کی گزری پائی پڑھیں کو کوئی تابو نہیں۔ یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر دونوں ہم آغوش ہیں۔

رود میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تجھے

لئے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں  
استعارہ نے معانی کو چار چاند لگا دیے اور معانی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی۔ یہی حسن ادا ہے جس نے غالب کو غالب بنایا اور اس کے شاعرانہ رتبہ کو اتنا بلند کر دیا کہ اب تک وہاں کوئی نہ پہنچ سکا۔ انسان کی جتنی بے ثبات کی تصویر استعارہ اور تخیل کے ذریعہ دوسری جگہ یوں پیش کی ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہبعلیٰ برقِ خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا  
کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت تازگی اور بلندی سے کیا جاسکتا ہے جو معانی و بیان کی جان ہوتے ہیں۔ استعارہ رمز آفریں



ہوتا ہے اس لئے جذبہ اور اندرونی تجربہ کی تصویر اس سے بہتر کھینچنے والا کوئی اور  
 ذریعہ کلام نہیں۔ زندگی اور خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل کے بجائے استعارہ اور  
 کنایہ سے اس کی توجیہ اور باز آفرینی ممکن ہوتی ہے۔ اگر تشبیہوں یا معنی کی تفصیل  
 پر زیادہ توجہ کی گئی تو شعر کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ غزل گو شاعر کے پیش نظر  
 معنی کی صحت سے زیادہ استعارہ یا کنایہ کی صحت ہوتی ہے۔ وہ اشیا اور حقائق  
 کائنات کو دیکھتا نہیں دیکھتا اور نہیں دیکھنا چاہتا جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ وہ  
 جب انھیں بیان کرتا ہے تو ان لطیف تعلقات کو بھی اپنے پیش نظر رکھتا  
 ہے جو دوسری اشیا اور حقائق سے انھیں وابستہ و چوستہ کئے ہوئے ہیں  
 پھر جب وہ ان کا تعلقی استعارہ اور کنایہ کے ذریعہ اپنے اندرونی جذبہ اور تجربہ  
 کی روشنی میں جوڑتا ہے تو لازمی طور پر اس کا نقطہ نظر داخل ہو جاتا ہے اور اس  
 کے بیان میں رمز و اہام کی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رمزیت موسیقی  
 کی طرح حقیقت اشیا کے جو ناقابل فہم عناصر ہیں ان کی علامت ہے۔ اسی  
 کے ذریعے جذبات کی بھول بھلیاں کے پچ و خم اور ان کی پراسرار کیفیات کا  
 پتہ چلتا ہے ورنہ پیاری منطق ان تضادوں کو دور کر سکتی ہے جو ہاں قدم  
 قدم پر ملتے ہیں اور نہ ان کی کوئی توجیہ کر سکتی ہے۔ جذبہ کے روبرو منطق سرگرداں  
 ہو جاتی ہے اور اپنی نارسائی کو تسلیم کرتے میں اسے قائل نہیں ہوتا۔

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبات کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے  
 کے لئے کبھی معانی کے لئے سوزوں الفاظ تلاش کرتا ہے اور کبھی الفاظ  
 کے لئے معانی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت  
 معین ہوتی ہے اور لفظوں کے بر محل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں  
 آتا ہے۔ شاعر کا خیال زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے اور  
 دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے۔ الفاظ اور معانی کے صحیح ربط سے  
 جن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آ سکتی علم و نظر

کی رحمت سے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے کبھی بعض مخصوص شمری علامتوں یا تیموں کا آسرا لیا جاتا ہے۔ کبھی صنائع و بدائع سے شمر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی نقل قول سے ایمانی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ صدقوں میں حسن تخیل، مبالغہ، تضاد، مقابلہ، ایما، مراۃ النظر اور بخارائے مارغانہ سب کی سب غزل کی رمز کی کیفیت اور تاثیر کو بڑھاتی ہیں۔ صنائع فطری و معنوی سے شاعر کو ایسے تخیل کی پرواز میں مدد ملتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا اعتدال برقرار رہے۔ اگر صفت کی خاطر صفت برتی گئی اور شعر کہا گیا تو رمز کی تاثیر مجروح ہو جائے گی۔ صنائع کبھی بلاغت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ضرور ہے کہ ان سے شعر کی طلسمی تاثیر میں اضافہ ہو نہ کہ کمی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں جن ادا کہاں سے آتا ہے؟ اس کے قواعد و ضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں۔ ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ لطف آ جاتا ہے اور دوسرا دی بات کہتا ہے اور سننے والے درجہ بھی متاثر نہیں ہوتے یہ امتیاز ذوق چیز ہے۔ عشق کے پامال مضمون بزجات کا ایک شعر ہے اور ذوق کا ایک شعر دونوں شعر کے فرق سے دونوں کی شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زلیات کا مرقا پایا درود کی دو اپائی دردِ دادوا پایا  
ذوق اپنی فہم و نظر کے مطابق عشق کو تیرہ خاکدان کے لئے چراغ قرار دیتے ہیں۔ معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا بلکہ معمولی اور بلکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بلند بات کے لئے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام بے اثر رہے گا۔ ان کا شعر ہے۔

فرغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے

۷۱  
اس غزل میں محض رعایت فطری سے جو صنفی آفرینی کی کوئی شش کی ہے وہ کسی قدر  
بھرتی ہے۔ - کہتے ہیں

الہی مکن میں کیا اس نظم نے جو تکھنہ کیا  
کہ بات نہ رکھتے ہیں کائنات پر سب اذات کیلئے

ذوق کے ہاں اسی رعایت فطری کی کثرت سے طرزِ ادا کی ندرت  
یا حسن پیدا نہ ہو سکا۔ محمد حسین آزاد انھیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن قبول  
میں ان کا مرتبہ بلند نہیں۔ اور غالب کی تودہ گو گو بھی نہیں پہنچتے۔  
غالب کا شعر ہے:-

سب کہاں کچھ لالہ رنگ میں تیاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہیں گی کہ نہاں گئیں  
ناخن نے بانگی میں مھنوں یا نہ صاحبے لیکن اس کے شعر میں غالب کے شعر کا سا  
طبعی اور رمزی اثر نہیں پیدا ہو سکا۔ ناسخ کا شعر ہے

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں  
اس لئے خاک سے ہوتے ہی گشتِ پیدا  
ناتوا نے منطقی استدلال کی کوشش کی جو روح غزل پر گراں گذرتی ہے اسی لئے  
اس کا شعر تاثر سے محروم رہا اور اسلوب بیان میں کوئی بلندی یا نزاکت پیدا  
نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف غالب نے دلیل کے بجائے محض دعوے سے اپنا  
کام نکال لیا اس لئے کہ اس کا شعر ایک مکمل استعارہ بالکناہ ہے۔ وہ وہیں  
کی اشارہ سے رہبری کرتا ہے استدلال کی بھول بھلیاں میں اسے نہیں  
بھٹکتا۔ رمزی اثر کی کمی کے باعث ناسخ کا شعر غالب کے شعر کے سامنے نشر  
معلوم ہوتا ہے۔

طرزِ ادا کا انحصار الفاظ اور معانی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزائے  
لائعک ہیں۔ اگر یہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انہیں الفاظ کی جو  
خارجی قیادیں نہ کرانی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

شعر کی اور خاص طور پر شعر غزل کی خارجی حیثیت و اثر کا دار و مدار الفاظ کے صیغ اور مودوں استعمال پر ہوتا ہے۔ لفظوں کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو وہ خود معنی بن جاتے ہیں جس طرح موسیقی میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ صورت صرف بڑے اساتذہ کے لیے ہی نظر آتی ہے۔ عموماً لفظ اور معنی کی دوئی قائم رہتی ہے لیکن اس دوئی میں موزونیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر الفاظ کو شعر کا جسم اور معانی کو روح سمجھا جائے تو شعر ہے کہ معین و لطیف روح کا خارجی قائلہ کشن اور لطافت رکھتا ہو، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پر اثر طریق پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں نمود و نظاں ہو جاتے ہیں اسی طرح مادی جسمانی کیفیات روح پر اپنا گہرا جھاب لگائے بغیر نہیں رہیں بالکل یہی حال الفاظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی جو یوں ہی بدلتی اور بے تکے بن سے استعمال کیا گیا ہو۔ چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر ان کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور تاثیر تو نام کو بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر غزل کی رمزی اور ابائی کیفیت اس وقت تکمیل پاتی ہے جب الفاظ و معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو بولا کرتے ہوں۔ اسی سے طرز ادا کی دل نشینی عبارت ہے جو کسی ایک خیال یا احساس حسن کے کسی ایک لمحے کو ابدی بنا دیتی ہے۔

الفاظ میں تصورات پوشیدہ ہوتے ہیں یہ تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے۔ غزل گو شاء بعض دفعہ تعلیمات کے ذریعہ جو دراصل ایمانی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک

خاص فضا کی سریر کا دیتا ہے۔ موسیٰ اور طور، شیریں اور فرہاد، اعلیٰ اور محض،  
عمود اور ایاز کی تنگیوں کا نرم خیالات کی باز آفرینی کے لئے نہ ہر دستِ محرم کا  
شعری بن جاتی ہیں۔ اور یہ صرف تلمیحات ہی تک محدود نہیں۔ ہر نقطہ میں وقت  
اور توانائی کا فن۔ نہ غنی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو بہتے والا اس کے استعمال کا  
ذہب جانتا ہو۔ بقول غالبؔ:

تغنیہ معنی کا حلسم اس کو سمجھے  
جو لفظ کے قالب میں گئے اندر میں آئے

ہر نقطہ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایک لفظ سے جو  
خیالی تازنات اور ذہنی مسکرات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے ہر اہلِ انشا کا  
سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے  
شعر کا دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیے وہاں نہیں ہو سکتا بعض لفظ  
ایک نقطہ میں ایک جہانِ مسمیٰ پنہاں ہوتا ہے۔ اور ذہن کو ایک خاص فضا  
میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ شعرِ غزل میں آہنگ احساس اور آہنگِ سماعی  
کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل  
نہیں کیا جاسکتا۔ بحر اور قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں  
کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور انھیں سن کر محنت  
شعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ بالکل اپنی طرح جیسے بعض وقت  
خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جتنی جاگتی شکل میں نظروں کے  
سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارہ اور کنایہ کی کیفیت  
ہوتی ہے جن کی تفصیلی خلا کو ملاحظہ بعد میں کر لیتا ہے۔

غزل کی ہر بحر اپنے اندلہ ایک قسم کا رمز دیا کرتی ہے۔ مثلاً بحر  
رمل جو سرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سہمی  
خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ

نیکن ہر خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی تبدیلیت حاصل نہ ہوئی  
جتنی کہ اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر منہی بحروں  
سے نسبتاً قریب تھی۔ اس بحر کے شعرا کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔  
رمل سدس مجنون تصور

شیخہ اسے کی شرت اسے ساقی پھیرے دست کہ بھرے بیٹھے میں  
ناصو آپ میں جرات نہ رہا اب سمجھ کر اسے سمجھائیے گا  
(برأت)

رمل شن مجنون مخدوف۔  
ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا  
عجب آرام دیا بیٹے پر دہالی نے مجھے  
(غالب)

چرخ گوہر پہ سلیقہ ہے ستم گاری میں  
کوئی معشوق ہے اس پر دہ انگاری میں  
(اصبا لکھنوی)

رے وعدے پر بٹھے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا  
کہ خوشی سے مرہ جاتے گرا اعتبار ہوتا  
(غالب)

رمل سدس مجنون مخدوف  
نہ کچھ آشفستہ سری نے مارا کہ مجھے چارہ گری نے مارا  
(مومن)  
اہل تدبیر کی دانا ندگیاں آبلوں پر بھی خا باندھتے ہیں  
(غالب)

ہجر کے غم سے نہ گھرا جات<sup>۱۱</sup> اتنا حسد ان نہیں رہا  
(عراق)

یوں قور و ٹٹے ہیں مگر لوگوں سے بولتے سناں ہیں اکسیر میرا  
(نشاۃ ام پور)

تھک کے بیٹھوں تو بکتا ہے جنوں ، دست و پا کو چڑھ سوئی ہے  
(جلیل)

بحر اور رریفت و اذیت کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر خاص طور پر  
ایسے الفاظ پر مشتمل ہے جن کے ساتھ شری نصوات صدیوں سے

دوست ہو گئے ہیں اور ان سے ایک خاص قسم کی ایمانی تعلق نکلی ہے۔ طرزِ ادا اور  
حسنِ سخن ان کے کوئی علیحدہ جہیز نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند اس قسم کے رمزی اور علامتی لفظوں  
کی مثالیں پیش کرنا ہوں جنہیں ہم ایسے غزل نگاروں نے محض شری کے طور پر برتنا ہی نہ کیا جنوں  
گر زبانِ ذخیرِ نوح، نقابِ آفتاب، نفسِ امار، سطحِ کعبہ، دھڑے، اصطلاحی لفظ اور علامتیں  
ہیں۔ گویا ان کے چاک ہونے میں عشق و شوق کی آشتی سری کی خاص رمزی اور ایمانی گویا  
ہے۔ انہیں جنہیں ہم ایسے شاعروں نے محسوس کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔  
جنوں و گریبان۔

زندہ ہیں ابھی غور و ش زنگی اپنے جنوں کا اب سنگِ مداو اور اس آشتی سری کا  
(دیس)

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے نہ دکھا مرے سر پہ بارِ گریبان  
(سید)

ایہ کے جنوں میں نامِ شایہ کی گویا ہے دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں  
(سید)

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا بہاؤ آنے دو میرا تھ ہے اور گریبان  
(یقین)

لے دست جنوں تیری مدد ہوئے نوب بھی اک جھٹکے میں ملتا ہے گریباں ٹھکانے

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا (جھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط)

مرے دست جہنم کی مشعل اچھا مل گیا (جہنم علی حسرت)

بیکاری جنوں کو ہے سر پیشنے کا شعل جب آتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی (اللہ اعلم)

تب چاک گریباں کا مزہ بدل نالاں جب اک نفس الہا ہوا ہر تار میں آئے (غائب)

نہ ناصح سے نادان کیا ہوا اگر اس نے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(غائب)

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی لے چلے غار سے ہم گوشہ اماں خالی

(آتش)

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاج بہار پہلے ہی چاک گریباں کے بیٹھے ہیں

(دراغ)

کیا کہیں آمد بہار ہوئی کیوں گریبان پہ ہاتھ جانے لگے

(مروج)

چاک ہو پردہ کو وحشت مجھے منظور نہیں درد یہ ہاتھ گریبان سے کچھ دور نہیں

(دراغ)

چاک کر میرے گریباں کو نہ لے دست جو نظر آتے یہ یہ کوج مجھے رسوائی کا

(اسیر کھنوی)



۲۳  
فصل جنوں ہے جامہ در کی بہار کے لڑے وہ ہاتھ جو کہ گریباں کے دور ہے  
(صبا لکھنوی)

اس کے دامن سے اُبھتا ہے ادب کے دست ثوق  
یہ بھی دیوے اسے کوئی میرا گریبان ہو گیا  
(ذاتی)

جوش جنوں سے کچھ نہ چلی ضبط عشق کی  
سو سو گلے سے آج گریباں نکل گئی  
(جگر)

کیا کیا ہوا ہنگام جیوں یہ نہیں معلوم  
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا  
(اصغر)

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک بونے کو  
تہائے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری  
(اصغر)

نشان ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہار ان کی  
بہار آئی گلے میں ڈالی دی دہمی گریباں کی  
(بیخود دہلوی)

### زنجیر :-

دل بند ہے بہارا موج ہوئے گل سے  
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا خالی  
(مست)

کچھ موج ہوا بیجاں لے یہ نظر آئی  
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی  
(مست)

ہاتھ میں سلا، زلف گرہ گیر نہیں  
زور دیواں ہوں میں بستہ زنجیر نہیں  
(خواجہ وزیر)

قیدیں ہے ترے وحشی کو دہی زلف کی یاد  
ہاں کچھ اک بچہ گراں باری زنجیر بھی تھا  
(غالب)

فائدہ ادا دلف میں زنجیر سے جاکر گئے کیوں <sup>۱۴</sup> ایسے اگر غار ملا زنداں سے گھر آئے گئے کیا  
(غائب)

ہے شوق یار میں ہمہ تن رنگ لے کر اب  
بجز بہار کیوں نہ ہو زنجیر پائے گل  
(روانی و ہوی)

رخصت لے کر نہ ملاؤں جنوں زنجیر نہ بکھڑکائے ہے  
مردہ نہ ہمارے شہت پھر لٹا مرا کھینٹا ہے ہے  
(ذوق)

زنوں کی تری لہر نہاسے میں نگر آئے  
ہر موبہ وریا پہ ہو زنجیر کا دھوکا  
(عبد اللہ خان آبرو)

آگے زنجیر کو آنکھوں سے لگا تھے کون  
کس کے دل میں ہے اوپا کے دیوانوں کا  
(شاعر عظیم آبادی)

پیر گوشہ گیر صلف زنجیر ہے جنوں  
صبر اکبر نہ رہتگی ان دنوں کے ہوئے  
(فانی)

زنجیر پیر بلا دی نیم بہار نے  
پیر باہر آپ سے تراویز ہو گیا  
(بھگت)

موج :-

موج کی حرکت بے تابی اور بے تعینی تغزل کی رمز نگاری میں مختلف سراواں  
میں ملتی ہے۔ کہیں موج بہار کہیں موج رنگ کہیں بیج گل کہیں موج  
نہرب اور کہیں خالی موج بغور استعارہ محرک شعریابی ہے  
میر صاحب کا شعر ہے

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو اب دیدہ ترکو جو تم دیکھو تو ہے گرد آسما  
نائب کے ہاں خاص کر لفظ بیج اصطلاحی شاہد کثرت ملی ہیں۔ گل میں  
موج رنگ کی شوخی فروغ ہوئے کی چیز نہیں۔ رنگ تو اصل میں گل کی

خونین فوائی کا نتیجہ ہے۔ حسن تو جسے ملاحظہ ہو۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں گر گیا لئے وائے نالہ لب خرمین نولے لعل

(غالب)

محبوب کی رفتار کی مشکوٰۃ طرازی کے ذکر میں موج کی دل فریبی تشبیہ سے کیا خوب کام لیا ہے۔

دیکھو تو دل فریبی انراؤ نقش پا موج حرام یا رہ بھی کیا گل کتر گئی  
موج بہانہ کی دیوانگی قابلِ تامل ہے کہ وہ عشق کو درسِ خرام دیئے  
چلی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو نقش پا کی طرح غیر متحرک اور پابہ رہ بھر ہو ناپڑا۔  
دیوانگی ہے تجھ کو دوسرے حرام دنیا موج بہار بیکسر نہ بھر نقش پا ہے سہ  
(نسخہ حمیدیر)

لہ موج حرکت مستی کی علامت ہے جسے غالب نے اپنے کلام میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے  
خاص کر اس کلام میں جو بیدل کے رنگ میں ہے۔ لفظ موج کو کہیں تشبیہ اور کہیں استعارہ  
اور کہیں استعارہ بالکنایہ کے طور پر باندھا ہے اور اس کے استعمال کی کثرت غالب کے  
ذہنی تصور کے حرکی اور قوت آفرین ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح سیل اور سیلاب  
کے لفظ بھی جا بجا جاملئے ہیں۔ اس سے زیادہ حرکی تصور حیات کیا ہو گا کہ درو دیوار  
جیسی سکونی اور جوردی اشیاء کو بھی شاعر کی آنکھ سیلاب کا خیر مقدم کرتے وقت متحرک  
اور رقص کی حالت میں دکھتی ہے۔ چاہے اس حرکت اور رقص کا نتیجہ درو دیوار کا  
ابھدام ہی کیوں نہ ہو۔ غالب کا شعر ہے۔

نہ پوچھو کیونکہ دی اندیش مقدم سیلاب کہ تپتے ہیں پڑے سرسبز درو دیوار  
دوسری جگہ کہا ہے کہ عاشق کو اپنے مکان کی برابری کی پروا نہیں۔ اس کو  
فکر ہے تو اس بات کی کہ سیلاب جہد آئے سیلاب سے وہ ایسا مسرور ہوتا ہے جیسے کوئی  
جلت رنگ سن رہا ہو۔ (بقیہ سلسلہ تحت مشابہ دیکھو)

## اصغر کے شعر ہیں

یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو کہ بحر حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو  
یا زندگی کو فوجی ہر موج حوادث کی یا موت کا طاب ہوں انفاس سجاے  
خیزنگین پہ موجیں ہیں تبسم کے پہنائی کی شعاعیں کیا بڑیں رنکت بکلی آئی گلستا کی  
جرعہ ہے توی مستی کی آواہو جانت موج صبا تری ہر لہزش مستانہ بنے

## (سبند ص ۱۲۵ حاشیہ ۱)

مقدم سلاب سے دل کیا نشا کا رنگ ہے خانہ عاشق گر ساز صدائے آب تھا  
شاعر کو دشتِ وفا میں سراب نظر کرتی ہے جو سرابِ فریب ہے اس سراب کا ہرزہ  
جو ہر تیک کی طرح تیز اور چکدار ہوتا ہے۔

موجِ سراب دشتِ وفا کا زبچہ حال ہرزہ مثل جوہر تیغ آبدارِ نغصا  
لفظ موج کی استعمال کی دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ضبط گریہ گہر آبلہ لایا آخر پائے صد موج بطوفان کدہ دل باندھا  
نا امید نے بہ تقریب مضامین خمار کوچہ موج کو خیازہ ساحل باندھا  
دھوکا دکھایا ماندگی سے ذوق کم ہوا حباب موج رفتار ہے نقش قدم میرا  
روانی لائے موج خونِ اسل سے ٹپکتا ہے کہ لطف ہے عجاظا فرق قاتل پسند آیا  
جست تھی چین سے لیکن اب یہ بدوائی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا  
اسد دشت پرست گوشہ تنہائی دل ہے برنگ موج کے خیازہ ساغر ہے دم میرا  
نفس موج محیط بے خودی ہے تفاعل ہائے ساقی کا گلہ کیا  
بے خون دل کے چشم میں موج گج غبار بہ سیکہ خراب ہے ملے کے سراغ کا  
ذوق مرثا سے بے پردہ ہے طوفان میرا موج خیازہ ہے برزمِ نساہاں میرا  
موج غم سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ بار سے اٹھ جائیں کیا  
لسانِ اجہر آئینہ از ویرانی دل ہا غبار کوچہ لائے موج ہے خاشاک ساحل میرا  
دقیقہ مشائے

جگر کے ہاں ایک موج مئے خانے کو بہا لے جاتی ہے۔ کہتے ہیں  
میکشوا! مزدہ کو باقی نہ رہی قیید مکان  
آج ایک موج بہا لے گئی میخانے کو

بکسلہ حاجی ۱۳۹۹ء سے زبرد زبرد ویرانہ تھا  
دل در رکاب سمیرا خانہ خراب صحرا  
ساقی نے از بھر گریباں چاکی موج باؤ نہاب  
مگر وہ شورش ہے طوفان طراز فوق خوزیری  
چہر ہوا دلت کہ ہر بال کشا موج شراب  
پوچھت وجہ یہ مستی ارباب چمن  
جہو اعز مئے بخت رسا لکھتا ہے  
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر  
عام طور پر ہمارے شاعروں کے یہاں میٹھ و طرب سی سکونی حالت سے عبارت ہوتا ہے  
جس میں دل کی ساری آرزوئیں لری ہو جاتیں۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں عیش و  
طرب کا تصور بھی سکونی نہیں بلکہ حرکتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اس نے بتایا ہے کہ طوفان  
عیش کے گرداب کا اگر تجربہ کریں تو اس میں موج گل، موج تنق، موج صبا اور موج شراب  
کے اجڑاؤں گے۔

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو  
جس قدر موج تباہی ہے جگر نشہ ناز  
مذہب ذلیل ٹولہ میں رنگ اور موج دولہاں  
سے ایک دوسرے میں سودیاں گے ہر شرعے مستی شکیں ہے ایسا عین ہونا کہ نشہ رنگ نے عالم مستی  
کو زندگی کی حرکت میں تبدیل کر دیا ہے۔ موج شراب کبھی تو رنگ تاک میں جان بن کر دوڑی  
پھرتی ہے اور کبھی رنگ کے شہ پر لگا کر ہنگامہ دہستی میں بال کشائی کرتی ہے۔ رنگ کی  
۱۳۹۹ء بمطابق ۱۳۹۹ء

۱۲۸  
جگہ کے کلام میں لفظ موج کی ایمانی مہاسیاں جا۔ جاد کھائی دیتی ہیں۔  
نی بھی جا زائد غذا کا نام لے کر لیا بھی جا  
بادہ کو ترک کر بھی اک موج پیمانے میں ہے

دستِ جاسد سے بالِ کنائی یا ازما لطف سے خالی نہیں۔

بسکہ دوڑے ہے رگ تاکہ میں خوں ہو کر  
موج گلی سے چراغاں ہے گزرگا ہویاں  
نشہ کے پردہ میں ہے محو تر شاہے دماغ  
ایک عالم پر ہے طوفانی کیفیت۔ فصل  
شرح ہنگامہ آہنی ہے نہ ہے موسم گل  
ہوش اُڑتے ہیں سرے جلوہ گل دیکھ اسد  
ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خون خلق  
ہجوم فکر سے دل تیل موج لرزے ہے  
کون آیا جہین بیتاب استقبال ہے  
شور جواں تھا کنار بحر یکس کا کہ آج  
چے فروغ ماہ سے ہر موج ایک قصہ رخاک  
گر بعد مرگ وحشت دل کا گلہ گردن  
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شفی کار دل  
پیدا نہیں ہے اصل تلک و تازہ جستجو  
بے دماغی جیلہ جوئے زک تنہائی نہیں  
لے گئی ساقی کی نوحہ قلم آستامی مری  
اہل بینش کو ہے طوفان حوادث سکت  
مبادا بے تکلف فصل کا برگ و تراگم ہو

شہ پر رگ سے ہے بالِ کنائی موج شراب  
ہے تصور میں زبں جلوہ ناموج شراب  
بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب  
موج سبزہ کوخیز سے ناموج شراب  
بے تصور میں زبں جلوہ ناموج شراب  
پھر ہوا وقت کے ہو بالِ کنائی موج شراب  
لرزے ہے موج مئے نری زقار دیکھ کر  
کہ شیشہ تارک و صہبائے آہگینہ گزار  
جنش موج صبا ہے شوخی زقار یاغ  
گرد ساحل ہے بزم موج دریا نمک  
سیل سے فرش کنان کرتے ہیں تادیران ہم  
موج غبار سے پر یک دشت واکر و  
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یو  
ماتند موج آب زمان پریدہ ہوں  
ورد کیا موج نفس زنجیر رسوائی نہیں  
موج مئے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں  
لطرہ موج کم از سلی استاد نہیں  
مگر طوفان مئے میں بجش موج صبا گم ہو

(بقیہ بحث ۱۲۹ پر)

ترے جلوؤں کو دیکھیں اور سرے دل کی طرف دیکھیں  
کہاں ہیں اقبال موج و ساعل دیکھنے والے (چتر)

رجلہ عاشقہ ص ۱۲

نہیں جز در دنگین گومش ہاے بیدار  
بلاگردان تنگین بیان صد موج و گوھر  
ہے وحشت جنوں کی بہار اس قدر کہ ہے  
میکدے میں نبدل افسردہ بادیہ کشتاں  
مہتی فریب نامہ موج مراب ہے  
ناتنا پریش تیغ حفا پر تازہ ماہ  
دو خود گمہ شنگی میں خرمی پر حرف ہے  
ماں آب دو اند موسم غم میں حرم ہے  
کشا کش ہاے مہتی سے کرے کیاسی آزادی  
غزوہ لطف ساقی نشہ بے باکی ستان  
جہان ندان سوتیاں دہائے پریشان ہے  
ترجیں رکھتی ہے شرم قطرہ سامانی مجھے  
ہمارا دیکھنا گرتنگ ہے میر گلستاں کو  
چشم خواباں سے فروش نشہ دار تازہ ہے  
دیوانچی ہے تجھ کو درس خزام دینا  
دو دیاے مجھ کو ساقی لیکن نمسا رباتی  
یک برگ بے فانی صد دعوت نیتان  
روانی موج سے کی گر خط جام آشنا ہوئے  
ہے کند موج گل آشفقہ قرآ کی اسد

کہ موج گریہ میں صد خندہ دندان ناگم ہو  
غرق بھی جن کے عارض پر بہ کھلے جیالگم ہو  
بال پری بہ شوخی موج صبا غرو  
سوج سے شمس خط جام ہے بہ ماہ  
یک عمر ناز شوخی عزان اٹھائے  
حوسہ دریا نے بیتابی میں ہے اک موج فوں بھی  
موج غبار سرور بھوئی ہے صدا مجھے  
زنا و گستاخ ہے موج صبا مجھے  
ہوئی زنجیر موج آب کہ فرصت وانی کی  
غم دامن عصیاں ہے طراوت سب کوثر کی  
طش شمش جہت یک حلقہ گرداب طوفاں ہے  
موج گرداب جیائے چین پیشانی مجھے  
شماراہ سے موج صبا دامن گلچین ہے  
سرور گویا موج ذرد شعلہ آواز ہے  
سوج بہار بیکسر زنجیر نقش پا ہے  
تا کوچہ دادن موج حیارہ آشنا ہے  
طوفان نالہ دل تا موج یوریا ہے  
کھینے کیفیت اس سطر قلم کی عبارت کی  
رنگیاں بوجہ سوار تر سن چالاک ہے

ساقی کی فیض مست نگاہی کے میں شمار ایک ایک موج نے کورنگ تباں بنادیا  
(جگر)

کیسا قطرہ، کیسا دریا، کس کا طوفان، کس کی موج  
نوجو چاہے تو ڈبو دے خشکی ساحل مجھے جگر

”موج ہو اے دردِ دل“ کی ترکیب اور اس کی صنویت قابلِ داد ہے۔  
جس طرف وہ شوخ نظریں اٹھ تھیں لے اڑی موج ہو اے دردِ دل جگر  
بعدِ حاضر کے چند دوسرے شاعروں کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

مکونِ خاطر بلبل ہے اعطرابِ بہار ز موج ہوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا  
(فانی)

دریا نے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے۔

جو موج ڈبو دے ساحل بے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں  
(فانی)

لب دریا سے غرض نہ تہ دریا سے موج و گرداب سے دستِ فگریاں ہونا  
(زیکخانہ)

(بندِ حاشیہ ۱۱۹)۔

بیچا تنگی، خوں کا موجِ رم آہو ہا  
درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگہ کا یارب  
مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے  
اس میاں میں گرفتار جنوں میں کہ جلا  
لے ہرزہ دہائی سنتِ ممکنِ جنوں مہینے  
یتیمی یادِ دوست ہرنگِ تسلی ہے  
چنائے سے ہے سروشِ طہار ہے  
ہے موجِ دن اک تلخِ خونِ گاش ہی ہو  
خودِ نشاط و سرخوشی ہے آمدِ فضلِ بہار

دام نگہ الفت زنجبیرِ پیشانی  
غنیچہ صد آئینہ زانوئے گلستانِ زدہ ہے  
موجِ شرابِ یک مرہِ خوابِ ناک ہے  
موجِ رینگ سے دل پائے بہ بوجِ آس  
تا آبدِ محلِ شش موجِ گھر آوے  
موجِ تیشِ جنوں محلِ کشِ لیلیٰ ہے  
بالِ تدرؤِ جلوہ موجِ شراب ہے  
آتا ہے ابھی دیکھے کیا کیا مرے آگے  
آج ہر سیلِ رواں عالم میں موجِ بارہ ہے



رخ رنگین پر موجیں ہیں قسم ہائے پند کی شعاعیں کیا پڑیں زحمت کمال آئی گلستان کی  
(اصغر)

پرودہ و نقاب :-

نقاب خود رمز و طلسم کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ غزل کی  
رمز نگاری کے لئے یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص ثابت  
رکھتا ہے۔ اردو غزل گو شاعروں کے دیوان حجاب و نقاب کی مضمون آفرینوں  
سے بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں معاملہ بندی اور واقعہ گذاری کی جو جزئیات  
پیدا کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشری زندگی کا سچا رقعہ اور خلیل  
نفس کے ماہر کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھینا کم مٹا شائبہ میں یہ پردا کچھ

(میر)

نقائے نے بھی کام کیا و آن نقاب کا مستی سے ہر نگہ سے رخ پر بکھر گئی

(غالب)

نظارہ کیا حریف ہو اس برق من کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

(غالب)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے پر کھلا

(غالب)

ایک جگہ غالب اپنے محبوب کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہم سے خصوصیت سے منہ  
نہ چھپاؤ ورنہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہوں گے شاعر کا کہنا ہے کہ اگر محبوب بیگوار  
بے حجاب رہے تو دوسروں پر محبت کا حال نہیں کمال حسن طلب کی بلاغت میں  
ایمانی اثر آفرینی کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے کہتے ہیں۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی منہ چھپانا ہم سے مجھڑا چائیے  
دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ محبوب میر کے ساتھ بے جانی سے

پیش آتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کے ساتھ اسے کوئی خصوصیت نہیں، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ اظہار رشک کی بڑی لطیف صورت پیدا کی ہے۔  
 ورنہ پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں جلوے نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں

(شفقت)

اس رونے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی

(داغ)

نگاہ شوق نے کیا خواب میں نہیں دیکھا نیا حجاب ہے چھپتے ہو رو برو ہو کر

(داغ)

ورنہ جوش حسن نے بے پے پردہ کر دیا تونی گرہ راق سے بند نقاب کی

(داغ)

داغ کا دعویٰ ہے کہ محبوب چاہے چھپنے کی کتنی کوشش کرے لیکن وہ نہیں چھپ سکتا

اس لئے کہ میری نظریں کون و مکاں کے جلوے سائے ہوئے ہیں۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

پاؤ جو حجاب کے نگہ شوق میں محبوب کا جلوہ موجود رہتا ہے۔ اس شعر میں اثبات

و نفی سے حسن کلام کے جوہر کو خوب چمکایا ہے۔

ان سے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے ان سے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

(داغ)

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے مجھ حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو غیب تھا

(جلال)

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے وہ تو کہ چھوڑ دیا ہے نقاب کہ کے مجھے

(وقار امپوری)

پچھے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

(حسرت)

وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہو کر ہے ہجوم حسن کے پروئے نقاب کے بدلے

(حسرت)

جمال بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا کلیم برق طور تھی کرتا تھا نقاب کا

(فانی)

بہال خود رخ بے پردہ کا نقاب ہوا نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

(فانی)

نئی قیامت ان مجویوں پر بھی سراپا دید ہوں اس کے جلوے کی ادا ایک شان تو رہی بھی

(اصغر)

تھیں خود نمود حسن میں ثنائیں حجاب کی مجھ کو خبر ہی نہ رہے بے حجاب کی

(اصغر)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی

دور نہ چیز ہی کیا ہے گزشتہ نقاب ان کا

(بنگر)

اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا مری نظر نہ پھوٹی آپ کا حجاب ہوا

(جگر)

## نفس اور آشیانہ

نفس اور آشیانہ کی بھڑی علامت میں ازبور نزل گو شاعروں نے جدت ادا کا حق ادا

کیا ہے یہ محض جدت ادا اور سن نکل ہے جس کی وجہ سے فرمودہ مضمون میں بھی

تازگی اور شکستگی آجاتی ہے۔ لفظ کے معنوں سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہے

کہ اس کے نتیجہ نکلنے کے ذوق و وجدان میں اس کا کیا سہنوم ہے۔ نفس اور آشیانہ

کے معنوں میں غلط فہمی کی گئی ہے۔ ہمارے شاعروں نے کس طرح غلامی طور پر ہوتا ہے۔

جب کوئی ہے بجلی تب جانب گنتاں رکھتی ہے پھیڑ میرے غاشاک آٹیاں سے  
(میر)

کیسا کیسا قفس سے سر مارا موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے  
(میر)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے تودہ دم گری ہے جس کل بجلی وہ میرا آٹیاں کہوں ہو  
(غالب)

کچھ قفس میں ان دزل گتہ ہے جی آٹیاں اپنا ہوا بر باد کیا  
(مومن)

خوشا قست قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے نظر بھی اب تو جاسکتی نہیں دیوار گلشن تک

(نیم دہوی)

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں جیسے کبھی آنکھوں سے گلستان نہیں دیکھا  
(صفر گوندوی)

سوار جلا ہے قویر سوار بنا ہے ہم سوختہ جافوں کا شیمن بھی جلا ہے  
(صفر گوندوی)

چمکیں بڑا کیا جو یہ تینکے جلا دیئے تھا آٹیاں مگر تے پھولوں سے دور تھا  
(ثاقب لکھنوی)

باغباں نے آگ دی جب آٹیاں نے کمرے جن پہ تیکہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے  
(ثاقب لکھنوی)

برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر آٹیاں کے ساتھ آج آئی ہر جہت پر بھی  
(ثاقب لکھنوی)

نیاہیں دروغ نگہ گرم بھی نہیں بجلی تڑپ رہی ہے مرے آٹیاں سے دو  
(طاف)

اس کے سوا نہیں خبر آئیاں مجھے میں تھا اسیر دام تو بجلی چین میں تھی

(قافیہ)

فصل گل جو یاد آئی آئیاں بھی یاد آئیاں فصل گل میں اجڑا تھا شاید آئیاں اپنا

(قافیہ)

ہماری شاعری میں اسی طرح کے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جو باوجود روش پر افادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے سن استعمال سے ایمانی اور علمی اثر کا خزانہ لپیٹے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا۔ نئے لفظ اور نئی بندشیں دیکھیں اگر ان میں ایمانی اثر آفرینی ہو۔ اور اگر شاعر ایمانی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں نئی جان ڈال دے گا۔ مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں۔ رہرو اور منتریں، کشش اور ساحل، شمع اور پروانہ، جلوہ اور تماشا وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طاقت ہوگی۔ ان سب لفظوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں۔ لیکن کج بھی ہیں ان میں عجیب و غریب لطف مٹا ہے یہ اعجاز ہے قادر الکلامی کا۔

قادر الکلام شاعر لفظوں کو فاقہ انداز میں برتتا ہے وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کا کوئی پیشرو پہلے بہت چمکے تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کر دے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہو جاتا، اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمون اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک سکتا ہے۔ غزل گو شاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں جو ذہن کو حقیقت کی طرف متقل کرتی ہیں۔ تنزل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ اور جو شاعر اس قسّم کا جادو جگا سکے گا، اسی کو استاد کا فخر نصیب ہوگا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ وہ اسی کا ہو جاتا ہے جو اسکو بھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصے بعد  
 اخذ کیا اور اپنے پیشرو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا یا اس  
 میں کوئی نئی صفت پیدا کر دی تو وہ مضمون اس کا ہوا جائیگا۔ نظریاتی کا مشہور شعر ہے۔  
 ہلوتے یار میں ازین سست نہ خامی آید حکیم از دوست بیگمید کہ از کارشدم  
 سود آئے تھوڑے سے نقد سے مضمون کے کہاں سے کہاں پہونجا دیا۔  
 کیفیت جیٹم اس کے سمجھے یا بے سودا مگر کومرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں  
 موتن خاں کا شعر ہے

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہوں نہ نقشہ نہاں نہ نگہ کا سا  
 غالب نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔  
 کم انیس جلوہ گری میں تے کوچے بہشت وہی نقشہ ہے وے اس قدر آباد نہیں  
 سودا کی شعر ہے۔

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار ظالم بھر ہے جام و جلدی سے بھر نہیں  
 غالب نے اسی مضمون میں کیا طرز کاری دکھائی ہے۔

عمر بچہ کہ ہے برق حسد ام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی ہی  
 غالب کا شعر ہے۔

وے تر میلا تر انصاف عشر میں نہ ہو اب تلک تویر توقیے کہ ہاں بجا بیگا  
 ذوق نے اسی مضمون کو زیادہ بلند طبع انداز میں ادا کیا ہے۔

اب بچہ کہ یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پاتا تو کہ مر جائیں گے  
 راجہ بیر تو وہ کہتے ہیں کہ حضور یار میں انسان ہی نہیں غیر جاندار اسٹیا بھی  
 صاحب حسن سے متاثر ہوتی ہیں۔

راست نہیں میں تے مس کے شعلے حضور شمع کے نہ یہ نور نہ تو کبھی نور نہ تھا  
 داغ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ میانی سے بڑا کر دیا۔  
 روشن کے آگے شمع کھڑوہ کہتے ہیں۔

غالب نے شوقِ پابوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا شعر کہا ہے۔  
 لے توں سوئے میں اس کے پلڈوں کو سرے مگر ایسی باتوں سے وہ ظالم بھگوان بھجائیگا  
 حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا ان کا شعر ملاحظہ ہو۔  
 وہ خواب نازیں تھے اور نہ تھے شوقِ پابوسی

نہ سبھی پستی ہمت تری اس لطیف ایما کو

اگرچہ طرزِ ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی سہماں  
 کے بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ دراصل غزل ایک طرح کا طلسم ہے۔  
 غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے اس کو لفظوں کے سہماں کے  
 ذریعہ ایسی قوتیں مطاقی ملتی ہیں جن سے وہ میرے نہیں سمجھ سکتے شاعرانہ لفظ اس کی  
 ذہن کو اس کی جہنموں سے رہا کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اثر سحری کا کوئی  
 ذریعہ نہیں۔ بعض ایسے لفظ ہیں جن سے رمز کی کیفیت کی اثر آفرینی کا خاص  
 صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً وہ لفظ جن سے رنگ و بو کے تحریکات کی تخلیق  
 ہوتی ہے اور وہ غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل گو شاعر پر ایسا معلوم  
 ہوتا ہے جیسے نشہ کی سی کیفیت طاری رہتی ہے جس طرح نشہ کی حالت میں رنگ  
 اور بو دونوں کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے اسی طرح داستانِ شوق بیان کرنے  
 والے پر ان دونوں محرکات کا اثر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

تحلیل معنی کا ماہر اس کی چاہے کچھ بھی تو جیہ پیش کرے لیکن توجیہ سے حقیقت کی  
 تاثیر و تاثر تو نہیں بدلتے۔ رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمانی اور طبعی خاصیت  
 پائی جاتی ہے جو دراصل اندرونی بہار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو کے غزل گو  
 شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانے میں محسوس کیا۔ جدید شاعروں میں  
 حسرت کے یہاں اس محرک شری کی تاثیر کثرت سے ملتی ہیں۔ بعض دوسروں  
 کے یہاں بھی یہ احساس ملتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گر گل ہے گاہ رنگ گے باغ کی ہے بو آتا نہیں لفظِ لفظ ایک طرح  
 (میر)

دیکھ کے دست وپائے نگارین چپکے سے رہ جاویں نہ کیوں  
منہ بولے ہئے یار و گویا ہندی اس کی رچ سائی ہوئی

(میرا) —————  
کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلائے شور آج بیلوں کا جاتا ہے آسمان تک

(میرا) —————  
مشک صبر طبلہ طبلہ کیوں ہو کیا کام ہے ہم : مانع آشفۃ ہنس لٹ مغبر کے تری

(میرا) —————  
ہمکت خوش اس کے پنڈے کی سی آئی ہے اس سبب گل کو بہن کے دیریں نے بو کیا

(میرا) —————  
گل پیر ہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک ہے کس مرتبہ میں شوخ ہے اکی قہار رنگ

(میرا) —————  
موتے دلبر سے مشک بو ہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

(میرا) —————  
میر صاحب نے گل کے رنگ و بو دونوں کو دنیا کی ناپائیداری اور اس کی

بے وفائی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان سے شعری تحرک کا کام لیا ہے۔  
خضر ہے۔ بوئے گل اور رنگ گل دونوں میں دلکش لے نسیم

ایک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

ایک دوسرے شعوبیں گل کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بو  
سے اپنی بے خودی کے پیدا ہونے کی توجیہ کی ہے کہ اس سے کسی کی یاد تازہ

ہوتی ہے۔ گویا بو (مقتضائی ذہنی کے لیے ایک وسیلہ کا کام دیتی ہے  
خضر ہے۔

سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی کہ اس سست پیاں میں بوتھی کسوکی  
اسی مضمون پر مصحفی کا شعر ملاحظہ ہو۔



دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جبے چمن میں ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری ہرنگ  
جرات کے افسار ہیں۔

کہاں ہے گل میں صفائی تیرے بدن کی سیا بھری سہاگ کی تسبیح بوداہن کی سی

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے وہا گر چہ سو پردوں میں غنچہ چھپا لجا بیٹھے

سنگما بدن کو کہا کس منہ سے چتون میں ربودگی یہ کسی عطر کی بھی دیں نہیں

مک لگ گیا گلے سے جو وہ گل قواب مجھے جوں بوئے گل کے بے زخود رفتہ بو مجھے

جعفر علی حسرت کا شعر ہے

بہار ہو چکی اور شور و بلبلوں کا گیا مرے دماغ سے اس گل کی ہائے بو نہ گئی

غائب کے خیال میں پھول رنگ کے نشہ سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں کی  
طرح کھول دیتا ہے۔ حسن ثقیل لا جواب ہے۔

نشہ رنگ سے ہے واشد گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں  
غائب کے اسی مضمون پر دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔  
میں نے جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں رنگ کی گرمی چمن کی تباہی کا موجب نہ بن جائے  
سایہ گل میں اسے داغ اور نہکت گل میں موج درد نظر آتی ہے۔ رنگ  
بو کے دونوں محرکات شہی کو اس شعر میں ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔

سایہ گل داغ و جوش نہکت گل موج درد  
رنگ کی گرمی ہے تاراج جن کی فکر میں  
(نسخہ حمید)

نظر کا شر ہے  
شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی چمک پھر دیسی ہی  
جوڑے کی گنہ حادث قہر خدا بالوں کی ہبک پھر دیسی ہی

رنگ۔ بتابلو بونائب رنگ کے شہری محرک سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہ بات اس کے دو مخصوص رجحانوں کی آئینہ دار ہے۔ ایک تو اس کے احساس و ذہن کی لطافت اور دوسرے اس کا رنگ کی کاحر کی نقطہ نظر۔ رنگ میں یہ نسبت بوزیادہ لطافت ہے۔ رنگ کا احساس روشنی کی موجوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ گویا ہماری نظر کو کسی مادی تو سٹکا بہار انہیں سینا پڑتا ہے۔ غلاف اس کے بویں مادہ کے ذرات فضا کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں۔ چرخہ رنگ امواج کے توسط سے ہمدی نظر تک پہنچتا ہے اس لئے وہ سراسر حرکت ہے اور بونکی طرح اس میں مادیت مطلق نہیں فطرت میں ہر طرف رنگ ہی رنگ ہے۔ اگر کائنات کو صرف عالم رنگ کہیں تو بجا نہ ہوگا۔

اس پر تعجب نہیں کہ رنگ کی طلسماتی و لغزینی نے غالب کو متاثر کیا۔ اس کے دیوان میں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن میں بونشری محرک متا ہے جو اس کی لطافت طبع پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن یہ اشعار زیادہ تر بیدل کے رنگ میں ہیں۔

شرر فرصت ننگ ساہن یک عالم چراغاں ہے  
پوچھت رسوائی انداز استغنائے حسن  
دیرینے اے ناقافی ورنہ ہم نام آشاہیاں نے  
ز بس آتش نے فصل رنگ میں رنگ و گر یا یا  
نماقانی ہے تماشا فی عمر رفتہ

بقدر رنگ یاں گردش میں ہے پیانہ مصل کا  
دست مریہون حار خساہ رہیں غارہ نقا  
جلد رنگ میں بانہ سنا تھا جد استوار ایسا  
چراغ اگل سے ڈھونڈتے تھے چہ چہ میں شمع راہیا  
رنگ نے آئینہ آنگوں کے شکار کیا ایسا

رند کہتا ہے :-

خال عارض ہنگامں عنبر اشہب کا ہوا سونچھ کر زلف کی بوشک ختن یاد آیا  
ذکی مراد آبادی کا شعر ہے :-

عشق ہے رنگ خاک کو کہیں غبی سے بوسہ لینا ہے تیرے ہاتھ کی زیبائی کا  
حرک ہو کا مضمون تیسرے لکھنوی کے یہاں ملاحظہ ہو۔

چارہ گر سودا ہے لئے زلف برہم کا مجھے قید کر زنجیر موج نہکت برباد میں

بہارِ حافیہ ص ۱۴۱

دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا  
جنون برق نشتر ہے رگ ابر ہساری کا  
یہ وقت ہے شگفتن گھاسے ناز کا  
صید زدام جتہ ہے اس دام گاہ کا  
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہوتا  
آج رنگ رفتہ دور گردش ساغر ہوا  
خون آوینہ سے رنگیں ہے دستان میرا  
خم رنگ سیاہ از حلقہ ہائے چشم آہو تھا  
رنگ روئے شمع برق خرمن پرواز تھا  
رنگ شب و خدی دود چراغ خانہ تھا  
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا  
یہ زلف یار کا افسانہ تا قیام ہا  
اڑے رنگ گل اور آئینہ دیوار ہو ایسا  
ہے شکست رنگ گل آئینہ پرواز نقاب  
رنگ گل آتش کہ ہے زیر بالی عذاب  
(بقیہ ص ۱۴۲)

خائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی  
بہار رنگ خون گل سے سالن اشک باری کا  
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے  
بزم قدح سے عیش قنارہ رکھ کر رنگ  
لے گئے خاک میں ہم داغ منائے نشاط  
نشہ میں گم کردہ راہ آیا ہست قنہ خو  
عیش بازی کدہ حسرت جاوید رسا  
غم مجنوں غوا داران لیلیٰ کا پریشگر  
رات دن گرم خیال جلوہ جانا نہ تھا  
وصل میں نجات رسانے سنبلستاں گل کیا  
پھر وہ سوئے چن آتا ہے خدا خیر کرے  
شکست رنگ کی لائی سحر شب سبیل  
حرک باغ میں وہ حیرت گلزار ہویدا  
بسکہ شرم عارض رنگیں سے حیرت جلوہ ہے  
ہے بہار ان میں خزاں پر در خیال عذاب

برق نے رنگ و بو کے مضمون کو اس طرح پیش کیا ہے۔

ہنکت زلف سے اسے یہی مہر میں دماغ  
دم عینی ہیں مجھے یاد صبا کے جھونکے

بندہ حاشیہ ص ۱۴۲

حیرت حسن چمن پیرا سے تیرے رنگ گل  
عمر میری ہو گئی صرف بہار حسن یار  
ہر غنچہ تو گل صورت یک قطرہ خون ہے  
مازلطف عشق باوصف توانائی غبت  
گل صبح و لیلی غزل پوری کی پوری رنگ و بو کے محکات کے تحت لکھی گئی ہے لیکن بوسے زیادہ  
رنگ کا محرک غالب ہے رنگ کے ساتھ نخل اور صبح کی تازگی بھی معنی غزل کی حیثیت رکھتی ہے۔  
ہیں رقیب باز ہم درت و گریبان گل و صبح  
جامہ زیبوں کے سدا ہیں دوامان گل و صبح  
بسکہ ہیں بخود و وارفتہ و حیران گل و صبح  
غفلت آرامی یاران پر بین خان گل و صبح  
چو تاپے ورنہ شعلہ رنگ خالہ مند  
شعب و گل تپا کے و پروانہ و بلبل تا چند  
برا انداز خواہے رونق دست خیار آتش  
بسکہ سے وہ قبلہ آئینہ محو احتسار  
بے دم سر و صبا سے گرمی بازار باغ  
خوں کے مری نگاہ میں رنگ لائے گل  
اے وائے نالہ لب خونین لوائے گل  
ہے چمن سدا یا بایدن صدر رنگ دل  
اب طائر پریدہ رنگ حنا کہوں  
(بقیہ دیکھو ص ۱۴۳)

دھوئے عشق بیتاں سے بگلستان گل و صبح  
ساق گل رنگ سے اور آئینہ زانو سے  
وصل آئینہ زخان صحن چمنستان یکسر  
زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد  
موقوف کیجئے یہ بکلف تنگاریاں  
بزم داغ طرب و باغ کشادہ پر رنگ  
ہوئی ہے بسکہ صرف عشق تمکین بہار آتش  
جوں پر طاؤس جو ہر تحتہ عشق رنگ ہے  
آتش رنگ رخ ہر گل کو بخشنے ہے فروغ  
سلوت سے تیرے جلوہ حسن غبور کی  
جو قسا سوچ رنگ کے دھوکے میں مر گیا  
گرچہ ہے یک بیضہ طاؤس آسانگ دل  
معتدل و متصل ہاتھ نہ آیا مگر اسے

لٹا ہے بوئے گل سے نشان بوئے یار کا      نقشہ ہے بوئے گل میں گل بوئے یار کا  
 موج نسیم سے نہ پریشان ہو کیوں دماغ      دیوانہ ہوں میں نہکت گمبوئے یار کا  
 (برق)

بلند حاشیہ ۱۴۴  
 کس جرم سے ہے چشم تجھے نہ قبول      برگ خاک مرثہ خون نشان بنیں  
 اس شعر میں رنگ اور بودوں کے معنوی محرکات کو بڑی خوبی سے سمایا ہے۔  
 نہکت گل کو موج درد کا تشبیہ سے ظاہر کرنا اور رنگ میں گری مٹوس کرنا غائب  
 ہی کا حوتہ ہے۔

سایہ گل داغ و جوش نہکت گل موج درد      رنگ کی گری ہے تاراج چین کی فکر میں  
 خیال سادگی بٹائے تصور نقش حیرت ہے      پر عقاب رنگ رتہ سے کھینچی ہیں تصویریں  
 ضعف سے اسے گریہ کچھ باقی مے تن میں نہیں      رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کو دامن میں نہیں  
 اٹھاوے کب وہ جان شرم تہمت تلخ مٹائی کی      کہ جس کے ہاتھ میں ماند خوں رنگ خاکم ہو  
 رہن خاموشی میں ہے آرائش بزم وصال      ہے پر پرواز رنگ رتہ خوں گفٹ لگو  
 رنگ طرب ہے صورت عہد وفا گرو      تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو  
 عرض بساط انجن رنگ مفت ہے      موج بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو  
 برق آبشار فرشت رنگ دیدہ ہوں      جوں غل شمع ریشہ میں نشود نما گرو  
 قیاب سیر دل ہے سزاخن نگار      یاں لعل ہے بہ آتش رنگ خاک گرو  
 چھانکھ ہے یہ سیلی خارے لالہ رنگ      غافل کو میرے شیشہ پر ملے کا گمان ہے  
 دامن رنگ ہایہ پردہ تدبیر میں ہنوز      یاں شعلہ چراغ ہے برگ حشا بھے  
 میں نے جنوں میں کی جو اسد اتھاس نگ      خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا بھے  
 ہے رنگ لالہ و گل و سرین جدا جدا      ہر رنگ میں بہار کا اشبات چاہئے  
 فرقت آرام غش ہستی ہے بحران عدم      ہے شکست رنگ ایک کمال گردشی پہلو بھے  
 پتھر غابری رنگ کمال طبع نہیں ہے      کہ بہر مد خاکے دل زبان لالی تھیں ہے  
 (بقیہ کچھ وقت صرف)

مٹی سرشت پاک میں یہ کس چین کی ہے پھولوں میں ہر تمام تمہارے بدن کی ہے

رنگ اس شمع کا شمع سے چوڑا پرتا ہے پاؤں جس خاک پر رکھتا ہے خواہتی ہے

بسم اللہ حامیہ ص ۱۴۳

تصور نہر تکیں طعین ہائے طفل دل  
بہ بارغ رنگ ہائے رفتہ گلچین تماشا ہے  
غضب شرم آفرین ہے رنگِ یوی ہائے خود بینی  
سفیدی آئینہ کی پنبہ رد زن نہ ہو جائے  
صبح ناپیدائے کلفت خانہ ادبار میں  
توڑنا ہوتا ہے رنگ یک نفس رطب بچھے  
نشہ ہاشاداب رنگ و ساز ہاست طرب  
شیشہ شے سرو ہنر جو بے رنگ نہ ہے  
تاکجا اے آگہی رنگ تماشا باختر  
یاد رکھئے ناز ہائے القاست اولیں  
چشمِ طعین ہا خون بہائے دیدن ہا  
تماشا ہے کہ ناموس و فارسیوں آئیں ہے  
سودائی خیال ہے طوفانِ رنگ و بو  
چمن زار تماشا ہو کئی صرف خزاں لیکن  
خدا یا خوں ہو رنگ امتیاز اور نالہ موزوں  
صبح دم وہ جلوہ ریز بے نقاب ہو اگر  
شفیٰ بدعوئے عاشق گواہ رنگیں ہے  
کرے ہے بادہ ترے لیے کب رنگِ نفع  
شرم طوفانِ خزاں رنگ طرب گاہ بہار  
بہارِ نالہ اور رنگین فضاں کی ترکیب اور مستعار  
خزائے چھپا دیے ہیں۔

طلوت آخر آئینہ دہی اثر یک سو  
بہارِ نالہ و رنگین فضاں تجھ سے  
درو آئینہ کیفیتِ ندر رنگ ہے یارب  
خیالِ طرب ساء زخمِ جگر آت  
نورِ طالعین کہ شیاں گم کردہ آتی ہے  
تماشا ہے کہ رنگِ نفع پر گردِ دینی جاتے

بڑھ گیا اور جنوں بوجھ ہماری آئی بن کے زنجیر بلا بایہ بہاری آئی

مکن نہیں کہ رنگ جیسے آفتاب کا رنگ بہار عارضِ زیبا کے سامنے

دماغ کے اشعار ہیں :-

کیا صبا کو چہ دلدار سے قویٰ ہے مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بول آتی ہے

غور کیوں نہ ہو جب دل ہی چیز ہائے نگے بشاد دماغ تری زلف مشک بونے کیا

اس کی گلی سے آئے کیوں نہ بخت نہ لہت لائے کیوں

مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

جہاں نے بھی اسی مضمون کے شعر کہے ہیں -

زلف یار کا تصور جنوں شوق کے لئے کس طرح سامان بہار ہیا کرتا ہے -

بعد مدت اسے جنوں تیر ہی بہار آنے کو بھتی ہوش تھے جانے کو بئے زلف یار اینگوشتی

جہاں نے ایک جگہ بوجھِ جذباتی محرک کی حیثیت سے بڑی خوبی سے برتا ہے -

تحلیل فنی کے قائل مکن ہے اس سے جتنی طلب و تکمیل کی توجیہ کریں - لیکن اگر

ایسا ہے تو یہی شعر کی اعلیٰ شریعت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے - وہ کہتا ہے :-

لے امام فزل حاتمیشادی کے اشعار میں بھی بوجھ شریعہ کو جارہا تھا ہے - بخت زلف کے

معلق سامانِ انیب سے سینے -

صبا تو نکلت آن زلف مشکبوداری صبا دگار چائی کہ بونے او داری

زمانہ زہد مشکِ شوق دہر بر باد فدائے تو کو خط و خال مشکبوداری

پہلوئے زلف درختی سے چھٹی آئند صبا پہ غالیہ سائی و گل پر جلوہ گری

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لانی بوئے گل پوچھی بہار میں نہ کسی سے چین کی راہ  
ایکے دوسرے شہر میں گلی نمودارِ عشق میں رنگ و بو کے عرک کو اس طرح  
محسوس کیا ہے۔

کیا چھول ہے جلالِ گل و داغِ عشق بھی کہہ سکی بوئے مست ہوں کہ غش ہوں نگ پر  
دوسری رنگ کہتے ہیں۔

ترے وعدوں نے بدلتے چھوڑ دیے اعتبار کی  
بھی اُدھے وفا چھوڑے، کبھی رنگِ خاک چھوڑے

باد صبا کی بد دماغی کی شکایت ملاحظہ طلب ہے۔  
گئی تھی کہہ کے میں ماتی ہوں لہرِ یار کی، پھری تر باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا

حسرت نے رنگ و بو کے رمزی اور حاضراتی اثرِ ابران و کثیر (اکو جس خوبی سے  
اپنے مانتھانہ کلام میں استعمال کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ رنگ  
دیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا اور خوشبوئے  
دہبری کے استعاروں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمانی قوت ہے جس سے  
حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

حسرت کے ہاں خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو  
عشق شیریں کار کا کرشمہ ہے۔  
خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے یہ رنگس مایع رائے عشق شیریں کار پیدا ہے

لے میر صاحب کو بھی باد صبا کی بد دماغی کی شکایت ہے فرماتے ہیں۔  
لگ نکلی ہے کسو کی ٹگر بکھری زلف سے آنے میں باد صبح کو یاں اک دماغ ہے  
شاید اس زلف سے لگی ہے میر باؤ سے اک دماغ نکلے ہے



۱۳۷  
اب رنگِ دبو کے استعاروں کی رنگا رنگی ملاحظہ کیجئے۔

جاں فزا تھی نسِ قدیرِ یارب ہوائے کوئے دوست  
بس گئی جس سے مشامِ رز و میں بونے دوست  
انچوچی اب ہم گرفتارِاںِ فرقت کو نصیب  
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردہ گیونے دوست

اس پوری غزل میں بونے کے شعری محاورے کی لطیف موجودگی ہے۔  
جس نے سوچھی ہو تری زلفِ سینہ کار کی بونے  
آج تک جس سے مسطر پہ محبت کا مشام  
بے پناہ محبت کے دیتی ہے پیرِ منشا  
ہوئی انگیزِ جتنا ہے لبِ یار کا رنگ  
دلہ ہی سے بھی آری ترے کچھ وزدن  
کیا پسند آئے اسے تافہِ تاتار کی بونے  
آہ کیا چیز تھی وہ پیرِ ہن یا ر کی بونے  
سے رستہ کو ترے ساغرِ شرار کی بونے  
روشنی بخش نظر ہے سے گلزار کی بونے  
دلنوازی میں ترے نامہِ دلدار کی بونے

بحرِ ساقی میں رعالت ہے کہ لبِ بے پردہ  
بونے سے وجہِ غمِ بادہ کشاں بھری ہے

بہرِ زور ہے دلِ حسرتِ زہے نصیب  
اک حسنِ مشکِ فام کے شوقِ تمام کا

آشنا ہو کے بونے یار سے ہم  
سختِ بینرا ہیں قرار سے ہم

میں اُس طرہ زلفِ مشکیں کو حسرت  
پئے غارتِ جان دو تا چاہتا ہوں

گیونے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی  
آہ وہ ہمتِ برباد کہ برباد نہیں

رواق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازین اور بھی شونخ ہو گیا رنگ۔ تے لباس کا

رنگ سونے میں چمکتا ہے طحجاری کا خرقہ عالمیت ترے حسن کی بیداری کا

یاد شہرہ کوئے یار آسنے لگی آرزو کو بوسے یار آسنے لگی  
شوق مخمور ہوئے ہوئے لگا نہمت گیسوئے یار آسنے لگا

ہیرہن کوئی آرا نہ انھوں نے مستتر وہا کہ خوشبوئے محبت ہم آغوش نہ تھا

ہے بونے شوق سے جو معطر مشام بہا ارمان نہیں ہوئے جنان کی شیم کا

خوشبو ترے بوس کی لافنی ہے کہاں ہے تجھ تک نہ ہوا تھا جو گزر باد صبا کا

سو گئی تھی جو ایک بار وہ خوشبوئے گریبا اب تک یہ اسی بونے گریباں کا نشا ہے

کیا کیجے ریاں اس تن نازک کی حقیقت خوشبو میں ہے کل بو تو لطافت میں شائبہ رنگ

پائی ہے جگہ پائی دامن نظم میں خوشبوئے حیا نے تری چادر نے کل کر

ایک بار پس گیا جو کہیں ان کی باسو میں خوشبوئے حسن برسوں رہی اس لباس میں

رفقہ رفتہ مٹ رہی ہے صرصر بیدار سے رنگ ہیں بوسے وفا میں نہکت برباد کے  
خوشبوئے حیا کے علاوہ رنگ حیا کا مضمون اس طحج باندھا ہے۔

غمرہ دل فریب کو اور بھی جانفزا بنا

پیکر ناز حسن پر رنگ حیا زیاد کر (احسرت)

دوسری جگہ یوں کہا ہے۔

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں نہ رہیں  
ان میں چسپکار کی رنگ جاسے کیسا (حسرت)

خوشبوئے دلبری کی ترکیب واسطہ طلب ہے۔

محتاج ہونے عطربند خدا جہد خوب یار خوشبوئے دلبری بھی جو اس پیر میں نہیں تھی

عجوبی ز رنگینی ہیں جزو بدن تیری مہر شاد بخت سے خوشبوئے دین تیری

پیرا میں ان کیسے سادہ رنگین یہ نکسے سے ہر سستہ کھائی

کیا کیا مرئی کو آتی ہے خوشبوئے آئندہ آنکھیں جب اپنی سٹم میں انکی روا ہے ہم

کھول کر ال جو رہتے ہیں شب کو حشر کھڑے ہیں اندھارے میں محبت کیا خوب

تم نے بال اپنے جو چھوڑیں میں بسا کیوں شوق کو اور بھی دیوانہ بنا گیا ہے

بص میں برسے جسم یار کو آج شوق سے پردہ تہا نہ رہے

مشک عنبریں یہ تفریق کے سامان کیاں پیر میں ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

دامن حسن ترا خون شہادت نے مے عطربند شہوت میں بے سار دیکھا

یہی لاتی ہے اڑا کر ترے بلوں کی بو بے خودی ہائے تنہا کی صبا ہے باعث

حسرت بے عیاقی ہے پریشانی دل بچی آئی ہے جو اس گیسو دیر سے بھل کر

تو یہ جہاں کہ ترے گیسو راز کی بو نسیم ہائے جہاں فی کو شہکار کرے

رنگ و بو کے بحر کا نہ تھکا رہی ہر شاہروں کی گزیر یہاں ہوں جیتے ہیں ہر  
یہ شہر بھی کہ اور غرضی ہی خیال کی ہر دنیا نصیب اور نہ اکتا ہوا آقا ہے وہ  
ہوتا ہے کچھ نہ کسی شہر کی کہ آتے سے رہے۔ اپنی ادبیاں کسی پتھر کی تصویر کا کمال ظاہر  
کرتے تھے لئے رنگ و بو کے لہجہ و قرائت کرتے تھے۔ چنانچہ قزوینی نے اپنی فنون  
لفظوں کو اس میں بیان کیا ہے وہ آواز کی قریبہ ان نادر کائناتوں کے ہر  
طرح بیان کرتا ہے۔

نہ کہ شہر ایران نہاد تہہ و بالا سیاہی ہواں گونہ یارنگہ و بزم  
نہ گنہ ادا فی اور رنگین یہانی و غیرہ کی ترکیبیں بھی اردو میں فارسی سے آئیں۔  
ان کے علاوہ رنگ و بو کے ساتھ اور دوسرے لہجہ و قرائت کے اردو میں استعمال  
ہونے لگے۔ لیکن سب میں خوبی اور کمال کا یہ ملو موجود رہا۔

شیخ سقہی نے بو کے شعری حوالہ کو انصافی غرض کے لئے اپنی اس  
تہذیب کا سہارا میں استعمال کیا ہے جو قیاسی ڈیگری کے اندر میں نہیں  
دست محبوب سے جو خوشبو دار مٹی ملی اور اس نے ان سے جو گفتگو کی وہ  
ان لفظوں میں تھی حمد بلاغت کی جان ہیں۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے فتا و از دست مجوبے بہ دستم  
چو و گفتم کہ مشکلی یا عیری کہ از بوئے دل آویزے تو مستم  
بگفتا من اگلے ناچینہ بودم ولیکن مدتے با گل شستم

جمال ہنشیں درمن اثر کرد وگر نہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

۔ رنگہ دیوئے شعری حرکات کی مثالیں سعدی، حافظ اور درویش  
استاذہ کے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن غالباً اتنی کثرت سے نہیں جتنی اردو میں ملتا ہے۔  
مکمل ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ایران کے مقابلے میں ہندوستان گرم ملک ہے  
یہاں کے باشندوں کو ان حرکات کا احساس جتنی شدت سے ہوتا ہے وہ نسبتاً  
نفسانہ شکوے کے لوگوں کو نہیں ہوتا۔ لیکن اس احساس کی شدت کے لئے  
صرف گرم آب و ہوا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ شعری ذوق و امتیاز کی مصلحت  
بھی ضروری ہے جو ہندوستان میں اہل ہند کی خصوصیت رہی ہے۔ سنسکرت اور  
ہندی شاعری میں اور سندھوستان کے ان شاعروں کے ذہن جنہوں نے فارسی میں  
شہر کیا اس کی شاعری کثرت سے ملتی ہیں۔ غنی کشمیر نے تو کہا ہے کہ محبوب کا رباب  
خاموشی فکر نکلیں گے لئے محرک ہوتا ہے۔

جوہ حسن تو آوید مرا بر سر نکر تو خا بستی دن معنی رنگین ہستم  
اردو کے شاعروں کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

ہم بے دوست تجھ کو گھٹائیں شیفہ محوشیم طرہ بندہ قشاں نہ ہم  
(شیفہ)

بے گل نہ ہی ہے تو یار کی بیکہ بدلے اس تری چھیر کو ہم باد صبا جانتے ہیں  
(مخروج)

کیا چین میں ہے گئی بوئے گریباں اسکی  
آج بچھو کوئی کھلتا جو گلستان میں نہیں (مخروج)

لا کے اس کی شمیم عطر آگئیں مجھ کو ترپا دیا صبا تو نے  
(مخروج)

وہ نو نہال خوبی نازک ہے دل ربا ہے عالم ہے اس کی بوس گلی کی خمیم کا سا  
(زخمی ہوئی)

کاکل جان فزاک بوسونگھ چکی ہے لے صبا کچھ تو سمجھ کے نوکر کر معبر و مشک و عود کا  
(شاہ عظیم آبادی)

طرہ گیسوے جانان باتری بھت کی قسم میں نے دیکھا تھا مگر مشک ختن یا وہ نہیں  
(ہم قہ لکھنوی)

جذب شبیم زلف ہے داند و ام سے سوا سینکڑوں دل کھینچ آئے ہیں گیسوے شکبار میں  
(ام قاتب لکھنوی)

مرے لہو سے اگر جو کے سرخرو آئے ملو تو برگ حایں وفا کی بو آئے  
(ام قاتب لکھنوی)

اوپر کے شعر میں خیال اکل اچھوتا ہے کہ خا سے بچا ہے رنگ وفا کے بو سے وفا پیدا ہوگی  
معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک بو متبادل رنگ زیادہ قوی حرکت شعری ہے مثلاً عروکہ  
اشا بھی لطف سے خالی نہیں کہ عوا میں رنگ ہی نہیں ہوتا بلکہ بو بھی ہوتی ہے جس کی پھولوں میں روح  
سستی اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ زحمت تو بھول کی ہے مگر وفا کی ہے جلیل

دل ہے عجیب گل چمن روزگار میں دل ہے عجیب گل چمن روزگار میں  
محب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے کھلی کلی سے سمجھ بٹے یار آتی ہے  
(جلیل)

سرنے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف شکوہ کیا کیا عار ہا ہوں نسیم حسد کو میں  
(جلیل)

چمن کے بھول بھی تھے ہی خوشی میں نکلے کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بوتیری  
(جلیل)

مرزا لگانہ کے اس شعر میں رنگ تماشا اور بو سے تنہا کی ترکیبیں ایسا ہی تازگی  
سے لبریز ہیں۔

جہاں ہیں نظر والے، بیتاب ہیں دل والے  
کچھ رنگ تماشا سے، کچھ بوئے منت سے

یگانہ کے اور شہر ملاحظہ ہوں :-

حریم ناز میں کبتاک گھٹے ٹکی بوئے پیر میں ہوائے شوق میں لازم ہے اک نون شہر نگا

یا آئی بوئے پیر میں بار تاسیحا پینا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

بوئے یوسف خود دلیل منزل مقصود ہے جذب صادق غائبانہ رونما ہو جائیگا

بیچ تکنت آوارہ کن نازک دماغوں میں مبارک ہستی برباد پر مفرد ہو جانا

کیوں تکنت آوارہ جاسے سے نہ ہو باہر کس دن کو وفا کرتی پیرا میں رسوا سے

جگو کے کلام میں رنگ و بو کے محرکات ملاحظہ ہوں

ہائے یہ حزن تصور کا فریب رنگ و بو میں یہ سمجھا جیسے دو جان بہار آ ہی گیا

جا بھی اے ناصح نادان نہ کر اس کو بنام ان جفاؤں سے تو خوشبرے وفا آتی ہے

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں

قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں جاں رنگیں وہ سرے پانچ تمام رنگیں

تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

اصغر کے اشعار ملاحظہ ہوں :

لے دل شوق و حیکہ جو زیرِ نگین رنگ و بو      طائرِ قدس کو بھی لے دام گرجا میں

فریبِ دام گہ رنگ و بو مسافرِ اشد      یہ اہتمام ہے اور ایک شت پر کے لئے

تھی بوسے دوست کو چہ قہم بحر کے لہجہ      یہ اور ہے انری مرحے مشیتِ غبار کو

موجِ نسیم صبح کے قربان جا سیئے      آئی ہے بوسے زلفِ مہنر نے ہوئے

جلوئے رنگین تر آیا تنکا و شوق میں      ہم لطافتِ جسم کی نہ سیم تن و کھانکے

مٹی جاتی تھی بلبلِ جلوئے گہا ہے رنگین پر      چھپا کر کس نے ان پردوں میں قاشیاں کھدی

شعرِ غزل میں حسنِ ادا کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسنِ ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ ”نجاتِ سخن“ میں جمع کے استعمال کو محاسنِ سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲)۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے ؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور ابہامی کیفیت ضروری ہے۔ صیغہ واحد کے استعمال سے تفہیم اور یقین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفسِ واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور ایمائی اثر ہوتا ہے صیغہ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجئے۔۔۔ جمع کے حسن



استعمال نے ان کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔  
 غمخواریوں سے یاریاں نہ تھیں  
 دل کی بے اختیاریاں نہ تھیں  
 عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا  
 شوق کی بے قراریاں نہ تھیں  
 تھے جو ہر رنگ ناز ان کے ستم  
 دل کی امید داریاں نہ تھیں  
 حسن جہاں تک رہا لطف رہا خوش  
 صبر کی ستمساریاں نہ تھیں

جنم پہ بھی مثل غیر میں کیوں مہربانیاں  
 اے بد بختان یہ خوب نہیں بد گانیاں  
 ہر رشتہ چھوڑ دیا، نگار زبان خون ہنر  
 اپنی ہیں شوقیہ کی نسبت تک نشانیاں

خاک و شیریں کو رہا شوقیہ پا سگئے  
 گم ہونے سے سرخسٹال کی جہات نہ ہو سکی

نہ سہ سے چشم یار کی فوجی کہ جو و بخود  
 رنگینوں میں ڈوب گیا ہر بن تمام  
 فشو و نمائے سبز و گل سے بہا میں  
 شاد ادیبوں نے پھیر لیا ہے چمن مقام

میرزا بہرہ یار شوقیہ جہات از کیس کی  
 میرا شوقیہ تمام ظالم خیال امتحان تک ہے

رنگینوں کی جان ہے وہ بائے نازین  
 اپنی نگاہ شوق جہاں سر کے بل گئی

۴۔ جمع کا حسن استعمال ہر دور کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ قدما میں خاص طور پر

میر صاحب کے کلام میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

جب تک ملے جلے سی جفائیں تھیں اٹھ سکیں

کرنے لگے ہوا تو ستم گاریاں بہت

یہ بے قراریاں دیکھو ان نے دیکھا جان کا میاں ہماری بہت سہل جانیاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہ ہمیں کھینچیں تیرے تجھ سے ہی یہ خواریاں

کھینچتا ہے دل کو صدمہ اچکھ ہے مزا جوں میں اپنے سوز اچکھ

جھانپیں دیکھ لیا ہے وفا میاں دیکھیں بھٹکا ہوا تری سب باتیاں دیکھیں

یار اودھدوں کی راتیں آئیاں ظالموں نے بیچ کر دکھائیاں  
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر آسودہ دور پہ پہنچا میں مری رسوائیاں

دیکھیں تو تیری کہ باکس پہنچا تو ایسا کیا اب ہم نے بھی کس سے انھیں لیاں

مومن کے اشار ملا خطہ ہر لہ

لکھ نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہسم

کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم

ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گنہ رشک

جہراں ہیں آپ اپنی پیشانیوں میں ہم

مارے خوشی کے مر گئے صبح شب قصداں

کتنے بک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

نسیم دہلوی کا شعر ہے :-

نسیم غفلت کی چل رہی ہے اندر ہی ہیں قضائے نیندیں  
کچھ ایسے سوتے ہیں سوتے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

ڈارغ کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

خفا ہوتے ہو کیوں عہد وفا کے ذکر پر پرج ہے

نہ تم وعدہ خلائقوں میں نہ ہم بے اعتباروں میں

سرخوردہ کو تسکین دہیں ہوتی ہے مجھ پہ احسان ہے اس کوچے کی دیواروں کا  
دوش پہ اپنے جو صیاد نے زلفیں چھڑیں اور جی پھوٹا گیا آج گرفتاروں کا

جگر کے شعر ملاحظہ ہوں جن میں جمع کے استعمال سے کلام کا حسن دو بالا ہو گیا :-  
دل میں باقی نہیں وہ جو شر جنوں کی نہ دامنوں کی نہ کمی ہے زگریباؤں کی

میں نے جیسے دم سے عشق کی جھلکی گردن بختوانے کو مجھے میری خطائیں آئیں

اللہ اللہ اعتبار است نظر اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں  
اس نگاہ ناز ہی سے پوچھئے اک اسیر شوق کی صیادیاں

نقل قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز و ابہام پیدا  
کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ نشریں اس کے بالکل خلاف ہے۔ نشر میں نقل  
کامل مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ غزل میں  
اس سے رمز کی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ اور شعر کی بے تکلفی اور  
تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کے کلام سے یہاں چند نمائیں پیش کی  
جاتی ہیں :-

ایک ہر مان قافہ سے کہہ دے صبا اے ہی گر قدم ہیں تہائے توہم ہے  
(سودا)

کہتے تو ہو "یوں کہتے" یوں کہتے جو وہ آتا

کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہسا جاتا

(میر)

دل چاہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چنے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے

(میر)

ٹھیرے ہیں ہم تو مجرم نکبہ یار کر کے تم کو تم سے بڑا کوئی بد پیشہ تم کو یوں بھی پیار ہے

(میر)

کیسے صبا کہ جس کو تو بھلا گیا تھا سحر جگر نقش پا پڑا تری دیکھے ہے راہ وہ

(میر حسن دہلوی)

جب میں چلتا ہوں تم سے کو... سے کر کے بھی دل مجھے پھر کے کہتا ہے "ادھر کو چلیے"

(میر حسن دہلوی)

پہنا جو میں نے جامہ دریاگی تو عشق بولا کہ "بدن پہ ترے سج گیا ناس"

(مصحفی)

بڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری وہ منہ کو پھر کے کہتا ہے "اف پناہ تیری"

(جرات)

کہے گر کوئی اس سے ملے کہ جرات تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے

تو کہتا ہے وہ از رہ وطن ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے

(جرات)

جتاؤں در و محبت تو کس اداسے کہے مکر وہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی

(جرات)

اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا "جادو برحق ہے کرنے والا کافر"

(جرات)

اسد بیل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے عقو شق ناز گر خون دو عالم میری گردن پر

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں  
(غالب)

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں“  
کس رعوت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں؟  
(غالب)

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تھی“ سن کے تم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ اول  
(غالب)

”مجھ کے رستے ہیں بازار میں وہ پرش حال کہ یہ کہے کہ ”سر رکھ رہے کیا کہیے“  
(غالب)

رشک کہتا ہے کہ ”اس کا غیر سے اخلاص“ عقل کہتی ہے کہ ”وہ بے ہر کس کا آشنا“  
(غالب)

نہ کہیو طعن سے چہرہ کہ ہم سنگد ہیں“ مجھے لو خوب ہے کہ جو کچھ کہو ”بجا“ کہئے  
(غالب)

ہنس کے بولے سوال بوسہ پر ”ایسی باتوں کا یاں جواب نہیں“  
(مجدد ح)

نقش پائے رفتگاں سے آ رہی ہے صدا ”دو قدم میں اٹھ پڑے شوق منزل چاہئے“  
(آتش)

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی شور بلبل نے کیا ”باد بہاری آئی“  
(ناسخ)

اٹھتے ہی تیری بزم سے اٹھا یہ غفلت ”بہتوں کا دل کشاکش محفل میں رہ گیا“  
(عینی)

”میرا اس ناز سے ظالم نے دیکھا“ نگاہیں بول اٹھیں ”وہ لے لیا دل“  
(امیر میاں)

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی "مائے کیسی اس بھری مجلس میں رسوائی ہوئی"  
(اتیر ضیائی)

مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے ناؤں سے "رہے خیال ہماری بھی نارسانی سکا"  
(اتیر ضیائی)

یہ کہتی ہیں ہم سے جنائیں تمہاری "نہیں باز آتیں وفا میں تمہاری"  
(جبال)

نگاہ شوق بہت اضطراب خوب نہیں "بہر، وہ آپ ہی پردہ اٹھائے دیتے ہیں"  
(جبال)

کہاں کہاں دل شاق دیدنے یہ کہا "وہ چمکی برق تجلی وہ کوہ طور آیا"  
(داغ)

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا "دیکھ پھٹکے گا خاموش یہ دستور نہیں"  
(داغ)

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں "اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر بچاؤ آتا ہے"  
(داغ)

یہ کیا کہا کہ "تیری بلا بھی نہ آئے گی" کیا تم نہ آؤ گے تو فضا بھی نہ آئے گی  
(داغ)

نگاہِ ناز یہ کہتی ہے تیرا لگن کی "کہ تیں ہوں دل کیلئے تیرے گلے کیلئے"  
(جلیل)

نقاب کہتی ہے "میں پردہِ قیمت ہوں اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے"  
(جلیل)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں "وہ قدم کو چسُ رسوائی ہے"  
(جلیل)

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں "وہ تو سبکی ہوئی خود بھرتی ہے رسمِ ہم ہیں"  
(شاہِ عظیم آبادی)

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموشی کھڑا ہوں ساحل پر  
 دریا مے محبت کہتا ہے ”آکچھ بھی نہیں پایا میں ہم“  
 مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے  
 ”آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم“  
 (شادِ عظیم آبادی)

”محبت کیوں کرو گر پو نہیں سکتی وفا مجھ سے  
 یہ تم نے کیا کہا مجھ سے یہ تم نے کیا کیا مجھ سے  
 (حسرت)

”دیکھ نہ ہیں کوئی محبت کی نظر سے“ کیا خوب یہ اندازِ حکم ہے تمہارا  
 وہ اب یہ چھیرے کہتے ہیں ”میں غم نے تجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے“  
 (حسرت)

”حالِ دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں اب کبھی ہم کو خبر کیا تھی“ نہ کہنا دیکھو!  
 (حسرت)

”دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا شکل ہم نے یہ ان کے نفاق کو نہ رکھا ہے  
 (حسرت)

”عشاق کی جانب سے تعاضے و تقاریر کہتے ہیں وہ جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا“  
 (حسرت)

”کوئی شکوہ سنج ستم اور ہوں گے وہ کہتے ہیں حسرت ہمارا نہ ہو گا“  
 (حسرت)

”یہ کہہ کر دیا اس نے دردِ محبت جہاں ہم رہیں گے یہ سامان ہو گا“  
 (جگر)

”کہتی ہے یہ اب دستِ دیوانگی شوق“ منزل بھی جو آجائے تو منزل نہ سمجھنا“  
 (جگر)

اس تبسم کے لصدق اس تجاہل کے نثار

خود گنجی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے

(جگر)

بزم سے یا چشم تراٹھ گئے کہتے ہوئے ”ہم سے تری داستان اب سنی جائیگی

(جگر)

آ رہی ہے یہ صداکان میں دیرانوں سے نکل کی کج بات کہ آبار تھے ویوانوں سے

(مرزا گانہ)

ردم کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کئی ”ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

(مرزا گانہ)

شاعر بعض اوقات غیر ذی روح اشیاء اور مجرد کیفیات کو ذی روح فرض کر لیتا ہے یا ان میں ایک طرح کا تشخص پیدا کر دیتا ہے۔ بادی النظر میں تشخص سے ایک طرح کا تعین لازم آتا ہے لیکن غزل گو شاعر کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے جس طرح نقل قول کے ذریعے بظاہر مطالب میں تعین پیدا ہونا چاہیے۔ لیکن غزل میں اس کا الٹ اثر ہوتا ہے اسی طرح تشخص سے بھی رمزی اثر بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے اکثر اوقات اس قسم کا تشخص ندرت استعارہ کا کرشمہ ہوتا ہے۔ مجرد کیفیات کے تشخص کی مثالیں قدمائے کلام میں نہیں ملتی یا اگر ملتی ہیں تو شاید دو تادر۔ غالب نے اس اسلوب کو برتا ہے۔ خاص طور پر جدید زمانے کے غزل کے استادوں کے یہاں اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں۔ غالب کے کلام میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے یاقینت کنارہ کراے انتظام چل سیلاب گر یہ در پئے دیوار و در ہے آج

پھر نکالے کس لے گوش محبت میں لے خدا افسون انتظار متا کہیں جسے



شوق کو یہ بت کہ ہر دم نہ کھینچے جائے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرائے ہے

ہے کہاں تما کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پایا یا

دعا جو تما شائے شکست دل ہے آئینہ خانہ میں کئی لئے جاتا رہے مجھے

یعنی بابو سیوں کی وجہ سے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور آئینہ خانہ کی مسورت

پیدا ہو گئی۔ اب یہ عا اس آئینہ خانہ کا تما شا دیکھنے میں مصروف ہے۔ بد فاکا

تما شا دیکھنا خاص لعف رکھتا ہے۔ شاعر نے مجرہ کیفیت کو بھی خوبی سے شخص

عیا کر دیا ہے۔

قالب کے دو شعر اور ملا خطہ کیجئے اور وارز کیجئے۔

سے سنے کیا ہے حن خود آرا کو یہ حجاب اے شوق یاں اجازت تسمیم و ہوش ہے

ویدار بادہ جو صمد ساقی، نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خرد و خلس ہے

اس آخری شعر میں شاعر نے اپنے قصورات کی دنیا کو ایک میکدہ فرض کیا ہے

جس میں شربت ویدار شراب کا حکم رکھتا ہے، جو صمد کے دئے ساقی گری ہے اور نگاہ

میخواری میں مست ہے۔ اب سب کیفیات کے شخص نے کام میں عجیب لطف

پیدا کر دیا ہے۔

دوسرے غزل کو اسقذہ کے کلام میں سے چند قبائلیں رخیہ طلب ہیں

روہ سادگی سے بقا فہل کو ناز کہتے ہیں

مگر سکھائی ہے شوخی کہ دستبان کیے

تم آوجیب ہوا تو سن ناز قیامت ہم کا بے آگے

ریتخ قاتل پہ ادلوٹ گئی رقص لیل پہ قضاوٹ گئی

واع (اور بیان)

اچھا ہوا کہ شرم و شرات میں چل گئی

(افانی)

دل کی ہنسیں چھپ گئیں اور جاؤ گزریں

(افانی)

تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

(افانی)

رنگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لے گئی

(اصغرا)

جب بجاہ شوق تڑپی پردہ عمل دتھا

(اصغرا)

تھرا رہا ہے شعلہ عریان آرزو

(اصغرا)

ایسا حجاب چشم تاباں کہیں جسے

(اصغرا)

ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے

(حسرت)

طرف عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

(حسرت)

اس قدر اہتمام شرم و حجاب

(حسرت)

مل کے رویا خوب ابرو بہار ابکی برس

(حسرت)

آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے

(حسرت)

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب

یاس جب بھائی، سیدی، ہاتھ مل کر رہ گئیں

مگر ضرور تیں حال بے خودی معلوم

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں

عشق کی بیتابیوں پر حسن کو رحم آگیا

اب طور پر وہ برق تجلی نہیں رہی

اس جلوہ گاہ حسن میں پھایا ہے ہر طرف

دل سے ارباب وفا کا ہے بھلا نکل

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرہ داری کا

عشق سے کہاں روا ہے حسن

فرقت ساقی میں ہم حسرت کشان بارہ سے

ہم بزم سے آرزو نہ گئی محبت

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی      رمز وے گئی حسن کی بے مشوری

(استغفر اللہ)

تری محفل سے جم گئے گوربا حال زار گئے      تماشا کا سیاب آئی تما بے قرار آئی  
یہ کیا اندھیر ہے لے دشمن اہل وفا تجھ سے      ہوس نے کام جان پایا محبت سے سار آئی

(حسرت)

ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں      کہیں ہم نہ رہ جائیں مفسد و ر ہوا

(آجگر)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں تھی      ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہ نقاب ان کا

(جگر)

فراق حسن و تکلیف تجھی لے موا داندہ      بس اب رسوا نہ کرے بخود شی قی پشانی

(جگر)

کنایہ بھی کنایہ اور استعارہ کی طرح رمز و ایما کو نکھالتی ہے۔ اس میں بھی  
کنایہ کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ  
اقتضا ہے کہ تعقید نہ پیدا ہو۔ کنایہ کی طرح طبع بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی  
بلکہ سامع اس کے ایما کی اثر کی تازگی کا متوقع رہتا ہے۔ مثلاً

بے ستون کیا ہے کوہ کن کیسا      عشق کی زور آزمائی ہے  
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر      کیا دوانے نے موت پائی ہے

(میر)

اے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد      نہ ہی دشت میں خالی مرا جا میرے بعد

(میر)

میں نے مجنوں پر ترکین میں اسد      سنگ اٹھایا تھا کہ سسریا د آیا

(غالب)

عشق و رمز دوری عشرت کا بخیر کیا خوب      ہم کو تسلیم نہ کرنا مئی فساد نہیں

(غالب)

غزل میں بعض اوقات استفہام سے بھی حسن کلام پیدا کیا جاتا ہے  
 استفہام بالعموم اشیائے محلوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے جو جملوں کے  
 سفایے میں ڈیا اور لطافت اور بناغت رکھتے ہیں۔ استفہام میں منہم وضاحت  
 کے لئے مخاطب سے کچھ دریافت کرتا ہے لیکن غزل میں اس کے ذریعہ شعر کے  
 مزاج اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرح کا جمال عارفانہ برتن ہے۔ حقیقت  
 وہ استفہام سے کبھی اپنے اندر رونی پتھر کو ظاہر کرتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ  
 اپنے پتھر کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو نمایاں کرتا ہے۔ استفہامی شعروں کی  
 مثالیں بڑے شاعر کے ہنر کی ملتی ہیں۔ یہاں چند مثالوں پر گفتا گیا جاتا ہے  
 یہ صاحب کے دیوان میں کثرت سے اس قسم کے اشعار ہیں اور بعض غزلیں پوری  
 کی پوری استفہامی رنگ میں ہیں۔ فرماتے ہیں۔

نہ پتا نقش پئے نادر چا جاتا ہے آں محبوں بیاباں میں وہ سیلی کا کد برعل ہے کیا جانے؟

شیون میں شب کے ڈوئی زنجیر میر صاحب اب کیا مرے جنون کی تدبیر میر صاحب؟

ہے اس سے سے یار و اجڑی داس میر تک اقلیم عاشقی میں آبا و مگر کہاں ہے؟  
 جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے سیکدہ کو پھر خیر جمعہ کی شب دودو پہر کہاں ہے؟

ہے عرصہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا کس سے یہ ستم ورنہ اسے تیرا ہوا جو؟  
 فاقب کے یہاں بھی متعدد غزلیں استفہامی انداز میں ہیں۔ مثلاً۔  
 دوست غمخواری میں میری سی فرمائیں گے کیا  
 زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

دونوں جہاں سے کے وہ سمجھے یہ خوش ہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تھوڑا کیا کریں؟

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بست کوں کس تدرخانہ آئینہ ہے ویران مجھ سے؟

آئینہ کیوں نہ روں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاکوں کہ تجھ سا کہیں مجھ سے؟

بیکھری جنون ہے سر پٹنے کا شعل جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو تو کیا ہے؟ نہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

کہہ دو حال تو کہتے ہو مدعا کیسے نہیں کہہ دو کہ جو نظم یوں کہہ تو کیا کیجیے؟  
نذر سے مشہور شاعروں کے کلام سے چند مثالیں لائے گئے ہیں۔

گر مہیاں پھنکار کر دیو اسے نے نہ بکیر کیوں پر ہنسی کرے کیا نقل دخل اس میں جنون کا کارخانہ ہے؟

(آتش)

کون وہ دل ہے جو مویخ جاناں نہ ہوا کون ذی ثنہ ہے جو دیدہ حیدر ایں نہ ہوا؟

(ناتواغ)

نستا ہی نہیں وہ بت گمراہ کسی کی ایسا نہ ہو سن لے کہیں اند کسی کی؟

(رند)

زند کے اس شعر میں نقل قول اور استفہام دونوں خوبیاں موجود ہیں۔  
دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی ماہ بزاری کیا اب کی برس چاک گریبان نہ کریں گے؟

(رند)

داغ نے اس شعر میں بھی نقل قول اور استفہام دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

مینا نے کے قریب حتیٰ مسجد چلے کو داغ ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟  
مخدوم بھر آیا سو میخانہ سے واعظ رندان قیچ خوار کی ہت کو چھلیا (مالی ہوی)

انس ہے غارِ صیاد سے گلشنِ کیسا؟ ناز۔ پروردِ قفسِ ہوں میں نشہ کیسا؟  
(نشتہ)

حسرت کے یہاں بھی استغناء کی اشعار کثرت سے موجود ہیں اور بعض غزلیں پوری کی پوری اس رنگ میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کبھی کی تھی جواب دوا یہ کھٹکے گا؟ مجھے لڑچھ کر آپ کیا یہ کھٹکے گا؟

حالِ مجبوری دل کی نغراں بھیری ہے دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے؟

سب سے شوخی ہے اک ہم سے حیا اے فریبِ نگاہ یار یہ کیسا؟

حسرت کے اس شعر میں نقلِ قول اور استغناء دونوں ہیں۔  
محبت کیوں کرو گز بونہیں سکتی وفا مجھ سے یہ تم نے کیا کہا مجھ کو یہ تم نے کیا کیا مجھ سے

ان دونوں شعروں میں استغناء سے تاثر کہاں سے کہاں پہنچ گئی  
ویسے کہنے کو معاملہ کے شعر ہیں

سرگرم نازِ آپ کی شانِ جفا ہے کیا؟ باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا؟

نظر پھرنے کی اس پیدلِ حس کا پھینا محبت کا یہ بھی بہت کوئی قرینہ؟

جگر کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں :-  
محبت کیا ہے؟ تاثرِ محبت کس کو کہتے ہیں؟ ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہم اور کہاں بفسائے غم عشق؟ وہ اسوقت نہ رستے تو کچھ بیان ہوتا

اس ایک دل کی حقیقت کو کوئی کیا جانے؟ جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

کیا غصہ نہ کرے دل پہ اثر ہے کو نہیں میں پرستار محبت ہوں خبر ہے کو نہیں؟

وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھائے؟ احسان ہے اس کا جو مجھے مجھ سے ملا دے

جگر کی بعض پوری غزلیں استغنا میہ انداز میں ہیں مثلاً۔  
عشق کی یہ غلو تو پیہم کیا؟ ہو نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟

سن تو اے دل یہ برہمی کیا ہے آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟

یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ مکی کی ہے؟ بہک نہ جائے جو پی کر وہ رنہ ہی کیا؟

بنگاہ شوق جگر و تنف چار سو کیا ہے؟ جو دل حسین ہو تو دنیاے رنگ دبو کیا ہے؟

دل چھایا بُرا ہے کیا کہیے؟ آپ کا نقشِ پا ہے کیا کہیے؟

اسی طرح غزل کے یہاں بھی استغنا میہ غزلیں ملتی ہیں اور منفرد اشعار  
تو بے شمار ہیں مثلاً

واہے ی یہ عشق پیہم کیا؟ یاس و امید شادی و غم کیا؟

اس نورِ مجسم کے افسانے کو کیا کہیے؟<sup>۱۰</sup> ہے شمع بھی پروانہ پروانے کو کیا کہیے؟

لفظوں کی ٹکڑیوں بالعموم نثر اور شعر دونوں میں مصحوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور اسٹ پھیر ایک خاص سیاق سے کی جائے اور وہ رمز ہی اور ایمانی احساس کو بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہو گا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

قطرہ قطرہ آئینو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے  
پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ تو وہ حسرت ہے  
(ذوق)

رہے اس شوخ سے آرزو ہم چندے تکلف سے  
تکلف برطرف تھا ایک انداز بنوں وہ بھی  
(غالب)

لاکھوں لگاؤ ایک چسپاں نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں  
(غالب)

کس تجا بل سے وہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو  
قمرے کو چہ ( ) تم گار قمرے کو چہ میں  
(سفیہ)

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے  
نہیں ہے وعدہ میں ان گلوں کے وفا کی بواہیتا زکارنگ

(جلال لکھنوی)  
بھلا بھلا کے جتا ہے ان کو راز نہا  
چھا چھا کے محبت کو آشکار کیا  
(داغ)

ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کہا نا دل یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، یہ تو اشرکچہ بھی نہیں  
(داغ)



بٹھ گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے  
(د آغ)

دعا سے کچھ نہ ہوا النہا سے کچھ نہ ہوا بتوں کے عشق میں یا خدا سے کچھ نہ ہوا  
پتھر کی تو تھی نگر اپنے اثر کو لانا نہ سکی گئی تو تھی نگر آؤ رسا سے کچھ نہ ہوا  
(مضطر)

کہاں نگہوں کے وہ تھے وہ لالہ زار کہاں بہار میں تو نظر لگ گئی بہار کہاں  
(شا و غنیم آبادی)

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے جو موج ڈبو دے ساحل ہے یور نام کا ساحل کوئی نہیں  
(فانی)

حکم و حشمت ہے کہ زنداں کو بھی صحرایانہ دل وہ آزاد کہ صحرایہ کو بھی زنداں سمجھے  
(فانی)

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف ننگراں اٹھا  
(حسرت)

جب بے کے گئی ہے ہیں تاکوئے ملا مجبوری دل خاک بسرے کے گئی ہے  
(حسرت)

اے وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے  
(حسرت)

تازگی بیان اور ندرت مضمون کا بعض دفعہ یہ اقتضا ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو غیر مذکور رکھا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ  
سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کرے مثلاً

موتے دلبر سے مشکبو ہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا  
(میر)

اس نقش پاکے سجدے نے کیا کیا ذلیل میں کو چڑ رقیب میں بھی سر کے جلی گیا  
(مومن)

ڈرتا ہوں آسمان سے بھلی نہ گر پڑے حیا کی نگاہ سوئے آشاں نہیں  
(مومن)

شکوہ ہے غیر کی کد درست کا سو میرے قاتل کے میں طائے کو  
(مومن)

سلطنت دہست بدست گئی ہے جامائے خاتم جمشید نہیں  
(غالب)

کیوں رد و قدح کرے ہے زاہد مٹے ہے یہ نگہ کی قے نہیں ہے  
(غالب)

ہم بھی اسید وصل سے خوش ہیں ہے زمانے کو انقلاب بہت  
(مخرج)

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بھلی بھی دیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشینے  
(غالی)

بعض اوقات حذف کرنے کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر

حاصل ہوتا ہے اس لئے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً

غالب کو یہ کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں فلک کے ظلم دیکھ کر معاً معشوق یاد آتا ہے اس مضمون کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں۔

فلک کو دیکھو کسے مگرتا ہوں اس کو یاد اسد  
جفا میں اس کی ہے انداز کا رنہ رما کا

اسی مضمون کا صبا لکھنوی کا شعر ہے جو کسی طرح غالب کے شعر سے کم نہیں۔

پرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں  
 کوئی مشوق ہے اس پردہ زنگاری میں  
 جو صبح نے بھی اسی مضمون کو دیدے سادے طور پر ادا کیا ہے جو لطف سے  
 خالی نہیں۔

ملتی ہے اس کی وضع زبیں غمے یار میں  
 آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں  
 مومن خاں جذبہ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے  
 سرگوشیاں نہ کھجے بلکہ میری طرف التفات فرمائیے۔ لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے  
 کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجئے۔ حالانکہ ان کا مدعا اس  
 کے بالکل عکس ہے۔

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ  
 آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں  
 مقصد صرف اپنے گریبان کے چاک کی دست بتانا ہے لیکن اس ضمن  
 میں دست جنون کے صدقے جاتے ہیں اور یہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔  
 دست جنون کے جائے صدقے کہ چین سے  
 پھیلائے پاؤں ہم تے گریباں کے چاک میں

رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر قبض وقت ایسا انداز بنا  
 اختیار کرتا ہے جس سے سامع کا ذہن کبھی حکم سے کثرت کی طرف کبھی غنیت  
 سے حکم کی طرف کبھی خطاب سے حکم کی طرف اور کبھی خطاب سے غنیت کی طرف  
 خوب خود منتقل ہوتا ہے۔ کبھی مفرد اور جمع کے صیغے ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں۔  
 دراصل یہ سب رمزی طبع کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ شریں  
 یہ سب باتیں عیب ہیں لہذا غزل میں انھیں حسن ادا کی سند حاصل ہے۔ چند  
 مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اب کے جو تیرے کوچے جاؤں گا تو سنو پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

(میسر)

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا صنعت کرے

(ذوق)

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچنی ہی اپنے درگی درباری مجھے

(غالب)

عجیب اٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے

کبھی بات کی جو سیدھی تو بلا جواب اٹا

(انشار)

ترے در سے اب ہم سفر کر چلے جو تم کہ اب ہسم گزر کر چلے

(میر سوز)

فصل بہار آئی پیو مونس شراب بس بوچی ناز مصلی اٹھاپئے

(آتش)

پھنس گئے تم نہ سنی حضرت دل بات میری بندگی آپ کو اے قبیلہ حاجات مری

(امیر)

ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے

(داغ)

تخیل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی کے ساتھ وابستہ کو تیلے تاکہ

ابہام و رمز پیدا ہو۔ مثلاً یوں ہی گرد و تار ہا غالب ہے اہل جہاں دیکھنا ان سبکیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

مجھ گہنگار کو جو بخشش دیا تو نے

(داغ)

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولفہ حسرت سہانی نے "نکات سخن" (ص ۹۸) میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد منشی امیر لہندہ تسلیم لکھنوی کو ابتدائی منشی کے زمانے میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ملنے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں کیا آپ کی نگہ سے میں آتش نہیں  
منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرع بدل کر یوں کر دیا  
ملنے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں

اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اگرچہ حسرت کا خیال ہے کہ تم آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابل اعتراض ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کے استاد کا مسلک غزل کی تکنیک کے نقطہ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعری رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہے اور کبھی قسم کی عقیدہ نہیں پیدا ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ابہام اور پھیلاؤ آ جاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن رمزی علامتوں کو برتنے میں اگر خالص سلیقے سے کام نہیں لیا گیا تو لطف سخن حاصل ہوتا تو کجا وہی بات ذوق پرگراں گذرے گی۔

یہی حال رعایت لفظی کا ہے۔ اگر اس سے شعری رمزی اور ایمانی کیفیت بلا کسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا۔ ورنہ اگر احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہوگی۔ ایسی لفظی نایتوں سے بچائے کو فت اور بے بطنی کے کچھ حاصل نہیں۔ یہ ضلع جگہ سے روح تغزل کا خون کرتی ہے۔ لکھنؤ اسکول نے اسکی جانب زیادہ توجہ کی جس کے سبب سے کلام میں طرز تصنع نے راہ پائی۔ بعض دلی سکول کے غزل گو شاعر بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ چند عام مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

توڑ دل کا نہ مرے مار کے پتھر شیشہ  
 شگدل ہم نے بنایا ہے یہ مر مر شیشہ  
 (شاہ فقیر دہلوی)

کیا ہے تازہ نخل غم کو آہیں سرو بھر بھر کر  
 بڑی محنت سے میں نے یہ ثمر جانے میں پالا کر  
 (امانت لکھنوی)

کر رہا ہوں شام سے میں انتظار اس ٹاہ کا  
 دید و بیدار ہر ایک آج اختر ہو گیا  
 (امانت لکھنوی)

دے دو پٹہ تو بہنا ٹل کا  
 نا تو اں ہوں کفن بھی ہو ہلکا  
 (ناسخ لکھنوی)

شعلے اٹھے جو آتش رخسار یار کے  
 بالے کی پھیلیوں کو سمندر بنا دیا  
 (برق لکھنوی)

بھاتا ہے نہایت دل کو خط رخسار جاناں کا  
 گھیسے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستان کا  
 (آتش لکھنوی)

سرخ رو دیکھئے کس کس کرے گاف ٹٹل  
 سر پہ باندھے ہوئے مقتل میں کفن لاکھوں ہیں  
 (دائع دہلوی)

چلو گھر خاک ڈالو اب حنا کا خون ہوتا ہے۔  
 کف افسوس ملنے ہو کھڑے گنج شہیداں میں  
 (سلیم لکھنوی)

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی جدت  
 اور ایس جان فداں دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمز کا اثر کہاں سے کہاں  
 پہنچ جاتا ہے۔

میرے سنگ مزار پر نہ ہاد رکھ کے نیشہ کہے ہے "یا استاد"

(میر)

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

(میر)

بہلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں تب نہ تقریر بھی تھا

(غالب)

عمر ہر چند کہ ہے برق خدام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

(غالب)

لکھتے ہے جنوں کی حکایات غلچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہے قلم ہوئے

(غالب)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھانے

(غالب)

یہ عمر بھڑ جو پریشا نیاں اٹھائی ہیں ہم نے تہاے آئوئے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

(غالب)

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایتِ لفظی سے کلام کی خشکائی، بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کیا جاسکتی اسی طرح شعر کے صنّ اور اد کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرزِ ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی۔ حسن اور اس کے لئے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں۔ وہی معمولی باتیں ہیں جنہیں سب کہتے ہیں۔ ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر

جوں تک نہیں رہی تھی۔  
 قطرہ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن غالب نے اسی مضمون میں  
 ندرت اور نزاکت کی رنگارنگی سودی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قطرہ اشک کی قدر  
 و قیمت گہرے زیادہ ہے۔ اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے  
 پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی۔ یہ قطرہ کی پست  
 ہمتی ہے کہ وہ گہرے پر قناعت کر لیا۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو  
 انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رہنے کی معراج ہوتی۔ شعر میں  
 دعوے سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر  
 بھری ہے شعر ہے :-

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گہرہ بولیا  
 اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسن ادا کی خوبی کے لئے لازمی عنصر  
 ایمائی اثر آفرینی ہے۔ چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلے ہوں  
 یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی  
 صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا  
 کر سکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری  
 ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف  
 لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن  
 اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت  
 سے بالکل منقطع تو نہیں ہوئے۔ مجاز و رمز کی دنیا میں جس سے غزل  
 عبارت ہے امر عقلی میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسن ادا جلوہ گر  
 ہو۔ غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوسکتے  
 اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو پس اس  
 سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔



طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ بہت مضمون کو بھی ایمانی زور سے اوپر اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ ایک نئی زور کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ معنوی اور رمزی اثر بہر حال لفظوں ہی کا رہن منت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ سب لفظ بلند اور بہت احوال کی طرف ذہن کو منتقل کر سکتے ہیں۔ دراصل لفظوں کی ترتیب و ترکیب ان کی فطرت کو بدل دیتی ہے اور معمولی باتیں سحر بن جاتی ہیں۔

غم کا مضمون بیان کرنا مقصود ہے۔ موت اور کفن کی شعری علامتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس فضا میں کیا بلا کی شوخی لفظوں کی مناسب ترتیب نے پیدا کر دی۔ غالب کا شعر ہے۔

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤں ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی

مرزا یگانہ اسی مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا شعر غالب کے شعری گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ کہتے ہیں۔

جامہ زمیوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جو بن

دوڑ کر بے کلمہ سے رنگا نا چا

سوال یہ ہے کہ مرزا یگانہ کے شعر میں کس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی تاثیر پچھلی رہ گئی؟ سارا طلسم لفظوں کی صحیح ترتیب اور حسن استعمال میں پوشیدہ ہے۔ غالب نے کفن کی مناسبت سے شہیدوں اور حور کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے اندر رمز و ایما کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا یگانہ نے اپنے شعر کو غلط غلط سے شروع کیا اور آخر تک غلطی میں مبتلا رہے۔ جامہ زیب اور جو بن کے لفظ اس رمزی فضا میں بے سود پیدا کرنا چاہتے ہیں کھٹکتے ہی نہیں بلکہ ذوق سلیم پر گراں گذرتے ہیں۔

کتنے کے مضمون کے ساتھ اس قسم کے لفظوں کا تکلف یا چوچلا پن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق نہیں اس لئے ان کا شعر بلاغت اور تاثیر کے دربار میں بار زیبا سکار تیر صاحب فرماتے ہیں۔ ہم نے جانا تھا کہ گے گا تو کوئی حرف اے میر

پیر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا  
تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مصحفی نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔  
مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم

تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا  
مصحفی کے دوسرے مصرع میں رفو کا لفظ ایمائی اثر پیدا کرنے کے بجائے نفس واقعہ کے بیان کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جس کے باعث شعر بے اثر اور کمزور ہو گیا۔ برخلاف اس کے تیر کے شعر میں جدت ادب اور سادگی کی دل نشینی معمولی ذوق رکھنے والے کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رفو کا مضمون غالب نے بھی باندھا ہے اور اپنے الفاظ کچھ انداز میں باندھا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زخم کو جو میں رفو کار ہا ہوں تو اس کا مطلب چارہ جوئی یا پاس درد سے غفلت انہیں بلکہ زخم سوزن سے لذت گیر ہونا۔ مرزا کے یہاں ایکائی اثر آفرینی نے مضمون کی خرابیت کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہ عیب جو مصحفی کے شعر میں نظر آتا ہے مرزا کے شعر میں نہیں۔

رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی  
سمجھنا مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے  
دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن  
غمہ سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

رفو کے مضمون سے ملتا جلتا مضمون پیوند یا جوڑ لگانے کا ہے۔  
 ابر مینائی نے اس مضمون کو عجیب و غریب نہرت سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں  
 شب وصال بہت کم ہے آسمان سے کہو  
 کہ جوڑ دے کوئی اکھڑا شبِ جدائی کا

اس غرض میں ایک تو نقل قول کی خوبی ہے جس میں رمز و کنایہ کا  
 خزانہ چھپا ہوا ہے اس کے علاوہ یہ کہ شاعر نے ایک تیر میں دو نشانے  
 اڑائے ہیں۔ وہ فلک سے شکایت کرتا ہے کہ شب وصال بہت کم ہے  
 اور شبِ فراق اتنی طویل کہ کھٹے نہیں کٹتی۔ شکایت کے ساتھ اپنے طلب  
 مدد کا فلک پر کو ایک ترکیب بھی بتائی ہے کہ شبِ جدائی کی درازی میں  
 سے ایک میچہ اکٹ کر شب وصال میں جوڑ دے تو کیا خوب ہو۔ اس طرح  
 شبِ فراق کی درازی میں کمی پیدا ہو جائے گی اور شب وصال کی مدت کچھ  
 بڑھ جائے گی جو عین مقصود ہے۔

شاعر نے یہ سب باتیں اتنے کم لفظوں میں اور اس سلیقہ سے ادا کر دی  
 ہیں کہ بلاغت ناز کرتی ہے۔ شعر سن کر سامع کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شب  
 وصال اور شبِ فراق زندگی کی دائمی کیفیات ہیں جن میں ایک لطیف اور  
 مبہم سا غفلت ہے جو تغزل کی جان ہے۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے۔  
 کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاؔ پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں  
 بہت بلند شعر ہے۔ اسی مضمون کو ذرا بدل کر رند نے یوں ادا کیا ہے۔  
 میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پاراک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا  
 بلاشبہ رند کے شعر کا ایمائی اور رمزى اثر جو لطافت جذبات کی ترجمانی کرتا ہے  
 خواجہ میر درد کے شعر سے بھی بڑھ گیا۔ لفظوں کی ترتیب نے مضمون کی

دلاویری میں اور اضافہ کر دیا سیدھے سادے لفظ ہیں لیکن ان کا مجموعی اثر پڑا ہوا طور پر ذہن میں عجیب و غریب یادیں برانگیختہ کرتا ہے۔  
میر تقی میر کا شعر ہے۔

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ ناغری بدن میں کبا عشق میں ہوا ہے لے یہ حال تیرا  
اگرچہ شعر میں تفصیل زیادہ آگئی ہے لیکن چہرہ بھی ہنر سے خلوص نکلتا ہے جس کی بدولت  
تفصیل کا عیب بڑی حد تک چھپ گیا ہے۔ حسرت موہانی نے اسی مضمون میں اپنے  
ایجاز بیان سے اور زیادہ نزاکت پیدا کر دی۔ دوسرے مصرعے میں استغناء م کما  
لطف خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے۔ شعر ہے۔

عشق بتاں کو جی کا جنمال کر لیا ہے حسرت یہ تو۔ اپنا کیا حال کر لیا ہے؟  
سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

دوستان منع کفتم کہ چرا دل تو دادم  
باید اول تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی  
میر تقی میر نے بالکل اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی سے ادا کیا اور پہلے مصرع  
میں گناہ کے لفظ کو لا کر لطف کو دو بالا کر دیا۔ شعر ہے۔

پیار کر کے کا جو خوبان ہم یہ رکھتے ہیں گناہ  
ان سے بھی تو پاؤ چھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے۔  
دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ہمک پیار کر کے تم کو  
تم سے بھی کوئی بوجھ تم کیوں ہوئے پیارے  
میر صاحب کا شعر ہے۔

دین و مذہب عاشقوں کا قابل پریش نہیں  
یہ ادھر سجدہ کریں ابرو جدھر اس کی ہے  
خواجہ میر درد نے بالکل اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے مضمون کو اور زیادہ

نکھار دیا۔ ان کا شعر ہے

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا کعبہ جیدھڑلے وہ ابرو او دھر نماز کرنا  
اردو غزل میں غالبِ جدت ادا کا امام ہے۔ تیر اور مومن بھی لفظوں  
پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انھیں فاتحانہ انداز میں برستا ہے۔ ایسا معلوم  
ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں۔

ما نبو دیم بدیں مرتبہ راضی غالب  
شعر خود خواہش آن کر دکہ گرد و فن ما

باوجود میر صاحب کی استاد کی کو ماننے کے غالب کو خود بھی اپنی خوش ادائی  
کا احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو حسن ادا اس کے کلام میں ہے وہ اردو  
کے کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اردو میں مرزا کی غزل میں رمزی اور ایمائی انداز بیان اپنے کمال پر پہنچا۔  
ذوق کی رسمی معاملہ نگاری کے سمجھنے والوں کے لئے یقیناً غالب کا کلام  
سمجھنا دشوار ہوا ہو گا جس نے اپنی ابتدائی شاعری میں بیدل کا تتبع کیا تھا۔  
چنانچہ انھیں لوگوں کی خیالی پستی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا ہے۔

مشکل ہے زبں کلام میرا لے دل سن سن کے اسے سخنوران کا بل  
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل و گونہ گویم مشکل  
سطحی علم و نظر رکھنے والے نکتہ چینیوں کے جواب میں اس کو کہتا پڑا۔  
نمائش کی تنانہ صے کی پروا گر نہیں ہے مے اشعار میں معنی نہی

گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بیدل کے متبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزا نے اپنے ندرت بیان اور جدت تخیل کے لئے اپنا علم ذہن طراپا دیکھا جو اس کے لئے مخصوص رہا اور آج تک کوئی اس کی پیروی نہ کر سکا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا عظیم المثل اور کامل شاعر بنا دیا۔ مرزا نے آخری زمانے میں اس طرز کے غریب اور تفصیل الفاظ اور پرمجیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی شکل باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن ایمانی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرزا صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم منجھتہ دان بھی تھے۔ انھوں نے تغزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمجھا اور اس طبع زندگی کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔ مرزا کی ان غزلوں کو بھی جن کوئی شکل لفظ نہیں آتا ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں سمجھنے کے لئے ایک خاص علوئے ذوق و امتیاز اور علمی بصیرت درکار ہے جس کی کاوش و تبحر کے بغیر رموز و معانی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا کا تغزل اردو زبان میں رمز نگاری کا آخری نقطہ ہے۔ وہاں صرف انھیں کی رسائی ہوتی ہے جو اس کے سمجھنے کی خاص وجدانی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے ہل متبع کی ایمانی کار فرمائوں میں رموز و معانی کی گہرائی برقرار رہی اس لئے کہ اس کے تخیل کی پرواز کا انداز ہی نالا اور اچھوتا تھا۔ اس کی نواہائے راز کو محرمان باز ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی رمز نگاری کی جانب کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردے ساز کا

غالب نے عامیہ خیالات اور متبذل محاوروں سے ہمیشہ احتراز کیا اگرچہ اس نے رعایت نفی سے اپنے کلام کے حسن کو دو بالا کیا لیکن اس باب میں بھی اس کی راہ دوسروں سے الگ رہی۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے اس شعر کی بہت تعریف کی اور اسے شاگرد سودا کا یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی  
مرے شیر شایاں رحمت خدا کی

اسد کے تخلص کی وجہ سے دھوکا ہوا کہ یہ شعر شاید مرزا کا ہوگا۔ مرزا شعر کو سن کر  
برا فروختہ ہوئے اور کہنے لگے ”اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت  
خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی“

لیکن مرزا غالب نے حسن ادا کو چھکانے کے لئے جہاں مراعات لفظی برتی ہیں  
وہاں شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مجھے دیدہ تریا د آیا	دل جگر تشنہ فریا د آیا
دم بیا تھا قیامت نے تنور	کیوں تو وقت سفر یا د آیا
سادگی ہائے تمنا یخی	پھر وہ نیرنگ نظر یا د آیا
زندگی یوں بھی گزری جاتی	کیوں ترا را گزریا د آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	گھر ترا خلد میں گریا د آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا خیال	دل گم گشتہ مگرا د آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	دشت آلودیکھ کے گھریا د آیا
میں نے مجنوں پر لڑکین میں اسد	سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا د آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے لیکن تصنع نام کو نہیں۔  
ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے۔  
پوری غزل ایمانی تاثیر میں رچی ہوئی ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ ایسا معلوم  
ہوتا ہے کہ لفظ معافی کے لئے اور معافی لفظوں کے لئے بنے ہیں۔ یہ تغزل  
کا کمال ہے۔

مندرجہ ذیل غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں لیکن مرزا کے اچھوتے طرز ادا نے  
معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر و قوت اور وسعت عطا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ  
اس غزل کا اشکال لفظی نہیں رمزی ہے۔

نہ گل نعمتہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
تو اور آرایش حشم کا کل میں اور اندیشہ ہائے اور دراز

لاف تمکین فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز  
ہوں گرفتار الفت صیاد و راز باقی ہے طاقت پرواز  
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز  
مرزا کے نعروں میں حقیقت جمالی کا انکشاف مختلف پیرایوں میں  
ہوا ہے۔ اس کے کلام میں ہمیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے  
سارے لوازمات ہیں، ہمیں رندانہ جہانوں کی بلند آہنگیاں اور شوخی  
ہیں اور کہیں رومنہ حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجہ۔ مرزا کے ہاں داخلیت اور  
خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے  
اس باب میں انتہا پسندی سے پرہیز کیا۔ نہ ایسی دروں بینی ہے کہ غیر خود  
کا وجود ہی نہ رہے اور نہ ایسی خارجیت ہے کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات  
کے اندرونی تجربوں اور تاثرات کی دنیا بے رنگ و بو ہو جائے۔ خارجیت  
جب غزل میں برتی جاتی ہے تو محبوب کے ضد و خال چال ڈھال، زلف و رخسار  
اور قد و قامت کے بیان میں شاعر اتنا مہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی  
کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مرزا غالب کی خارجیت جرأت  
ناسخ اور لکھنؤ کے دوسرے شاعروں کی خارجیت سے بالکل مختلف ہے  
رمزی اثر آفرینی کی وجہ سے اس میں اندرونی تجربہ کی جھلک ہمیشہ برقرار  
رہتی ہے۔ اسی طرح مرزا کی درون بینی میں اگرچہ بعض جگہ ماورائیت  
پائی جاتی ہے لیکن بالعموم وہ اپنے مجازی رنگ کے باعث اسی دنیا کی  
چیز معلوم ہوتی ہے۔ چاہے مضمون کچھ ہی ہو مرزا کے لب و لہجہ کی مسامت  
اور سنجیدگی، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور رمزی اثر آفرینیاں دلوں  
کو تسخیر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ بعض دفعہ انسان حسرت میں پڑ جاتا ہے کہ  
سیدھے سادھے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آگئی۔ مرزا غالب کے ہاں  
جذبہ وجدان اور تخیل کا ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے کہ اردو کے کسی اور



شاعر کے یہاں اس کی فطرت نہیں۔ غزلوں میں سب ہی بحریں برتی گئیں ہیں لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہ شعر کا جادو اسی سے جگایا جاتا ہے۔

حسن و عشق کی داستان سرائی میں غالب نے تصنیف سے احتراز کیا۔ صنائع و بدائع ویسے بھی اس کے کلام میں کم ملتے ہیں لیکن واقعہ گزاری میں ان سے اور بھی بچنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کوئی سلفت یا رعایت آگئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور ذوق کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا واقعہ گزاری کے ضمن میں دوسرے شاعروں کی سی معاملہ بندی کی توقع مرزا سے نہ کرنی چاہیے۔ اس باب میں بھی اس کا انوکھا بن اور اچ نکاباں ہیں۔ تحسین حسن اور کیفیات محبت کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عشق و حسن کے سارے نازک پہلوؤں پر ترزا کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے تو کہیں دامن محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت دے دیتا ہے۔ عجز و نیاز سے تو۔ آیا وہ راہ پر دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچنے ایک اور جگہ محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر رہے ہیں۔ خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو بے اعتدال کہتے ہیں کہ انہیں کسی طرح نہیں پڑتا۔ ان کی کھینچا تالی کی عادت نہیں جانی کبھی میرے گریبان کو چاک کرنے کے رہے ہیں اور کبھی جانائے کے دامن کو کھینچتے ہیں اس شعر میں فی تنزل اپنے ساری شوقیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں ناگش میا کبھی میرے گریبان کو کبھی جانائے کے دامن کو جذبہ رشک کی عجیب و غریب توجیہ کرتے ہیں۔ رشک دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات سے ہے۔

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرنے ہیں دلے ان کی تمنا نہیں کرتے دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے  
 میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائیگا  
 باوجود محبت کی مایوسیوں کے مرزا پڑا سید رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں  
 محبت اور امید دو توں پہلو پہلو نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں  
 اس لب سے لہ ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں

شوق فضول و جرات زندانہ چاہیئے  
 معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض اوقات جرأت زندانہ آہ و بکا کے مقابل میں  
 حصول مدعا کے لئے زیادہ مدد و معاون ہوتی ہے۔ فریاد کی بے اثری کے متعلق کہتے ہیں۔  
 وفائے دلبرن ہے اتفاقی ورنہ بے ہدم  
 اثر فریاد دلاہائے حنین کا کس نے دیکھا ہے  
 دوسری جگہ اسی مطلب کی طرٹ اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتشِ نیر  
 کس نے پایا اثرِ نالہ دلاہائے حنین  
 چاہئے وفا اتفاقی ہو یا نہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ محبت  
 نہیں تو عداوت ہی سہی۔ بغیر لگاؤ کے زندگی دوبھر ہو جائے گی  
 وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو  
 بچھے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو  
 پھر کس سادگی اور پُرکاری سے اس مطلب کو ادا کرتے ہیں۔

قطعِ بچھے نہ تعلقِ ہمسے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی  
 ہم بھی تسلیم کی خورڈا لیں گے بے نیازی تری مادت ہی سہی  
 یار سے پھیر چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی  
 کبھی آرزو اس لئے کی جاتی ہے کہ تاکامی کی حسرت سے دل لذت اندوز ہو۔  
 طبع ہے مشاق لذت ہائے حسرت کیا کرو آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اسی بات کو دوسرے پیرایہ میں یوں کہتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشا فی نیرنگ تما

مطلب نہیں کچھ اس کے مطلب ہی برآوے

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تما کا سفر کسی منزل پر ختم نہیں کرتا۔ جب ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو آگے کی منزل کی روشنی اسے دور سے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اپنا قدم اس طرف بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بلند اور حکیمانہ مضمون کو اس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ حکمت و نغمہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

ہے کہاں تما کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پایا جس منزل پر پہنچ گئے وہ نقش پائے رہبرو کے محاش ہو گئی۔ جب نقش کی طرح اس میں خمود ہے تو دل اس پر کیسے رہے۔ دل تو دائمی حرکت چاہتا ہے۔ کس خوبی سے سوال کرتے ہیں کہ دشت امکان جب نقش پاکے مثل ہے تو اب تما دیکھو اپنا دوسرا قدم کدھر بڑھاتی ہے؟ تما کے لئے دشت امکان کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جہاں ہیں جن کی تسخیر اس کا مقصود و مقصد ہے اور جہاں اسباب و علل کی دنیا کی طرح مجبوریاں نہیں۔

غالب کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس مجاز سے حقیقت کا دامن نہ ہوا ہے۔ یہ بھی رمز نگاری کا کمال ہے کہ سامع حقیقت اور مجاز کے دونوں پہلو اپنے ذہن کے مطابق کلام میں سے ڈھونڈ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کبھی خاص حالات میں ایک پہلو مزہ دیتا ہے اور دوسرے حالات میں اسی شعر کا دوسرا پہلو لذت یہم پہنچاتا ہے۔ سعدی حاقظ اور دوسرے غزل کے اساتذہ کے کلام میں ابھی آپ یہ صفت پائیں گے جس کے باعث ان کے کلام کی ہمہ گیری آج تک مسلم چلی آتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عشق مجازی کی شورش اور

مستی اور عشق حقیقی کا جذب و عرفان بدرجہ اتم ملتا ہے۔ دونوں صورتوں میں  
تحلیل اور اصلیت ایک دوسرے سے وابستہ و آپوستہ رہتے ہیں۔ اُس کی  
دنیا ئے خیال میں تنوع ہے، اس لئے کہ اس کا اندرونی تجربہ نہایت وسیع  
ہے۔ حقیقت کے اس پہلو کو جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے اور جس کا احساس  
صرف وجدان کر سکتا ہے غالب نے رمز و کنایہ کی زبان میں بیان کیا  
چنانچہ اس طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفت گو

نتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

غالب کی اس ہمہ گیری میں اس کی عظمت مضمر ہے۔ لیکن بعض جگہ نہایت  
واضح طور پر مجازی سے گفتگو کی ہے۔ اور اس میں کھینچ تان کر کے حقیقت  
کے پہلو کا نا ذوق سلیم کے لئے گراں ہے۔ مثلاً یہ شعر سوائے مجاز کے اور  
کوئی پہلو اپنے اندر نہیں رکھتے۔ لیکن ان میں آپ کہیں عریانی یا ابتذال  
کا نشان تک نہ پائیں گے۔

آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غور تھا

نظر لگے نہ ہمیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عسزیر

گرچہ ہے طرز تغافل پر وہ دار راز عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہی  
اسی مضمون کا مومن خاں کا شعر بھی خوب ہے۔

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرائے کھوئے گئے ہم ایسے کا غیار پائے گئے

غالب کے واقعہ گذاری کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی پر بلاغت بقنا ناز کرے کم ہے۔

ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیان اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رادواں اپنا  
مئے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگردِ ناعتاب میں  
ہجر و انتظار کی کیفیات غزل گو شاعروں کا ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون  
ہے جسے غالب نے اپنے ندرت بیان اور حسن ادا سے بالکل دوسرے ہی  
پیرائے میں پیش کیا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں یمنذ آئے عسبر بھر  
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں  
قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں  
انتظار اور تمنا کو کس خوبی سے آغوش و آغوش کیا ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں بے خدا افسون انتظارِ متنا کہیں جسے  
محبت بیکر انتظار و تمنا ہے۔ آرزو جب تک پوری نہ ہو اس وقت تک انتظار  
کی زحمت گوارا کرنا محبت کے آداب میں داخل ہے۔ محبت کی فطرت میں صبر  
و انتظار کے عناصر موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکمیل کر سکے۔  
دوسری جگہ انتظار کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

”ج آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے  
محبوب کو کس خوبی سے سمجھاتے ہیں کہ میرا نہ شکوہ بیدار نہیں بلکہ تقاضا ہے  
تم ہے تو غلط مت سمجھ۔ یہ شعر رمز نگاری اور واقعہ گذاری دونوں کا اعجاز  
ہے۔ کہتے ہیں۔“

نالہ جز حن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں  
 اسی مضمون کو دوسرے طور پر یوں بیان کیا ہے۔  
 گو سمجھتا نہیں پر حن تلافی دیکھو شکوہ جو رے سرگرم جفا ہوتا ہے  
 شکوے شکایت کے مضمون کو مختلف انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔  
 پڑھوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا پھیرے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے  
 اسی خیال کو دوسری جگہ یوں باندھا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ  
 ہے ہی بہتر کہ لوگوں میں نہ پھیرے تو مجھے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو

مذکر دوسرے دل سے کہ اسیں آگ دہی ہو  
 محبوب جب خصوصیت کے ساتھ پردہ کرتا ہے تو اس کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ  
 ایسا کرنا چھوڑ دو ورنہ خواہ مخواہ لوگوں کو اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ملے گا۔  
 دوستی کا پردہ ہے۔ یہ گانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا جائیے  
 جب وہ پردہ نہیں کرتا اور سامنے آتا ہے تو نظارہ کی تاب نہیں۔  
 کبھی خود نظارہ کرنے والی نگاہیں رخ جانان پر بکھر کر پردہ بن جاتی ہیں۔  
 کبھی بہار کی زنگارنگی حجاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی نمود حسن  
 برق نظارہ سوز بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔

نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کی مستی سے ہر نگاہ رے رخ پر بکھر گئی

نظارہ کیا حریت ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

لے کم و بیش اسی مضمون کو ہتھرنے بھی بڑے دل آویز طریقہ پر ادا کیا ہے۔  
 عین خود نمود حسن میں شائیں حجاب کی جھکو خبر رہی نہ رخ بے نقاب کی

انکامی منجگاہ ہے برق نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی  
غرض کہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پر وہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے مگر وہ  
پر وہ نہیں کرتا تو اب نظارہ نہیں۔ تنافل کا محکمہ کرنے لگے اور اس نے ذرا  
توجہ کی تو ایک ہی منجگاہ میں فنا ہو گئے۔

کرنے لگے تھے اس سے تنافل کا ہم محمہ کی ایک ہی منجگاہ میں فنا ہو گئے  
کبھی عشق کی منجگاہ کرم نقاب حسن کے سب بند ایک ایک کر کے کھول دیجی  
ہے۔ سب پر دے اٹھنے پر حال کو یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ منجگاہ کا پردہ سب  
بھی باقی نہ گیا۔

دا کر دینے میں عشق نے یہ نقاب حسن اختیار کیا کہ اب کوئی عامل نہیں رہا  
کبھی نظارہ کی تاب نہ لے رہا لیکن وہ منجگاہ طلب کے لئے تیار نہ ہو جاتی ہے  
پریا، نہ اسے آگے بول سکتے ہی نہیں۔ نقاب نہ بہتہ ہو گیا ہے نہ یا نہ  
شوق وصل اور شکوہ ہجران کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل ہی دل میں رہتی ہے  
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجران  
خدا وہ دن کرے اُس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی  
غالب کے طرزِ اداسی، بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظرِ اردو کے کسی دوسرے

نہ اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرت  
حیرانِ منجگاہ سے حسرتِ جمالِ یار  
نہ اسی معنوں کے تیرے متعدد شعر ہیں۔  
کہتے تھے کہ یہ کہتے وہ کہتے عودہ آتا  
کہتے تھے اس سے ملے تو کیا کیا نہ کہتے نیر  
جی میں غما اس سے ملے تو کیا کیا نہ کہتے نیر  
دل میں کہتے مسودہ سے کہتے

ایسا حجابِ چشمِ تماشا نہیں ہے راضی  
تھا پردہ حجاب میں گوبے نقابِ تماشا  
سب کہنے کی باتیں ہیں کہہ ہی نہ کیا جاتا  
وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات  
بب ملے تو وہ گئے ناچار و بچہ کو  
ایک پریش اس کے زبردست کیا

شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے مس کرتی اور ان کے متعلق ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلاپن داغ کے یہاں بھی ہے لیکن اس میں بعض جگہ خفیف سو قیام پین آگیا ہے۔ غالب کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اور اس کے طرزِ اداس نے اس بلند کی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناتر چاہئے غیرے تہی سن کے سمِ ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یو

جاتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر جمیست ادھر نہیں آتی

زنہ گئی اپنی جب اس صبح سے گزرے غائب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ حذر رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پر ہر لحظہ نگاہ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا بڑی

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہر وقت عزیز سوائے بادۂ تکلفِ ام شک بویا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جس میں لاکھوں پس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

طاعت میں تار رہے نہ مئے انگبیس کی لاکھ دھنچ میں ڈال دو کوئی لے کر رشتہ کو



رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔  
جب میکدہ چھٹا توچرا ب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کیوں روقدح کرے ہے زاہد سے ہے یہ مگس کی تے نہیں ہے

واعظ نہ تم بیونہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے یہ بے گم کہ کم ہے بے گلفام بہت ہے  
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دردِ تہ جام بہت ہے  
یعنی دیسے تو میرے لئے پیمت ہی کافی ہے لیکن یہ بات ساقی پر ظاہر کرتے ہوئے  
شرم آتی ہے کہ کہیں وہ نہ سمجھے کہ کیسا کم حوصلہ آدمی ہے۔  
اس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔

منا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں  
یعنی ترا منا اگر دشوار ہوتا تو ہم مایوس ہو جاتے اور تیری جستجو ترک کر دیتے  
لیکن طبری دقت یہ ہے کہ نہ دشوار ہے اور نہ سہل۔ یہ احساس کہ تیرا منا  
دشوار نہیں ہے شوق کو مروتہ نہیں ہونے دینا اور یہ احساس کہ آسان نہیں  
ہے سہی آرزو کے لئے ہمیں زکا حکم رکھتا ہے۔

نائب نے اپنے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے  
تغزل کی خوبیوں کو قائم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے  
اس کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے

مسائل کو رعب و دھماکی زبان میں ادا کیا۔ بنے چنانچہ بس جگہ اس کی شاعری خالص  
تصورات کی شاعری بن گئی ہے جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے  
پارچاند لگا دیے ہیں۔

قبیلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے مقصود و منتہا کی طرف  
اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس۔

ہٹ پر سے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

لنرت آرائی و صحت ہے پرستاری و ہم کردیا کافران اسنام خیالی نے مجھے

ہاں اہل طلب کون سے طعنے نایافت دیکھا کہ وہ مٹا نہیں اپنے ہی کو کھڑکے

طاعت میں تارہندے و نجبین کی لگا رہ تیغ میں ڈال دو کوئی نے کر بخت کو  
حکیمانہ رموز و اسرار کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے۔

عشرتِ قعر و ریاس تھا ہو جانا ورد کا حد سے گذرنا ہے دو اہو جانا

صدمہ روبرو ہے جو شریکان اٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائے

منگنی دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہوتا تو پرستیں ہوتا

جتنا ہوں تھوڑی دو بہر اک پتھر و کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی۔ اہر کو میں

قطر اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنگ ظرفی مسطور نہیں

دو نوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا  
یاں آپڑی یہ شدم کہ تکرار کیا کریں

حد سے دل اگر انسودہ ہے محرم تماشا ہو  
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظار سے وا ہو

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان سے  
مرے بت خانے میں تو بکے میں گاڑو برہمن کو

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے  
بہتے گئے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

چمن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم  
نگری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیانہ کوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر  
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے  
مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرزِ ادا کی جدت اور انوکھا پن  
ہے۔ انھیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں  
جو جذبہ کی تاثیر اور خیال کی دل کشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش  
میں اور تیشیوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر بہتی  
علوہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت لفظی اور معنوی تصرفات سے  
بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین

اور استعاروں کا اچھوتا پن ان کی شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔ بعض جگہ تدا کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ دراصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو اس کو دل نشیں انداز میں بانٹ دے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب نے جب کبھی دوسرے استادوں کے مضمون مستعار لئے ہیں تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے کوئی جدت ضرور پیدا کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں سعدی کا شعر ہے۔

یا وفا خود بنو و در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرد  
اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمناک معنی نہ ہوا  
خسرو کا شعر ہے۔

جانان اگر شبیت دہن بردہن ہم خود را بخواب ساز و لگوئیں زبان کست  
غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ یہ وقت ہے پرستی ایک دن  
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر غدر مستی ایک دن  
خسرو کا دوسرا شعر ہے۔

زے عمر دراز عاشقان گر شب ہجران حساب عمر گیسر  
غالب کہتے ہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں  
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں  
اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے شعر میں ایسا و اجمال کی جو خوبی ہے وہ غالب کے  
شعر میں نہیں۔ اس نے غیر ضروری تفصیل اور توضیح سے کام لیا جو خسرو کے  
ہاں نہیں۔

خسرو کا ایک اور شعر ہے۔

اے گل جو آدمی زہیں گو چکو نہ اند آں رویہا کہ در ہتہ گردنفا شدند  
میر تقی میر نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر قطعہ چمن پر نگہا کر نظر کر بگر میں ہزار شعلیں تب بچوں یہ بٹاے  
غالب نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں بنیادیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا سورتیں مں کی کہ نہاں ہو گئیں  
خسرو کا شعر ہے۔

جرات جگر خستگان چہ می پرسی ز غمزدہ پرس کہ اس شوخی از کجا آخت  
غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ شوخ کر دیا۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ نگ کہیں مرے زخم بگڑ دیکھتے ہیں  
حافظ دنیا کے غزل کا سب سے بڑا اداکار ہے اس کا غزل بے مثل ہے۔ اس  
کے مقابلے میں کسی دوسرے کو نہیں لایا جاسکتا۔ تاہم یہاں چند ہم مضمون شعر  
پیش کئے جاتے ہیں جنہیں پہلے حافظ نے باندھا اور اس کے بند غالب نے  
ان پر طبع آزمائی کی۔ حافظ کی تنقید مقصود نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ قدیم  
اساتذہ نے جو مضمون غزل میں باندھے ہیں ان میں بعض اوقات دوسری تبدیلی  
کر کے تقدیمین نے اور لطیف میں اضافہ کر دیا اور سن آداس وہ مضمون گویا  
انہیں کا ہو گیا۔ اس طرح پُرانے سے پرانے مضمون میں بھی اچھوتا  
پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جدت ادا سے اس پر نئی چھاپہ پڑ جاتی  
ہے۔ اساتذہ غزل کے چند شعروں کا غالب کے شعروں سے اسی نقطہ نظر  
سے مقابل کیا جاتا ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

آفرین بردل نرم تو کہ از پیر ثواب کشم غمزدہ خود را بہ نسا آمدہ  
غالب نے تھوڑے سے تصرف سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے تو یہ

ہائے اس زود پشیاں کا پشیاں ہونا

بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ رد و پشماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جاسکتا صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

حافظ کا شعر ہے  
 سن کہ حول گشتی از نفس فرشتگان    قال و مقال ملے میکشم از برائے تو  
 غالب کا شعر حسن اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں۔  
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پلند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے  
 نالہ می کشم بند درد تو کا ہے لیکن    تا لب می رسد از ضعف نفس می گرد  
 غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب نزاکت پیدا کر دی۔  
 تالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے  
 جو وہ نہ کھینچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہو

فیضی کا شعر ہے۔  
 نوش داروئے محبت را پیرس اجزا کہ صیبت  
 سوردہ الماس در زہر ہلاکت می کنند  
 غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔  
 نہ پوچھ اسخو امر ہم جرات دل کا    کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہی  
 میر تقی میر کا شعر ہے۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں  
 لگ انھی ناگ ناگاہی کہ گھر سب پھک تھا  
 میر صاحب کے شعر میں ذوق شری کوئی گور کسر نہیں نکال سکتا۔ لیکن غالب نے  
 اپنے اعجاز بیان اور حسن اور اسے مضمون کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ وہ اسی بات

کو یوں کہتا ہے۔  
دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں  
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا  
میر صاحب کا شعر ہے۔

آوے گی اک جاترے سرس لے اے صبا زلف سیہ کا اس کے اگر تار جابجگا  
غالب نے اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔

کہتے ہیں تم نکالیں گے سن لے موج صبا بل تیرا اسکی زلفوں کے اگر بال پریشان ہو گے  
میر صاحب کا شعر ہے۔

اس نازکی سے گذرے کس کے خیال میں مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے دے تم  
غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہوں نہیں دیکھتے ہیں آج بت نازک دن پاؤں  
میر صاحب کا شعر ہے۔

سرا ہا ان نے ترا تہ جن نے دیکھا زخم شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا  
میر صاحب کے شعر میں رمزِ ہیبت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی نفس  
واقعہ کی نوعیت۔ اسی مضمون کو غالب نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلند اور  
پر لطف بنا دیا۔ شعر ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھے ہیں  
میر صاحب جس بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں غالب نے اجمال سے وہی  
کام بڑی خوبی سے نکال لیا اور استہنام کے ذریعہ رمزِ ہیبت اجاگر کر دی۔  
میر صاحب فرماتے ہیں۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر  
میں اس کا خواہاں یاں تک کہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا شعر ہے۔ ہم ہیں شتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟  
میر صاحب کا شعر ہے۔

جب درو دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں کہتا ہے بن نے ہی میں خوب جانتا ہوں  
غالب نے اس مضمون میں اپنی خوش ادائی سے اور نزاکت پیدا کر دی  
اس کا شعر ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں بے رکھائے ہم کو فریب  
کہ بن کچے ہی نہیں سب خبر ہے کیا کہئے؟  
لفظ کرشمہ کی ایجابی اثر آفرینی ملاحظہ طلب ہے۔ شعر کا اطلاق حقیقت اور  
مجاز دونوں پر بلا تکلف ہو سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں معنی کی دلاویزی  
میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔  
میر صاحب کا شعر ہے۔

جی ہے جلے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کرے  
یوں تو مزاج طرے کعبہ کے بہترا ہم لاتے ہیں  
غالب نے اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔  
جانتا ہوں جواب طاعت و زہد پر طبیعت ادا نہیں آئی  
میر صاحب کا شعر ہے

بہر فردوس ہو آدم سوالم کا ہے کو وقت اولاد ہے وہ باغ تو غم کا ہے کو  
غالب نے فارسی میں اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔  
ساتی بیار بادہ کہ از دودہ جسم زان پس رسد بہشت کہ میراث آدم است  
میر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں اجتہاد محبت کا نقشہ کھینچا ہے  
ابتداءً عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا  
غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کر دیا  
ان دونوں شعروں میں میر اور مرزا کا اسلوب بیان اپنے اصلی اور نکھرے



ہوئے رنگ میں نظر آتا ہے۔  
 رنگ و بے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو  
 ابھی تو تمنیٰ کام و دہن کی آزمائش ہے  
 تمنیٰ کام و دہن کی آزمائش کے بعد زہر غم رگ و پے میں اترتا ہے۔  
 اگر کوئی تمنیٰ کام و دہن سے گھبرا اٹھے تو وہ منزل عشق کے اس سفر کے  
 مثل ہوگا جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ بہت  
 لے۔

طرز ادا کے انوکھے پن کی ایسی مثالیں سوائے غالب کے اور کسی  
 کے یاں نہیں ملتیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔  
 نہ رخصت سے نادان کیا ہو اگر اس نے شدت کی  
 ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گزریاں پر

بہت دنوں میں غافل نے تیر پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

بس ہجوم امیدِ خاک میں مل جائیگی  
 وہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے  
 طرز ادا کی رمز کی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے بعض اوقات غزل گو شاعر  
 ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سہی تو  
 اور سہی کے لفظ۔ ان وصفی اور تزئینی کلمات کے استعمال سے رمز کی اور  
 ابہامی دونوں کیفیات بڑھ جاتی ہیں اور طلسمی اثر پیدا کرتے ہیں مدد ملتی ہے۔  
 میر صاحب کے دیوان میں خاص کر ان لفظوں کے استعمال کی مثالیں کثرت  
 سے ہیں میں سمجھتا ہوں اردو کے کسی دوسرے شاعر نے ان لفظوں کو اتنا  
 استعمال نہیں کیا یہاں چند ملاحظہ طلب ہیں۔

جب گل کہے ہے اپنے نہیں یار کے روسا  
تب آنکھوں تلے میرے اترتا ہے لہوسا  
تعبیر جے کرتے ہیں ہنگامہ محشر  
وہ یار کے کوچہ کا ہے کچھ شور غلوسا

کعبہ کی یہ بزرگی شرف سب بجائے لیکن

دلکش جو پوچھے تو کب اس آساں سے

سمجھے تو ہم تو میرے کو عاشق اسی گھڑی جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہو  
(میر)

دل دفعتاً جنوں کا ہیا سا ہو گیا دیکھی کہاں وہ زلف کسودا سا ہو گیا  
(میر)

جلوہ تیرا تھا جب تیں باغ و بہار تھا اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرایاں ہو گیا  
(میر)

لطف کہاں وہ بات کئے پر پھول سے بھرنے لگ عاویں  
سج کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعل ب سی ہے  
تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں  
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انھوں سے عجب سی ہے

زندگی اپنی خواب کی سی ہے یہ نمایش سراب کی سی ہے  
ماز کی اس کے ب کی کیا کہئے پنکڑی اک محراب کی سی ہے  
میران نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے  
مصحفی کے شعر ہیں۔

آج کچھ سینہ میں دل ہے خود بخود تیرا سا کر رہا ہے بے قراری پارہ یساب سا

خوں گل تر کیا ہے اس سے جھلکے ہے اس کا بدن  
وہ جو پیرا ہن گئے میں اس کے ہے اک آب سا

جرات کے شر ہیں ۔

بدشت خراب اپنے قدم کی برکت سے  
جتاؤں درد غربت تو کس ادا سے کہے  
قدم قدم پہ بہاریں ہیں سوچن کی سی  
کرد نہ مجھ کے یہ باتیں دوا پن کی سی

دل ہے پارہ بخت اچانے کہ کیا آفت ہے  
موسن خاں کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔  
ملتا تھا ہے پڑا پہلے میں جو سیلاب سا

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا  
یشوق یاس تو دیکھو کہ اپٹ قتل کے ہفتہ  
اگر نہ ہوئے گا نقشہ ہمارے گھر کا سا  
دعا سے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا  
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

نرکی دہلوی کا شعر ہے ۔

وہ تو نہال خوبی نازک ہے دل باہے  
عالم ہے اس کی بڑ میں گل کی شیم کا سا

داغ کے شعر ہیں ۔

عرض وفا یہ دیکھنا اسکی ادا و نفریب  
پوچھتے کیا ہو گون تھا ہو وہی داغ تھا  
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا  
نہ پہ تہا سے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

فانی کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اے وہ اب میں لب پہ جو تھو کے بٹے سے نہیں  
غم ہائے روزگار سے مکن نہیں گریز  
آغوش اضطراب میں سے ہوئے سے ہیں  
ہی جی ترے ستم میں ہوئے ہوئے سے ہیں

۲۰۶  
 اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں تیرے ہونٹوں پہ مہنسی آئی ہوئی سی  
 سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردہ دل سے امید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی

جگر کے کلام میں بھی بہت سی شائیں موجود ہیں اور ایک پوری غزل اسی انداز میں ہے۔

جان کی بقرار سی جسم ہے پائمال سا اب نہ وہ دل نہ وہ جگر صرف ہے ایک خیال سا  
 حسن کی سرکاریاں عشق کے دل سے پوچھے وصل بھی ہے ہجر بھی وصل سا  
 یاد کی بج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و رواج کچھ نہیں اقبال سا کچھ مجھے احتمال سا  
 تو اور نہسی کے لفظ بھی اسلوب بیان میں اسی طرح کا ابہام پیدا کرتے ہیں مثلاً  
 واما ندگی نے مارا آئنا درہ میں ہم کو معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو  
 افسانہ غم کا لب تک آیا یہ تون میں سو جایکو نہ پیائے اس داستان تلک تو  
 (میر)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی  
 (غالب)

نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ سہی امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی  
 (غالب)

ساز خیال یار سے پھیر چلی ہی کیوں نہ جائے نغمہ آرزو سنا تو نہ یا س بھی سہی  
 (فانی)

سُن تو یا یہ حال دل دیکھے سن کے کیا کہیں پھر مے منہ کی بات کہ کسی ہی دلشیں سہی  
 (فانی)

بعض اوقات شیوہ نازک خیالی اور طرز ادائیگی ندرت اور لطف کو دو بالا کرنے کے لئے شاعر دو تمثیلی تصورات کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔  
 یہ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے۔ کبھی تشبیہ

استعارہ کی لذت سے اور کبھی مراعات نفی اور صفات کے استعمال سے بظاہر معانی کا تعین مقصود ہوتا ہے لیکن دراصل اس طرح ایمانی اثر آفرینی کی طرف ذہن کو منتقل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تیسرے تشبیہ و کنفیات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سودا نے ان شعروں میں پہلے مجنوں اور کوہن کا مقابلہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا خود اپنی ذات سے۔

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہن بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز لے۔ وسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا میر صاحب بھی اپنا مقابلہ قیس و فرہاد سے کرتے ہیں اور بڑی آنہاں سے کرتے ہیں۔

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور اب مرے عہد میں فسانے میں اپنا مقابلہ مجنوں سے اس طرح کیا ہے۔

گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے سودا نے بالکل یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے۔

سمجھ کے رکھو قدم دشت خاں میں مجنوں کہ اس فوج میں سودا برہنہ پا بھی ہے میر صاحب کے کلام میں مقابلے کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ کہیں جنت کا مقابلہ کوئے یار سے کیا ہے کہیں مسجد کا دیر سے اور کہیں بجلی اور اپنے خاشاک آشیان کی مٹ بچھڑا دی ہے۔

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں مارے اسکی گلی کا ساکن ہرگز اُدھر نہ جھانکے

معمور شرابوں سے کہا یوں ہے برب دیر مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

جب کوئد فی ہے بجلی تب جانب گھٹاں رکھنی ہے چھڑیے خاشاک آشیان ہے اپنی سیرِ رباب کی لذت کا مقابلہ کرتے ہوئے چھڑا کو کس خوبی سے

خطاب کیا ہے۔ اس شعر میں مقابلہ اور نقل قول کے محاسن نے شعر کی تاثیر کو بڑھا دیا اور سادگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

کس کی ہوا کہاں کا قل ہم تو قفس میں ہیں اسیر  
میر جمن کی روز و شب تجھ کو بارگ اے صبا  
محبوب کی جلوہ گاہ او۔ بہشت کا مقابلہ غالب نے اس طرح کیا ہے۔

نہتے ہیں جو بہشت کی تشریف سب درت لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو  
(غالب)

اپنا اور آدم کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ میں محبوب کے کوچہ سے نکلنے میں جو رسوائی نصیب ہوئی وہ آدم کو بھی جنت سے نکلنے وقت نہ ہوئی ہوگی۔  
نکلنا اہل بیت آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہشت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے  
(غالب)

غالب کے اور شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا مقابل و دعویٰ عشق بے بنیاد جنون ساختہ و فصل گل قیامت سے

ایک طرف محبوب کی وفاداری ہے اور دوسری طرف عشق و محبت کا جھوٹا دعویٰ  
یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بناوٹی جنون اپنے ادب پر طاری کرے۔ جس طرح  
بہار کا یہ اقتضا ہے کہ جنون سچا اور حقیقی ہو اسی طرح وفا کا یہ اقتضا ہے کہ عشق  
و شوق کا دعویٰ سچا اور بلا تصنع ہو۔

وفا اور عشق بے بنیاد اور جنون اور فصل گل کی لفظی رعایتوں اور  
معنوی ناسبتوں نے حسنِ ادا کے جوہر کو چمکا دیا ہے میر جمن ہر لفظ اپنی جگہ پر  
یگمگنے کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے شاعر کی قادر الگائی کا انداز ہوتا ہے۔  
زلف کی درازی کا مضمون بہت پرانا اور پامال مضمون ہے۔ غالب نے  
اس میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی۔ وہ عیب کی زلف کا مقابلہ

اس کی سرور قیامت سے کرتا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر تیری زلف گرہ گیر کے بل کھل جائیں تو وہ تیرے قدم سے بھی زیادہ دراز ہے۔ یہ جو تیری سرور قیامت کی دھوم ہے اس کی حقیقت زلف کی درازی کے سامنے آشکارا ہو جائے گی۔ محبوب کے قدم اور اس کی زلف کے مقابلے نے شعر کی بلاغت کو کس قدر بڑھا دیا۔ شعر ہے۔

بہر م کھل جائے ظالم تیرے قیامت کی درازی کا

اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم بخلے زلف کی درازی کا مضمون مومن نے بھی باندھا ہے۔ لیکن وہ غائب کے شعر کی بھی رمز کی کیفیت نہ پیدا کر سکا جو زلف و قیامت کے مقابلے کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ مومن کے شعر کو سن کر نفس واقعہ کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے جس کے باعث شعر کی دلاوری اور بلاغت کم ہو گئی۔ شعر ہے۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف درازیں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا  
ایک جگہ غائب نے آنکھوں اور کانوں کے باہمی رشک کا مقابلہ کیا ہے۔ اگر بھی آنکھوں کو محبوب کا نظارہ نصیب ہو جاتا تو کانوں کو رشک ہوتا کہ ہم مردہ وصال سے محروم ہیں۔ یا اگر کبھی کانوں کو مردہ وصال ملتا تو آنکھیں رشک کرتیں کہ ہم دیدار کی ہوس پوری نہ کر سکیں۔ لیکن اب آنکھوں اور کانوں کا باہمی رشک باقی نہیں رہا اس لئے کہ مدت سے نہ تو نظارہ جمالی ہی میسر ہوا اور نہ مردہ وصال۔ دونوں کی محرومی نے ان میں موافقت پیدا کر دی۔

مردہ وصال نہ نظارہ جمالی مدت ہوئی کہ آشتی و چشم و گوش ہے  
غائب نے ایک موقع پر رشک اور عقل کا تغافل اور شاعر کے کان میں دونوں کی سرگوشیاں بٹہ بننے انداز میں بیان کی ہیں اور نقل قول کی بدولت شعر کی تازگی میں اضافہ کیا ہے۔

رشتہ کہتا ہے کہ اس کا غیرے اخلاص عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہر کس کا آشنا  
یعنی رشتہ کا یہ شبہ کہ وہ اغیار کے ساتھ اخلاص برت رہا ہے بے بنیاد  
ہے اس لئے کہ عقل اس شبہ کے پیدا ہونے کے ساتھ چپکے سے کہہ دیتی ہے کہ  
بھلا وہ آج تک کس کا دوست ہوا ہے کہ اب کبھی کا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ  
شاعر عقل کی رائے کو رشتہ کے شبہ پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح اپنے  
لئے وجہ اطمینان پیدا کر لیتا ہے۔ اندرونی غلطی کی یہ داستان کس خوبی سے  
ان دو مصرعوں میں آگئی۔

قامت یار اور فتنہ قیامت کا مقابلہ ملاحظہ ہو۔

ترے سرو قامت سے ایک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں  
کہنا یہ مقصود ہے کہ تیری سرو قامت کی آگے فتنہ قیامت بھی سچ ہے  
اس کو غالب نے اپنے مخصوص طرز بیان میں ادا کیا کہ چونکہ قامت یار بھی فتنہ  
قیامت سے بنا ہے اس لئے فتنہ قیامت ایک قد آدم کی حد تک کم ہو گیا۔ جو  
جتنے کم ہو گیا اسی میں فتنہ کی ساری خاصیتیں جمع ہو گئیں۔ محبوب کے قد و قامت  
کی یہ ایسا ہی تعبیر و توجیہ خاص لطف اور شعریات اپنے اندر رکھتی ہے۔

شب فراق اور قیامت کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں قیامت کا  
مکڑ نہیں ہوں لیکن شب ابر کے مصائب کے آگے اس کی پریشانیاں سچ ہیں  
انکار اور ثبات نے شعر میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

غالب  
ہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں  
اپنے گھر اور بیاباں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنوں میں اگر گھر  
برباد ہو تو کیا خدا اللہ ہے۔ بیابان کی دھتیں تو اتنے آئیں۔ اس طرح یہ سوجھا  
کسی طرح بھی گراں تو نہیں۔ اس شعر میں اپنے گھر اور بیاباں کا صرف مقابلہ ہی  
نہیں بلکہ انتخاب بھی ہے جس سے شعر کا لطف دو بالا ہو گیا۔  
غالب  
فیض خان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب دو گھر زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں



دوسری جگہ کہا ہے کہ اگرچہ گھر کی ویرانی بھی صحرا کی ویرانی سے کسی طرح کم نہیں لیکن صحرا میں جو آسودگی نصیب ہے وہ گھر میں کہاں اہمیت کی وجہ سے دشت کی ویرانی دشت کی پرورش کے لئے زیادہ سازگار ہے۔  
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں دست معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش گھر یاد نہیں کم و بیش ہی مضمون اس شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
 غائب نے صرف اپنے گھر اور دشت کا ہی مقابلہ نہیں کیا بلکہ محبوب کے گھر اور بہشت کا بھی اپنے خاص انداز میں مقابلہ کیا ہے اور اس ضمن میں بھی ترجیح و انتخاب کا اظہار کیا ہے۔ شعر ہے

کیا ہی صنواں سے لڑائی ہوئی گھر ترا خلد میں سگریا د آیا  
 دوسری جگہ اسی مضمون میں عجب ندرت پیدا کی ہے۔ عام طور پر ہمارے شاعر محبوب کے کوچے کو بہشت سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن غالب نے بہشت کو کوچہ پر سے تشبیہ دی ہے۔ محبوب کا کوچہ بہشت سے اس واسطے قابل ترجیح ہے کہ یہاں عاشقوں کے ہنگامے کی وجہ سے ہر وقت آبادی رہتی ہے برخلاف اس کے بہشت بکاؤ نظر نہیں آتی۔ مقابلہ اور وجہ ترجیح نے شعر کی ایمانی تاثیر کو کس قدر بڑھا دیا۔ پھر مزاد ادا کی طرف کی داد نہیں دی جا سکتی شعر ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں تے کوئے بہشت وہی نقشہ ہے دے اس قدر آباد نہیں  
 غالب کی ایک پوری غزل مقابلوں سے رہے جن سے معافی کی مناسبتیں بڑی خوبی سے واضح ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ مزید اودایا کی اشکال کا ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی ردیف آزمائش ہے رکھی ہے۔ آزمائش میں یک طرح کا معنوی مقابلہ تو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز یا شخص کی آزمائش کرتے ہیں تو کوئی سیار ضرور سامنے رہتا ہے جس سے مقابلہ مقصود ہوتا ہے۔

قیس اور فرہاد سے اپنا مقابلہ کس بلند آہنگی سے کیا ہے۔  
قدو گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے  
قیس و کوہن کو قدو گیسو سے واسطہ پڑا اور ہم جس محفل میں ہیں وہاں  
قدو گیسو کے امتیازات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں دارورسن سے حکم  
پر آزمائش ممکن نہیں۔ پھر خود فرہاد کے حوصلے اور اس کی نیروئے تن کا مقابلہ  
کیا ہے۔

کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحان آخر ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے  
یعنی نیروئے تن کی آزمائش میں تو اس کی کامیابی غیر مشتبہ ہے اس لئے کہ اس  
نے جوئے شیر کھود ڈالی لیکن حوصلے کے امتحان میں وہ پورا نازا اور شیریں  
کے مرنے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔

دوسری جگہ اور مرزائے فرہاد پر چوٹ کی ہے کہ تیشہ مار کر مر جانا معمولی  
بات ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ عام رسم کے خلاف شیریں کچھ جانیے کی خبر سن کر  
زندہ رہتا اور جب تک زندہ تھا اس وقت تک شیریں کے تصور کو اپنا سر پایہ  
نظم بناتا۔

آیت بنیر مرد سکا کوہن اسے رگشتہ و خمار رسوم و قیود تھا  
پھر فرہاد کو طعنہ دیا ہے کہ اس نے رقیب کے لئے عشرت کدہ تعمیر کیا اور  
خود سر بھڑ کر مر گیا۔ ہم اس کی نگو نامی کے غافل نہیں۔  
عشق و مزہ و رہی عشرت کدہ خور کیا تو ہم کو تسلیم نگو نامی و سر ہاد نہیں  
آزمائش عالی غولی کے چند اور شرط ملاحظہ طلب ہیں۔

نیم مصر کو کیا پیر کنساں کی ہوا خواہی اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے  
نیم مصر اور یوسف کی بوئے پیرہن کا اس طور پر ذکر کیا ہے کہ گویا دونوں ایک  
ہو کرے سے الگ آئے ملتے موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیم مصر کو پیر کنساں سے

بھلا ہمدردی کیوں ہونے لگی؟۔ تو محض ضمنی طور پر تھا کہ انھیں یوسف  
 کی بوئے میوین پہنچ گئی حقیقت میں نسیم مصر تو یوسف کی بوئے میوین کی  
 آزمائش کرنا چاہتی تھی کہ اس کے لقمہ فاق کی حد کیا ہے۔  
 ایک طرف محبوب کی آمد ہے اور دوسری طرف اہل انجمن کے صبر و  
 شکیب کی آزمائش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر نے صبر و شکیب کو  
 آزمائش اور مقابلے کی خاطر اشخاص کی صورت دیدی ہے کہ دیکھیں ان پر  
 کیا گزرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ مائل تھے

شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے  
 دل وابستہ کو محبوب کی زلف پر شکن سے اس طمع دست و گھڑیاں کیا ہے۔  
 پڑا لے دل وابستہ بتابی سے کہا جاوے مگر پھر تاب زلف شکن کی آزمائش ہے  
 شاعر دل وابستہ کو خطاب کرتا ہے کہ تو خواہ مخواہ رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارا ہے  
 اس کی زلف پر شکن کے پیچ و خم ایسے نہیں ہیں کہ تو ان سے رہائی پاسکے۔  
 تو پہلے بھی آزمایا جا چکا ہے اور تمنا اب پھر اس کی آزمائش چاہتا ہے۔ تیری اس  
 کوشش کا نتیجہ معلوم ہے۔ یعنی تو بھی بھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔  
 مقطع میں ایک تو استغناء انکاری کی خوبی ہے اور دوسرے معشوق کی آمد  
 اور چرخ کہن کے نئے فتنوں کا مقابلہ ہے۔

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مینی ہرگز نہ آئیں گے وہ ایسے وعدے تو ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

(۱) اسی مضمون کا مرزا کا دوسرا شعر بھی ہے

تھا اگر نیران شرہ یار سے دل تادم مرگ دفع پیکان بلا کس قدر آہاں بجا

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ محض ان کے وعدہ کی وجہ سے ہم پر اور کون کون سی  
نئی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک طرف ان کے آنے کا وعدہ ہے اور دوسری  
طرف چنچ کہن کے نئے نئے فتنوں کی آزمائش۔ استفہام الکاری اور مقابلہ  
دونوں کے باعث شعر کی ندرت اور حسن ادا کی خوبی نمایاں ہو گئی۔

اس قسم کے مقابلوں کی غائب کے ہاں بیسیوں شاہیں موجود ہیں اور  
محاسن کلام میں گراہل ہیں۔ ایک جگہ فارسی میں اس ضمن میں عجیب و غریب  
خیال ادا کیا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ نہ فارسی میں اور نہ اردو میں۔  
مصنوع یہ باندھا ہے کہ دعویٰ گو رضا میں ہر شخص اپنے مقصود در نہیا کی جانب  
رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ گویا کہ اس منزل میں رشک و فاکا منظر نظر آتا ہے  
حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ  
باپ اور بیٹا راہ شوق میں مسابقت کے لئے کوشاں ہیں۔ اگر باپ آتش غرور  
کی آزمائش میں اپنے کو ڈالتا ہے تو بیٹا بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ وہ باپ کی  
چھری کے تلے اپنا گلارہ رکھ دیتا ہے۔ شاعر دو شعروں میں رمز ایما بلاغت و  
ایجاز و حسن ادا کا کمال دکھا دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

رشک و فامگر کہ یہ دعویٰ گو رضا ہر کس چہ گو نہ در پئے مقصود میرود  
فرزند زیر تیغ پدری نہد گلو مگر خود پدر در آتش غرور می رود  
غائب کے فارسی کلام میں اس قسم کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں صرف  
ایک اور نقل کی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم کے آگ میں نہ جلنے کی تلمیح پیش کرتے ہوئے ان سے اپنا مقابلہ  
کیا ہے کہ ان کا تو یہ معجزہ تھا کہ آگ میں نہ جلے لیکن میرا معجزہ یہ ہے کہ میں بغیر  
شعد و شدر کے جل رہا ہوں۔

شعیدہ کہ آتش نسوخت ابراہیم یہ بین کہ بے شدر و شعلہ می توانم سوخت  
شاعر نے یہ بات غیر مذکور رکھی ہے کہ آیا حضرت ابراہیم کا آگ میں نہ جلنا

بڑا معجزہ تھا یا میرا بغیر آگ کے جلنا۔ اس تقابل کے علاوہ شفیقہ "اور بہ بین" کے لفظی تقابل نے بھی شعر میں لطف پیدا کر دیا۔

میر صاحب نے محبوب کے دہن سے غنچہ کا مقابلہ اس طرح کیا ہے۔  
 بسج پوچھو تو کب سے لگا اس کا سادہن غنچہ تسکین کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے  
 دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

کیا غنچہ اس کے منہ کی لئے غنچہ نقل کر لے تو تو نہ بول نظام بول آتی ہے وہاں سے  
 محبوب کا مقابلہ گل سے اس طرح کیا ہے۔

ست ممتحن باغ بولے غیرت گلزار مغل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آئے  
 غالب نے اپنے اسی مضمون کے ایک فارسی شعر میں عبیب و غریب ندرت  
 پیدا کی ہے۔

شعر ہے۔

گلت را نواز گشت راناشا تو داری بہارے کہ عالم ندارد  
 وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تیرا مغل لطف گویائی رکھتا ہے  
 اور تیری ترگی لذت دید سے آشنا ہے۔ تیری بہار ایسی پُر کیف ہے کہ فطرت  
 کی بہار میں یہ طر فگی کہاں!

اردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی تصورات کے مقابلے کی مثالیں  
 ملتی ہیں جن سے حسنِ کلام کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں پر  
 اکتفا کیا جاتا ہے۔

دآغ نے محبوب کے چلنے اور ٹھہر جانے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے  
 کہ آپ خود دونوں حالتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں ماسلوب بیان کی  
 بڑی لطافت پنہاں ہے کہ خود مقابلہ کرنے کے بجائے آپ کے ذوق پر اس  
 کو چھوڑ دیا۔ شعر ہے۔

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب تھا

دوسری جگہ محشر کا مقابلہ محبوب کی ٹھوکر کے فتنے سے کیا ہے۔

وہم ہے حشر کی سب کچھ ہیں یوں ہے یوں ہے

فتنہ ہے اک تیری ٹھوکر کا ٹکر کچھ بھی نہیں۔

(دماغ)

سعد جزا اور شب بھراں کا مقابلہ ملاحظہ طلب ہے۔

آتا جو یہاں روز جزا سے شب بھراں بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا

(دماغ)

قافی نے محبوب کی رعنائی اور اپنی نگاہ کی شوخی کا مقابلہ کیا ہے۔

بھلا شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں

(قافی)

کبھی عاشق کدل کا مقابلہ محبوب کے جلوں سے کیا جاتا ہے۔

ترے جلوں کو دیکھیں اور میرے دل کی طرف دیکھیں

کہاں ہیں اتصال موج و ساحل دیکھنے والے

(جگر)

ہمارے غزل گو شاعروں نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور محنت

خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے اور اس طرح حق ادا کا ایک

خاص پہلو نکالا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں صورتیں جو گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی

ضمن میں زہد کی برائی اور رندی اور شراب و مسکدہ کی تعریف کی گئی ہے۔

یہ سب موضوع ایسے ہیں جو غزل کی ساخت میں نہایت خوبی سے

کچھتے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ رمز و ایما کی تکنیک کو ان سے خاص مناسبت

ہے اور دوسرے اس لئے کہ غزل گو شاعر کا دل انسانی مدد دی کے

جذبات سے ملو ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پس منظر انسانی زندگی جلد بکھو

سے بالاتر ہے۔ عارف کو ہر کہیں ذات بے ہمتا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سب

کو اسی کی تلاش ہے اور سب اسی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ ممکن ہے  
 رفتار میں فرق ہو اور راستے بظاہر الگ الگ ہوں۔ بقول حافظ۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہر اعدا رہند چوں ندیدند حقیقت اس افسانہ زندہ  
 شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر کا مزاج اور انداز طبع ادعا پسندی  
 کی کبھی حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علمبردار زندگی کے ہر لمحہ حقائق  
 کو من مانے طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطہ نظر سے انھیں سمجھنا  
 چاہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نقطہ نظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور نہ  
 سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے موائے احتساب نفس کے کمر میں اور  
 ادعا پسندی کے جلو میں تعصب اور تنگ نظری کا قافلہ چلتا ہے جو ہر اس  
 تصور کو اپنے پاؤں تلے روندتا جاتا ہے جس میں رواداری اور انسانی  
 محبت کی بو ہو۔ یہ ادعا پسندی ایک زمانے میں مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی  
 اسی لئے ہمارے شاعروں نے زہد پر چوٹیں کیں اور اس کی چوریاں ایک ایک  
 کر کے دکھائیں اور تجریدی یا مذہبی اصول سے زیادہ محبت اور انسانیت کو اہمیت  
 دی۔ انھوں نے ہمارے ادب میں کم و بیش وہی کام کیا جو مغربی ادب کی  
 تاریخ میں ہیومن ازم کی تحریک نے انجام دیا تھا اس تحریک نے رواداری  
 و وسیع مشربی اور توملزن خیال کی روایات قائم کیں جن سے اہل مذہب کے ذوق  
 کی تربیت ہوئی۔ ادعا پسندی اپنے رنگ ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے۔ کچھ عرصہ  
 قبل اس کا رنگ مذہبی تھا اور آج سیاسی ہے۔ غزل گو شاعر کے اشاروں  
 کا دونوں پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

گمناہ کے تصور کا تعلق جبر و اختیار کے اصول سے ہے جو نہ صرف اسلامی  
 علم کلام کا معرکہ آلا مسئلہ رہا ہے بلکہ قدیم اور جدید ادب عالمیہ میں کسی نہ کسی  
 شکل میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہرگز بجلی میں جبر و اختیار اور خیر و شر  
 کی کشمکش ضروری ہے۔ غزل گو شاعر کو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ

انسانی آزادی محدود اور مشروط ہے۔ انسان کو بعض دفعہ خود اپنی فطرت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کبھی یہم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو ورثہ میں خاص قسم کا مزاج ملتا ہے جو اس کی فطری زندگی پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر اس کی قوت ارادی نہ ہوتی تب بھی وہی نتائج پیدا ہوتے جو ارادہ رکھنے کے باوجود وقوع پذیر ہوئے۔ خود ارادہ ان صلاحیتوں اور رجحانوں کا مدد و معاون بن جاتا ہے جو پہلے سے مقرر تھے اور جن کی وجہ سے وہ کسان کسان گناہ اور شر کے من میں پھنسا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ گناہ سے انسان متاسف اور پشیمان اس لئے ہوتا ہے کہ اس کا اندرونی اخلاقی احساس اس کو بتاتا ہے کہ تیرے ارادہ میں آزادی کی صفت موجود تھی لیکن پھر بھی تو نے اس کی روشنی میں قدم نہیں اٹھایا۔ اگر یہ تاسف کا احساس نہ ہو تو زندگی اپنی تکمیل کی کوشش نہ کر سکے۔ غزل گو شاعر گناہ نگار سے ہمدردی ضرور رکھتا ہے لیکن خود گناہ یا شر کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن کبھی حافظ کی طرح جب وہ شیخ نگاری پر آتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے۔

گناہ اگرچہ نبود اختیار ماحافظہ تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است  
ہمارے شاعروں نے عالم گناہ میں بھی رحمت خداوندی کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ گناہ کا احساس انسانی نفس کے تزکیہ کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے اور دل کی پاکیزگی اشک تداومت سے جلا پاتی ہے۔ ہر گناہ اپنے جلو میں درد و غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتا ہے جو غزل گو شاعر کے دل کو عزیز ہوتی ہیں۔ اس لذت الم کے باعث اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کے گناہ اس کی ذاتی ملکیت میں جھینس کوئی بھی اس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ ان کی یاد کو سنت سنت کے رکھتا ہے کہ اس کے نزدیک یہی حاصل حیات ہے وہ اس یاد کی بنیاد پر محبت کی عمارت بناتا ہے۔



عالم گناہ میں بھی ہمارے شاعر کو امید کی تجلیاں دور سے نظر آتی ہیں جو حسن عمل کی ضامن ہوتی ہیں۔

ترے کرم سے کیا سناں ہر عالم گناہ کا سیاہیاں امید کی تجلیاں لئے ہوئے  
(قافیہ)

عالم گناہ اور اس کے مقابل رحمت خداوندی کے ضمن میں بعض نہایت لطیف شاعرانہ نکات و معانی ہمارے غزل گو شاعروں نے پیدا کئے ہیں۔ پندرہ مثالیں  
لاحظہ ہوں۔

غالب تو یہ ہے زاہد رحمت کے دور ہوئے درکار واں گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں۔  
(تیسرا)

رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہد شیخ اے بے وقوف جائے عبادت گناہ کر  
(تیسرا)

مری نجات کچھ ان واعظوں کے ہاتھ نہیں  
بڑا کریم ہے جس کا گناہ گار ہوں میں  
(معاذ)

کوسے غرور نہ طاعت پہ کہد و زاہدے مرے کریم کو مذگناہ پسند ہوا  
(اور یہ لکھنوی)

صبرے زاہدناہم نے خواروں کا بخشے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا  
(داغ)

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر  
جرم اس نے کئے ہیں مجھے غفار سمجھ کر

(تیسرا)

لے حافظ کا شعر ہے۔

بیار بادہ بخور زان کہ پیر میکدہ دوش بے حدیث غفور و رحیم و رحمن گنت

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا کام آ پڑا ہے رحمت پروردگار سے  
(مائل)

کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معنوم رحم کرتا ہے باندازہ عصیاں کوئی  
(اصغر)

رحمت حق نے بہت دیکھ لی ایساں کی بہار

اسب ذرا سامنے رعنائی عصیاں کر دیں  
(اصغر)

مری ہر معیشت پر مطلع انوارِ رحمت فضا دل گناہوں سے منور ہوتی جاتی ہے  
(فانی)

اتید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا  
(فانی)

یہ کیا جانے زاہد کہ اے آبِ رحمت مے جامِ پیرے کھنگلے ہوئے ہیں  
(حسرت)

نہو اسکی خطا پوشی پہ کیوں ناز گز گاری نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سکاری  
(حسرت)

فرقِ رحمت ہو کے دیکھا جوشِ دریائے کرم عفو نے دھبہ چھوڑا دامنِ تقصیر میں  
(نائبِ کھنوی)

مجھ سے گناہ گار پر یہہ بارشِ کرم نہ دیکھتا ہوں رحمت پروردگار کا  
(جگر)

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیلِ مجھ سے آہ کیا نہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو  
(جگر)

مبارک ہو مبارک ساحلِ رحمت پُر مینا قدم مارا توڑ گیا پیرِ جادو یا کھصیاں کو  
(نیکانہ)

بعض شاعروں نے لطف گناہ کو بڑھا چڑھا کر یعنی یا مثالی شکل میں پیش کیا ہے۔ کبھی گناہ کی یاد دل میں ایسی چٹکیاں لیتی ہے کہ سزائے موت کے بجائے شاعر حشر میں بھی اسے اپنے سینے سے لٹائے رکھنا چاہتا ہے۔  
 سب اہل حشر جب اپنے گئے گراپائیں گے ہڑامزہ ہو جو مجھ کو مرگناہ ملے  
 جگہ کا شکر ہے۔

بھڑکار ہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک پھیلنا رہا ہوں رحمت پروردگار کو  
 غالب نے گناہ کے معنوں میں بھی اپنی شرحی کی الگ راہ نکالی ہے۔ وہ باری تعالیٰ سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہے۔  
 ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد  
 یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک اور جگہ اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔  
 آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے سے گناہ کا حساب لے خدا نہ مانا  
 گناہ کرنے میں اپنے حوصلے کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہتا ہے کہ  
 باوجودیکہ دریائے معاصی تک آبی سے خشک ہو گیا لیکن میرا دامن کا سرا  
 بھی تر نہ ہونے پایا۔

دریائے معاصی تک آبی سے موا خشک میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا  
 (غالب)  
 دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

بقدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی بھروں یک گوشہ دامن گرا ب ہفت دریا ہو  
 ایک جگہ غالب ذات باری سے پوچھتا ہے کہ تیری رحمت کس پردہ میں بیٹھ کر  
 آرایش میں مصروف ہے۔ ذرا وہ ساتے تو آئے۔ وہ خود ہماری مجبوریوں کی  
 عذر خواہی کو بے گئی اس واسطے کہ اسی کے بھروسہ پر تو گناہ کر نیکی جرات ہوئی۔  
 کس پردے میں ہے آئینہ پردہ ازلے خدا رحمت کہ عذر خواہ بے سواں ہے  
 ایک جگہ غالب نے عذر گناہ اس خوبی سے کیا ہے کہ گناہ کی ذمہ داری خود

اس پر نہیں بلکہ خالق حیات پر پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمناائے گلشن کا یہ  
لازمی اقتضا ہے کہ دل میں تمنائے چیدن پیدا ہو۔ اب اگر تمنائے چیدن  
گناہ ہے تو اے بہار کے پیدا کرنے والے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم گناہگار ہیں  
تمناائے گلشن تمنائے چلبہ کن  
بہار آفرین گناہ گار ہیں ہم (نسخہ حمید یہ)

مسجد و میخانہ یا کعبہ و مسکدہ کی رمزی علامات بھی اس ضمن میں قابل  
ذکر ہیں کہ زہد و عتقاہ کے تصورات ان کے حلقہ وابستہ و پیوستہ ہیں  
ظاہر ہے کہ مسجد و میخانہ سے مسجد و میخانہ مراد نہیں اور دکنسیر  
و مسکدہ سے کعبہ و مسکدہ مراد ہیں۔ یہ لفظ رمزی اور ایمائی اغراض کے  
لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے غزل گو شعروں نے اپنے قلب و نظر کی  
وسعت کے اظہار کے لئے ان لفظوں کو علامات کے طور پر برتن ہے۔ چند  
مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔  
میر صاحب کا شعر ہے۔

برخیز جس کے حسن سے مسجد ہے اور دیر ایسا جنوں کے زیچ وہ اند کوں ہے  
غائب نے دیر و حرم کو واما ندگی شوق کی منزلیں قرار دیا ہے۔  
دیر و حرم آئینہ سکار تمنا واما ندگی شوق تراشے ہے بنا ہیں  
(نسخہ حمید یہ)

دوسری جگہ اہل کشت کو یقین دلایا ہے کہ اگر میں کعبہ میں رہنے  
لگا ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنے پرانے رفیقوں کی  
اہل کشت کے حق صحبت کو بھول گیا۔ استفہام انکاری سے شعر کی خوبی  
دو بالا ہو گئی۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں  
بھولا ہوں حق صحبت اہل کشت کو؟  
(غالب)

داغ نے زاہد کو اس طرح طعنہ دیا ہے۔  
 چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھاننے زاہد  
 فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں  
 (داغ)

کبھی کعبہ کی راہ اس لئے مجبوراً اختیار کی جاتی ہے کہ دیر کی راہ نہ مل سکی۔  
 دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی کفر جب کفر نہ بنتا ہو تو ایمان کو دیں  
 (اصغر)

اگر تقویٰ کی طرف طبیعت مائل نہیں تو پھر رندی ہی سہی۔  
 دل گر رکھا خجالے وساعری ہی گھر نفس جاوہ سرخسراں تقویٰ نہ ہوا  
 (غالب)

عشق اور تقویٰ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کے ساتھ جیتے ہیں خصوصاً  
 تقویٰ کا جو عمرانی پہلو ہے اس سے عشق کی اکثر ٹکڑ ہو جاتی ہے۔ سدا  
 کا شمر ہے۔

ہر کجا سلطان عشق آمد نہاند قوت بازوئے تقویٰ را محل  
 میر صاحب نے ایک موقع پر اہل مسجد کی غلط فہمی بڑے لطف سے  
 رفع کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں دیدہ و دانستہ  
 مسجد میں آیا ہوں بلکہ جا کہیں اور رہا تھا بہک مگر مسجد میں پہنچ گیا۔  
 کہتے ہیں۔

مستی میں لہزش ہو گئی معذور رکھا چاہئے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں ہکا بکا  
 چونکہ بے خانہ بند تھا اس لئے بدرجہ مجبوری مسجد میں رات گزار رہی جاتی ہے۔  
 مائل ہیں قورات کہیں کے کائناتی مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے  
 (مائل)

مخل و غط اور میخانہ کی صحبت کا مقابلہ قابل ملاحظہ ہے۔  
 عقل و غط تو تا ویر رہے گی قائم یہ ہے سے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں  
 (مائل)

۲۲۴

بعض اوقات کعبہ سے اکتا کر بت خانہ کی طرف قدم اٹھنے لگتے ہیں مومن کا شعر ہے۔

کعبہ سے جانب بتخانہ بھرا یا مومن کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زہنار لگا  
خواجہ میر درد نے جو اپنے زمانے کے بڑے صاحب باطن گذرے ہیں،  
طریق زہد کا پول اس طرح کھولا ہے۔

غیر از طال زاہد کیا ہے طریقی زہد میں دل نہ منتفعہ جس جگہ کو چڑے فروش ہے  
غائب ہے بھی زہد پر جو پیش کی ہیں۔ اس کو زاہد سے یہ شکایت ہے کہ وہ  
نیکی نیکی کی خاطر نہیں بلکہ صلہ کی توقع میں کرتا ہے۔ عبادت و اعمال کا  
محرم دنیا کی فلاح یا اخروی نجات نہ ہونا چاہیئے بلکہ رضاۓ الہی۔ اجر  
کی طمع خلوص کے منافی ہے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہو مگر چریائی یاداش عمل کی طمع خام بہت ہے  
دوسری جگہ اسی مصنف کو اور زیادہ شوخی سے ادا کیا ہے۔  
طاعت میں تارے تھے و آنجیس کی گد دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کر  
ایک موقع پر کہا ہے کہ زاہد جس باغ رضواں کی تعریف میں اس قدر رطب  
اللسان ہے اسے ہم مدتوں سے بھلا نہ ٹھکے ہیں اور اس لائق بھی نہیں سمجھتے  
کہ اس کا خیال بھی دال میں لائیں۔

تائیش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا  
وہ اک گلہ سستہ ہے ہم بے خردوں کے طاق نیاں کا  
چونکہ حور کی طمع زاہد کی عبادت کی محرک بنی ہے اس لئے کیا لطف ہو اگر وہ  
جنت میں نہ جانے پائے اور اس کے ارمان دل کے دل ہی میں رہیں۔

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے  
سیر توجہ ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے (دراغ) ہے  
کبھی غزل گو شاعر اپنی رندہ کو زاہد و داعیہ کی ریاکاری کے مقابل لے آتا ہے

اس مقابلہ سے دونوں کیر کڑا نکل واضح ہو جاتے ہیں۔ زاہد جو حسن و عشق کے مزے سے نا آشنا اور مشاہدہ فطرت کے کیفیت سے یکسر بیگانہ ہے اپنے تئیں وہ ظاہر کرتا ہے جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ سوز و ساز حیات سے محروم ہونے کے باعث وہ اپنے عمل میں کبھی حقیقی ہم آہنگی نہیں قائم کر سکتا۔ محض عبادت روحانی تسکین کے لئے کافی نہیں جب تک عقیدت اور ایسے عمل کی تڑپ دل میں پیدا نہ ہو۔ زاہد کی روح نامکمل اور اس کی نظر مارا رہتی ہے اور وہ اپنے نفس کی قریح اور تہذیب پوری طرح نہیں کرنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریاکاری کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس کے دل میں چھپ چھپ کر چٹکیاں لیتی ہیں۔ وہ بھی غنا کا مرتکب ہوتا ہے لیکن وہ اس پر اپنے زہد و اتقا کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ سیرت کی اس نامہموری کو حافظ نے یوں ظاہر کیا۔

واعظان کس جلوہ بر محراب و مہری کنند  
 بچوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند  
 مشکله دارم ز دانشمند مجلس بازیگس  
 توبہ فرمایان چرا خود توبہ محکم تری کنند  
 اسی لئے اس نے زاہد کے قول و فعل سے پناہ مانگی ہے۔  
 از قول زاہد گردیم توبہ  
 وز فعل عابد استغفہ اللہ

غائب نے ایک جگہ واعظ پر کیا خوب چبھتی کسی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں حسب عادت میخانے کے دروازے سے نکل رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت واعظ وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ کسی کے کہنے پر یقین نہ آتا لیکن جب خود اپنی آنکھوں دیکھی بات ہو تو انکار کیسے کیا جائے۔ شر ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ  
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے  
داغ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

یہاں سے کہ قریب تھی مسجد بھلے کو داغ  
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟

ہمارے غزل گو شاعر صرف دوسروں ہی کی تنقید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اپنا  
احساسات نفس کرتے ہیں اور ضرورت ہو تو اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔  
اپنی بات و حدیث دیگران بیان کرنے میں یقیناً بڑی بلاغت ہے لیکن اس سے  
بھی بڑھ کر بلاغت اس میں ہے کہ آپ دوسروں کی بات اپنے اوپر ڈال کر کہیں  
شیفہ نے اپنے اس شعر میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔

وہ شیفہ کہ دھوم تھی حضرت۔ کئے زند کی  
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

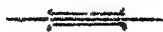
میر صاحب ہوں یا غالب، مومن ہوں یا دوق، حسرت ہوں یا جگران سہول  
میں تغزل کے بعض شکر اجزا ملتے ہیں۔ وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربے  
کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو۔ ایک لمحہ کا تجربہ  
اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصے تک محسوس کیا گیا ہو۔ اور  
غبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے  
لئے زیادہ تر وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو تن و عشق کی طلسمی دنیا میں  
پیش آئیں کہ اس کے لئے یہی اہم اور ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے  
کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جاسکتا اور نہیں کرنا چاہیئے  
چونکہ اثر آفرینی میں ایہام مقصود ہوتا ہے اس لئے تغزل میں رمز و ایما  
کا اسلوب برتنا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی  
ہے اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے



ہاں دوسروں کے مقابلے میں خادجیت کا عنصر زیادہ شام ہے جیسے معنی  
اور جرات وغیرہ۔ ان دونوں کا تفضل اعلیٰ پایہ کا ہے۔ لیکن ان کو وہ  
رتبہ کبھی نہیں ملتا جو تیسری غالب کو نصیب ہوا۔ خادجیت لازمی طور پر  
بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے، جو تفضل کے لئے سازگار  
نہیں جس کا خمیر رمز ابہام سے بنا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رمز ابہام اس لئے عزیز ہیں کہ وہ جس  
مقام کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے  
مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول  
فرانسیسی مفکر گو یو: "ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت  
خارجی عالم کی اشیا جتنی ہوئی چاندنی میں عجیب و غریب پراسرار کیفیت  
پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کے اندوخال ہی بدل جاتے ہیں۔ وہ شخص جو مکان کی  
پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے  
ان کو چاہیئے کہ دن کی روشنی میں انھیں دیکھے۔ لیکن وہ شخص جس کو مطلوب  
انہیں وہ چاندنی رات میں مکافوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا  
لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ  
حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھونا پسند کرتا ہے۔ دھوپ  
چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو ہٹھکے  
اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے چشتی  
دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں پرلہرار  
کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے صبح اور شام کی مبہم کیفیت روحانی تزکیہ  
کے لئے موزوں خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے  
لئے عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ فطرت کا پرسوں ابہام جذبات میں تحریر کی آمیزش  
کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگیتوں اور کیفیتوں

کی تکمیل کے لئے سوائے اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی اور چونکہ جذبات میں ذہنی طور پر مبہم سا تفسیر ہوتا ہے اس لئے جذبات کی زبان کو بھی یہ زیب دیتا ہے کہ وہ مبہم ہی رہے۔ تعین جذبہ کی فطرت کو مجروح کرتا ہے۔ تنزل کے ایمانی ابہام کی بھی یہی توجیہ ہے۔ رمز و ابہام اس کا عیب نہیں، مگر ہے۔ چونکہ ذوق حسن اور لطافت جذبات کا اظہار کنایہ و ایما ہی کے ذریعہ اثر آفرین ہو سکتا ہے اس لئے ہمارے غزل گو شاعروں نے چون کا رانہ اسلوب اختیار کیا وہی اس صنف سخن کے لئے موزوں تھا اور اس سے غنائی اور عشقیہ شاعری کی قدریں معین ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان قدروں کا معین ہو جانا کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر زمانے کی تنقید اپنی نئی بصورتوں سے ان کی باز آفرینی کرتی رہے۔ اس باز آفرینی کی بدولت روح تنزل کبھی فرسودہ یا مردہ نہیں ہوگی اور اس کے سد ابہار پھول شام جہاں کو ہمیشہ معطر کرنے رہیں گے۔



انتخابات

## ولی اور نگ آبادی

تجھ لب کی صفت لعل بختاں کے کہوں گا  
بے صبر نہ ہو لے ولی اس درد سے ہر گاہ  
جدا دو ہے تیری تین غزالاں کے کہوں گا  
جلدی سے ترے درد کے درماں کے کہوں گا

جس وقت لے سبز بجن تو بے حجاب ہو گا  
مت آئینہ کون دکھلا انا جمال روشن  
تجھ ہر ذرہ تجھ جھلک سون چوں آفتاب ہو گا  
تجھ میکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہو گا  
تجھ آنکھ دیاں کے دیکھے عالم خراب ہو گا  
مجھ کو ہوا ہے معلوم لے مت جام خون

آج تیری بھواں نے مسجد میں  
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا  
آرزوئے چشمہ کوثر نہیں  
ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا  
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا  
دیکھ رتبہ دیدہ دیدار کا  
منہ گل مسند شبنم ہوئی

ملا ہو گلبدن جس کو اسے گلشن سوں کیا مطلب  
جو پایا وصفت یوسف اس کو پیرا بن سوں کیا مطلب  
ولی جنت میں رہنا ہی نہیں درکار عاشق کوں  
جو طالب لامکان کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب

اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر  
اے ولی غیر آستانہ یار  
بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر  
جب سائی نہ کر خدا سوں ڈر

زلف تیری کیوں نہ کھا پیسج و تپا  
 رحم کر اس پر کہ آیا ہے توجہ لی  
 حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر  
 درد دل کا تجھ کوں سماں بوجھ کر

دل کو ہوتی ہے سخن بے تاب  
 زلف کو ہاتھ لگایا نہ کر

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ فلوت میں گلِ روضوں  
 خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

جسے عشق کا تیسرا کاری لگے  
 اوسے زندگی جاگ ہی بھاری لگے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو  
 کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ عمرانی

کہاں ہے آج یارب عبودہ مستانہ ساقی  
 کہ دل سے تاب جی سے صبر سرے ہوش لے جاوے

تاخیر سے ہوئے گلاب اس کے عرق سے  
 ہرگز سخنِ سخت کو لائے زبان پر  
 جس پر مٹنے کا بار وہ گل سر ہن آئے  
 جس دھن میں ایک باعدہ نازک بدل لے

## سمرانج اورنگ آبادی

موت سے گم ہوا دل بیگانہ سراج شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

غیر تخیل عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی  
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

خیر بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برنگی  
نہ خرد کی بخیہ نگری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

جلی سب غیب سے اک ہوا کہ جن مرور کا جل گیا  
نہ ایک شاخ ہنال غم جسے دل کہیں سوہری رہی

نظر تامل یار کا گلہ کس زبان سے بیان کروں  
کہ شراب حسرت و آرزو غم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجیب گھڑی تھی کہ جس گھڑی یاد میں نسو عشق کا  
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قلب سے یہاں ہوا  
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو  
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

## شاہ شہارک آہرو دہلوی

مین میں نین جب بلایئے گا      دل کے اندر مرے سہائے گا  
آئندہ ہر سہریچ مرتا تھا      مجھ دکھا کر اسے جلائے گا

نیک باغ میں شتاب چلوئے بہارِ جن      گلِ چشم ہو رہا ہے تہائے نظارِ کون

سرے لگا کے پاؤں تک لہو ہوں      یاں تک تو فنِ عشق میں کامل ہوا ہوں میں

نہ دیوے لے کے دل وہ جہدِ مشکیں      اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

افسوس ہے کہ مجھ کو نہ یارِ بھول جاوے      وہ شوق وہ محبت وہ یارِ بھول جاوے  
یوں آبرو بناوے دل میں مزارِ باتاں      جب تیرے آگے آوے گفتارِ بھول جاوے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے      وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

کیا شیخ کیا برہن جب عاشقی میں آوے      تہی کرے فراموش دِ تارِ بھول جاوے

## ہرزا جان جانان منہر دہلوی

یہ حسرت رہ گئی کس کس سے زندگی کرتے  
اگر موتا چین اپنا گل اپنا باغبان اپنا  
قیسیاں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ غواہی کی  
مجھے ناحق ستایا ہے یہ عشق بد نگمان اپنا  
مرا جی جلتا ہے اس لیل بے کس کی غربت پر  
کہ جس نے آس کے پر گل کے چھوڑا آئیاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا  
لیکن اس جو رو جفا کا بھی سزاوار نہ تھا  
لوگ کہتے ہیں مورا منہر بے کس افنوس  
کیا ہوا اُس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا  
صیاو کی بغل میں تک دم لیا تو پھر کب

ہم نے کی تو یہ اور دھویں چاتی ہے بہا  
ہم نے گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب  
پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار  
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار  
شاخ گل مٹی نہیں پریدوں کو باغ میں  
اتنے اپنے کے اشارے سے جاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہوں نصحت اے صیاو ہم  
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

مت احتیاط کر لے نو بہار تو ہم سے  
چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

اوس گل کہ بھیجنا ہی مجھے خط صبا کے لئے  
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ساتھ



برگِ حنا او پر لکھو احوالِ دل مرا      شاید کہ جا لگے وہ کسی دلِ ہاکے ہاتھ  
منظرِ چھپا کے رکھ دِلِ نازک کو اپنے تو      یسٹیشہ بیچا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الہی مت کو کے پیشِ رخِ انتظار آئے      ہمارا دیکھے کیا ماںِ محبوب تک ہمارا ہے

خاتیرے کفِ پاکو نہ اس شوخی سے سہااتی  
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں اور غموں کی نیند کیوں جاتی  
الہی درد و غم کی سرزمین کا حال کیا ہوتا  
محبت مگر ہماری چشمِ تر سے منہ نہ برساتی

خدا کو اب تجھے سو پناہ سے دل      یہ ہیں تک بھتی بیماریِ زندگانی

## شاہِ حاتم

ہاتھ مت کھینچ جنوں تجھ کو مرے سر کی قسم      ایک جب تک بھی ہے تارِ گریبان کی چٹ  
حسن اور عشق تے فیضِ قدم کے حد تے      دونوں آباد ہیں ہم گلشنِ وہم ویرانہ  
کہتے ہیں بھی مہربتاں خوب نہیں ہے      سنتا ہی نہیں یہ دلِ گمراہ کسی کی

## میر عبدالحی تالپاں

میں اپنے دل کو غنچہ تصور کی طرح      یارب تجھ کو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا  
— ہم بے کسی پر اپنی تہذیبوں کو لیا کریں      دل سافین ہوتے ہمارا جدا ہوا

حرم کو چھوڑ ہوں کیوں بجائے میں شیخ      کہیاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدا کی کا

اڈا اے صبا خاک میری اگر تو      تو کو پے میں اس بے وفا کے ہی لے جا

کس کس طرح کی دل میں گذرتی ہیں حسرتیں      ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

کہتے ہیں اثر ہے گاروئے میں یہ ہیں باتیں      اک دن بھی نہ یاد آیا روتے ہی کس راتیں

غم وصل میں بے ہجر کا ہجر میں وصل کا      ہر گز کسی طرح مجھے آرام ہی نہیں

سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آیاں میں      کیا بیلوں نے دیکھو دھو میں چائیاں میں  
کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے      اب کس کے ساتھ چایاں ہے دل بایاں میں

پھر بہار آتی ہے دیوانہ کی تدبیر کرو      بے خبر کیا ہوتا سبانی اسے زنجیر کرو  
ہوں مقرر میں گنہ گار کہ چاہا تم کو      خوب رویاں مجھے من مانسی آئندہ کر کرو

مصل کے بیج سن کے مے سوز دل کا مال      بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

## محمد امان نثار

ہے جو سینے میں جکڑ دہچھے ہے انگار ادا  
دل جو پہلو میں ہے بیابانِ عہ پار ادا  
آنکھ لگتی ہے کوئی پل تو ہیں ہاں اس کا  
نالہ خواب میں جو جلتے ہیں نظار ادا  
دل کہیں دیکھیں انہی کہیں جان بھیں  
گوشِ چرخ میں بر لیک ہے اور ادا

امیدِ شفا ہے لبِ جانِ بخش سے اس کو  
شمرِ سندھ عینِ نہیں بیمار ادا  
ہم عشق میں تم حسن میں مشہور ہیں دونوں  
ہے ذکر ہمارا کہیں اذکار ہمارا

کھول کے بندہ قبا یوں نہ پھرایا کچھے  
گل کی سنسلی پر بھی لک دیاں کیا کچھے  
تجھ بن جمن کی سیر سے کیا یادے گئے  
جوں لالہ داغ سینے پر دو چارے گئے

## میر محمدی بیدار دہلوی

طلب میں تیری اک تہنا زبائے جستجو ڈٹا  
کنا یا بی سے تیرے تار تار آرزو ڈٹا  
کیا ہنگامہ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ  
اودھرائی بہار ایدھر گریباں کا رُو ڈٹا

اے رشکِ گل کہ ہے عیشِ جستجوئے عطر  
یک شمعِ تجھ شمعِ بدن سے ہے بوئے عطر  
ہو جس دماغ میں مرے گل پیرن کی بو  
بیدار ہو نہ دسکو کبھی میل بوئے عطر

کیوں نہ لے گلشن سے باج اس ارغواں سیما کارنگ  
گل سے ہے خوش رنگ تر اس کے خانی پاکارنگ

جو بنی من پرے اتحادی باغ میں کر نقاب  
اور گیارنگ چمن دیکھ اس رخ زیا کا رنگ  
کج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا  
رخ سے کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ

بھاتی نہیں ہے باس کسی گل کی لے صبا  
کس کی ہوا ہے بوسے معطر دماغ دل

لے بہار گلشن ناز و نزاکت ہر طرف  
تیرے آنے سے ہوئی ہے اور بھی ستاں میں

جائیں شتا قوں کی سب پر آئیاں  
جیب تو کیا ناصحا دامن کی بھی  
اس صنم اندام گل رخسار کی  
سن کے یہ باد صبا نے باغ میں  
بل بے ظالم تیری بے پروائیاں  
دھجیاں کر غلٹ نے دکھلایاں  
جانفرا بہکت چراگر لائیاں  
گھڑیاں غنچوں کی سب کھلوائیاں

کریں ہیں ناز گل ولالہ اپنی خوبی پر  
نک ایک تو بھی تو یاں آکے جلوہ فرما ہو

اب تک مے احوال سے وال بے خبری ہے  
لے نادر جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

## میر تقی میر

کہا میں نے کتنا ہے گل کاشیات  
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا  
بجھ رہی ہیں ایک قطرہ خونِ شکر شک  
پلک تک گیس تو تامل کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا  
عہد جوانی رور و کا نا پیری میں ہیں کھیں نہ  
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا  
یعنی رات بہت تھے جائے صبح ہوئی آرام کیا  
سعدی

چاہتے ہیں سو آپ کریں میں ہم کو بحث نہ نام  
کو سوں اس کی اور تجھے پر سجدہ ہر گھم کیا  
کو چکے اس کے باشندوں نے سب کو ہمیں سے مدام  
رات کو درود صبح کیا یاد ن کو جو ن شام کیا  
نہ سے گل کو مول لیا قامت سے ہر غلام کیا  
سحر کیا، عجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا  
قشتہ ٹھینچا، دیر میں ٹھینچا، کب تک اس راہ کیا

باقی ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے غماری کی  
سرد ہم سے بے ادبی تو دشت میں بھی گم ہی کیا  
کس کا کعبہ، کیسا قبلا، کون حرم ہے کیا، نزام  
میاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دلا جھوٹا ساز  
صبح جمن میں سحر کہیں تکلیف ہو لے آئی تھی  
ایسے آجوتے رم خوردہ کی وحشت کھوئی شکل تھی  
میر کے دین مذہب کو اب بوجھتے کیا ہوانے تو

جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا  
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا  
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوائے جمال کیا  
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو  
لگا نہ دل کہ کہیں کیا سنا نہیں تو نے

آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا  
جنون کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا  
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا  
پنا تو یہ دل تیر کسو کام نہ آیا

بے ہوش بے عشق ہوں کیا میرا بھروسا  
سوار بیاباں میں گیس عمل میلی  
اگے جو ترے گوچے سے جاؤں گا تو سینو  
نے خون ہوا آنکھوں سے یہاں تک نہ ہوا داغ

اب سنگ مداوا ہے اس آشفہ سری کا  
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا  
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا  
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

زندان میں بھی نورش نہ گئی اپنے جنون کی  
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے  
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بیت کام  
تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے

سبب چمن کا مفت میں یا مال ہو گیا

وہ اک روش سے کھوے ہوئے بال ہو گیا

الہجاء دیکھا جو ہمیں اس کے عشق میں  
دعویٰ کیا تھا گل نے تھے رخ سے بان میں  
دل سا عزیز بان کا جنجال ہو گیا  
سلی لگی صبا کی سونہ لال ہو گیا  
آگے جمال یار کے معرہ دور ہو گیا  
گل اک جمن میں دیدہ بے نور ہو گیا  
دیکھا جو میں نے یار تو وہ قیر ہی نہیں  
تیرے غم فراق میں رنجور ہو گیا

وہ مایہ جاں تو کہیں پیدا نہیں ہو گیا  
دل تاب ہی لایا نہ ٹٹا دیر متا نہیں  
میں شوق کی افراط سے بیتاب ہو گیا  
اب نہیں روز وصل کا رچی میں بھج لا خواں  
تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھی  
اب دیدہ ترکو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا  
رکھ لہہ دل پر میرے دریافت کر کیا حال ہے  
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان فوں بیتاب سا

بے کسان جی گرفتاری کے شیون میں ہا  
پتہ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو  
ایک دل غم خوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا  
گر نکالیں گریباں سے تو دامن میں رہا  
اب یہ دعویٰ حشر تکلیف دہر میں رہا  
جی ہر اک تجھ پر اس صید افکن میں رہا  
ہم نہ کہتے تھے کیمت دید و حرم کی راہ چل  
آہ کس انداز سے گزرا بیا باں سے کو تیر

گر یہ یہ رنگ آیا قید قفس سے شاید  
دی آگ رنگ گل نے واں لے صبا چن کو  
خوں ہو گیا جگو میں اب داغ گلستاں کا  
یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشاں کا  
چہرہ آخر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا  
پوچھ تو میرے کیا کوئی نظر پڑا ہے

ہاتھ سے تیرے اگر میں نیم جاں مارا گیا  
یک نچ سے بیش کچھ نقصان آیا کے تیر  
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا  
اور میں بے چارہ تولے مہرباں مارا گیا  
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا  
آخر آخر میر مر مر آستان مارا گیا  
دسل نہ جواں ہی جود و منزل ہیں ہا عشق میں  
کب نیا ز عشق ناہن سے بچنے ہے ہاتھ

ہمارے آگے تراجم کس نے نام لیا  
خواب رہتے تھے مسجد کے آگے میں اُٹھنے  
دل ستم زدہ کو ہم نے تمام تھام لیا  
مٹکاہ مسک نے ساقی کی انتقام لیا  
مرے سلیقے سے میری بھی محبت میں  
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مفت آبروئے زاہد علامہ نے کیا  
داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے شوق  
اک منہ بچہ اتار کے حمام لے گیا  
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

آزار دوسے اپنے کالوں کے تیلے گل  
ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ  
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا  
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں کھتا

خوبی کا اس کی بسکہ طلب گار ہو گیا  
ہے اس کی صرف زیر لبی کا بسحوں میں ذکر  
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا  
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستر ہو گیا  
دلدار اپنا تھا سودا دل آزار ہو گیا  
ناکردہ جرم میں تو گنہ گار ہو گیا  
کب رو ہے اس بات کے کرنے کا جھکوتر

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا  
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا چاک  
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا  
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا  
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز  
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں  
دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا  
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں  
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بے خود جو ہیں وہ کیا چیتیں      اسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے      دل سے گئیں زبانی تری پیاری ساری  
میاؤ گئے بھول جہد کو فرادو و قیس کے      گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی پیاری

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں      اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں  
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا      اس شست خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں  
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے      جن کے زیاں کو بھی ہم سود جانتے ہیں

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں      ایک مدت سے وہ مزاج نہیں  
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن      مرض عشق کا علاج نہیں  
شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر      جنس دل کا کہیں رواج نہیں

بھائیں بیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں      بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں  
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا      جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمایاں دیکھیں

منے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں  
تم تو کرو تو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں  
بوئے گل اور رنگ گل دونوں میں دکھ لے نسیم  
لیک بقدر یک نگاہ آدے دیکھئے تو وفا نہیں  
شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہوتاں  
مجھ کو خدا خواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں  
ایک فقط ہے سادگی تپہ بٹائے جاں ہے



عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں  
نازبتان اٹھا چکا دیر کو میرے ترک کر  
کچھ میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت و گلشن میں جب بھلیاں  
نہ جب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں  
دوانہ ہو گیا تو میرے آخر ریختہ کہہ کہہ  
نہ کہتا تھا میں اسے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں  
کتنی باتیں بنا کے ناؤں لیک یاد رہتی ترے حضور نہیں  
ہمام ہے یار کی تجلی میں خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

ہوئے بہتے بہتے جفا کاریاں کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں  
ہماری تو گزری اسی طور عمر یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

دل سے شوق رخ نہج نہ گیا بھٹا ٹھٹا تاکنا کبھو نہ گیا  
پھر قدم پڑتی اس کی منزل لیک مہرے سوداے جستہ نہ گیا  
دل میں کتنے سودے تھے وہے ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا  
سجہ گردان ہی میرے ہم تو رہے درت کو تباہ تاسہ جو نہ گیا

میں کیا کہنے کہ خواباں نے اب ہم سے کیا رکھا ان چشم سیاہوں نے بہنوں کو سلا رکھا  
”جوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے گل پھول کو ہے اُن نے پروانہ بنا رکھا

یوشیدہ راز عشق چلا جائے تقاسم کج  
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا  
آوردگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان  
مشتِ غبار لے کے صبا نے اٹھا دیا

دل عشق کا ہمیشہ حریتِ خیر و خیر تھا  
اب جس جگہ ہے داغ یہاں پہلے درد تھا  
ماشتی میں ہم تو میر کے بھی مضطرب عشق کے  
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ہیرن روئے گل سے مرغِ چمن  
پسپ ہے یوں بے زبان ہے گویا  
ایسی بھری بھری کیا ہے  
میکدہ اک جہان ہے گویا  
نہی شور مزاجِ شبِ یس ہے  
میر اب تک جہان ہے گویا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا  
جی کا جانا بھڑک گیا ہے صبح گیا یا شام گیا  
عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا، اسلام گیا  
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا  
کس کس اپنی کل کو روئے ہجراں میں لے کل اس کا  
خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا  
ہم نے جو افی کیا کیا کہئے شور مردوں میں کھتے تھے  
اب کیا ہے، وہ عہد گیا وہ موسم وہ نگام گیا

سیٹھوں میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب  
اب کیا مرے جوں کی تدبیر میر صاحب  
رہ گھینٹے تو وہ تیج کھنچ نہ سکتی  
اپنا گناہ اپنی تقصیر میر صاحب  
جتنی نہیں کمان اب سم کے لئے گل کی  
باد سونگے ہے جوں تیر میر صاحب  
تم میں خیال میں ہو تصویر سے جو چہا  
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

نکلے گئے تھے یار ہیں بھی چین کج  
اس کی سی بوند آئی گل ویا میں کج  
ہے قہر وہ جو دیکھے نظریہ کے نبی میر  
برہم کیا جہاں شرہ برہم زدوں کی پتھر

بس نہ لگ چل نسیم مجھے سے کہیں  
رہ گئی ہوں چراغ صبا بھوکہ

کوئی خواہاں نہیں محبت کا  
تو کہے جنس ناروا ہے عشق  
میر جی زرد ہوتے جاتے ہو  
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

کب دسترس ہے محل کو تیرے سخن تک  
روائیاں گئی ہیں عقیقہ بین تلک  
مارا گیا خرام بناں پر سفر میں میر  
اے گنگ کہتا جانیو اس کے وطن تلک

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم  
لیے بناں اس قدر جفا ہم پر  
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر  
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم  
عاقبت بندہ خدا ہیں ہم  
گو یا جنس ناروا ہیں ہم

بیل کو مو پایا کل پھولوں کی دوکاں پر  
غور نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے نے  
رہ میر غریب نہ جاتا تھا چلا روتا  
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چھوٹا  
مشتوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا  
ہر گام گلہ لب پر یا رانِ وطن کا تھا

کل دل آزرده گلستانِ گزرم نے کیا  
اس رخ و زلف کی تسبیح ہے یا انکرم میر  
گل لگے کہنے کہو، نہ نہ اُدھر ہم نے کیا  
ورد اپنا یہی اب شام و سحر ہم نے کیا

دل دفعۂ جنوں کا ہتیا سا ہو گیا  
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

نک جوش سا اٹھا تھا مٹے دل پر یہ لکے  
دیکھا تو ایک بل ہی میں دریا سا ہو گیا  
جلوہ ترا تھا جب تئیں بارغ بہار تھا  
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

اندر سے نرود و ناز تیرا  
نہ نطق نہیں ہم سے سنا تیرا  
کچھ عشق دیکھ سنا میں برق جی کر  
کیر ہر سہ وہ اتنا تیرا

اندوہ نہ غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا  
اب کے کچھ بھگے بہار سے آگے جنوں ہوا  
میراں نے مرگشت سنی ساری رات کو  
افسانہ عاشقی کا ہماری فسون ہوا

نے نیلے یہ تھی کہاں کی ادا  
جاو کر کرتے ہیں اک نگاہ کے بیج  
بات کہتے میں نگالیاں دے گئے  
دل چلے جائے سے خرام کے ساتھ  
خاک میں مل گئے میر ہم سمجھے  
کھب گئی جی میں تیری بانجی ادا  
ہائے رے چشم و لب ان کی ادا  
سنے ہو میرے ابد زباں کی ادا  
دیکھی جلتے میں ان بتاں کی ادا  
بے ادائی تھی آسمان کی ادا

مڑھکا ہی کرے ہے جس تس کا  
شام سے کچھ بھجا سا رہتا ہے  
تھے برے مرغ بچوں کے تیر لیک  
تاب کس کو جو حال تیر سننے  
جیرتی ہے یہ آئینہ کس کا  
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا  
شیخ مئے خائف سے بھلا کھسکا  
حال ہی اور کچھ ہے غلب کا

گل کو محبوب میں قیاس کیا  
فرق نکلا بہت جو یاس کیا

کچھ نہیں سوچتا ہیں اس میں  
 شوق نے ہم کو بے حواس کر دیا  
 عجب تک شمع سر کو دھنکی رہی  
 کیا تپتے تھے اس میں کب  
 ایسے وحشی کہاں ہیں اے خداں  
 تیرا تم جھٹکا تو اس کیسا

دل سے شوق بچ نہ گیا  
 ہر قدم بڑھی اس کی نزل بیک  
 سب گئے، ہوش و عبرت اب تو اب  
 دل میں کتنے سودے تھے مٹے  
 بھر گردان ہی تیرا ہم تو رہے  
 بے کھانا کھانا کھانا نہ کیا  
 میرے سوا اسے ہستی نہ کیا  
 لیکن اسے داغِ اداس تو نہ گیا  
 ایک پیش اس کے روپ نہ گیا  
 دست کو تارہ تارہ نہ گیا

دل خستہ جو ہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تک  
 کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا  
 کبھو جائے گی جوادھر صبا تو یہ کہو اس کے کہے وفا  
 مگر ایک تیرا شکستہ پا ترے بان بازہ میں خار تھا

دل جو تھا اک آبلہ بھونگا  
 رات کو سینہ بہت کوٹا گیا  
 دل کی دیرانی کا کیا نہ کو رہے  
 یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا  
 اپنے ہی دل کو نہ ہو وانشہ تو کیا حال نسیم  
 گوچن میں غیچہ پڑ مردہ تھ سے کھل گیا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا  
 وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا  
 بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ نہ نکلا  
 رہا جو سینہ سوزاں میں داغدار رہا  
 غلی میں اس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر  
 میں تیرا میر کر اس کہ بہت بچار آیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا  
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا  
قافلے میں صبح کے ایک شور ہے  
یعنی تافل ہم چلے سوتائے کیا  
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں  
داغ چھاتی کے جھٹک دھوٹا کیا

قدر رکھتی نہ تھی مستاع دل  
سارے عالم کو میں دیکھ لایا  
دل کہ یک فخر غوں نہیں ہے بیش  
ایک عالم کے سر بلا لایا  
سبب یہ جس بار نے گرائی کی  
اس کو یہ انا تو اٹھا لایا  
اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر  
پھر یس گئے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا  
دم کے جانے کا نہایت غم رہا  
جامد احسرام زاد پر نہ جا  
تھا حرم میں ایک نامحرم رہا  
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی  
ایک مدت تک وہ کاغذ غم رہا  
صبح پیری شام ہونے آتی میر  
تو نہ جیتا یاں بہت دن کم رہا

اس چہرہ کی خوبی سے عشق لگی کو تھایا  
یہ کون شگوفہ سا جن زار میں لایا  
یا قافلہ در قافلہ ان ستوں میں لوگ  
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا  
ایسے بت بے ہر سے ملتا ہر کوئی بھی  
دل میر کو بھاری تھا جو پھر سے نکلیا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا  
تو ہمایہ کا ہے کو سوتا رہے گا  
مجھے خام رونے سے اکثر ہے ناصح  
تو کب تک مرے نہ کو دھوتا رہے گا  
بس اے میر مرزا گان پونچھ آسودوں کو  
تو کب تک یہ موتی پر دتا رہے گا

سروششا د خاک میں مل گئے  
تو نے گلشن میں کیوں خدایا کیا

سہی طوفِ حرم نہ کی ہرگز قطعہ آستان پر ترے مقام کیا  
تیرے کوپے کے رہنے والوں نے یہیں سے کعبہ کو سلام کیا  
شوقِ خرابات کو میسر میں اپنا قبیلہ و کعبہ و امام کیا

یارجب طرح نگہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا  
تنگ قبا ئی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تیرہ کر گیا  
وصفِ خط و خال میں آنے تیر نامہ اعمال سیاہ کر گیا

پہونچے بے کوئی اس تن نازک کے لطف کو گل گوچن میں جاے سے اپنے گل پڑا

نظر میں طور رکھ اس کم نم کا بھروسا کیا ہے عمر بے وفا کا  
نگوں کے پیرہن ہیں چاک سارے کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا  
پستش اب انہی بت کی ہے ہر سو رہا ہو گا کوئی بندہ خدا کا  
کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا  
نہ جانو میسر کو ایسا ہی چپکا نمونہ ہے یہ آشوب بلا کا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اچھا گل کا ہزار حیف کہ میں بال و برہنیں رکھتا  
جدا جدا پھرے ہے میرے کئی خاطر خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

تا بمقدور انتظار کیا دل نے اب زور بے قرار کیا  
دشمنی ہم سے کی زمانے نے کہ جفا کا رتھ سار کیا  
صدمہ رنگ جاں کو تاب دے ہام تیری زلفوں کا ایک تار کیا  
ہم فقروں سے بے ادائیگی آنِ شمشے جو تم نے پیار کیا

## ۲۵۰ نہ ہب عشق اختیار کیا سخت کا فر تھا جن نے پہلے تیر

بیٹے جی کوچہ دلدار سے جایاں گیا  
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا  
گل میں اسکی سی جو بوائی تو آیا نہ گیا  
ہم کو بن دوش ہو باغ سے لایا نہ گیا  
گل نے ہر چند کہا باغ میں دیر اس بن  
جی جو اُچھا تو کسو طرح دکھایا نہ گیا  
شرین رہ میخانہ ہول میں کیا ہاؤں  
رسم مسجد کے تیں شیخ کہ آیا نہ گیا

بیکسائے جی گرفتاری سے شیون میں ہا  
ایک دل غمخوار رکھتے تھے گوگلشن میں رہا  
پنجگل کی طرح دیوانگی میں ہا تھ کو  
گر نکالا ہیں گریباں سے تو دہن میں رہا  
آہ کس انداز سے گورایا باں سے کہ تیر  
جی ہر اک منچیر کا اس صید فگن میں رہا

کچھ نہ دیکھا پھر جزاک شعلہ پہنچ و تاب  
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا  
گل کھلے صدر نگ تو کیا بے پری کے ایہم  
مدین گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

ایک ننگ سے بیش کچھ نقصان آتا ہے  
اور میں بے چارہ تو اسے ہر باں مارا گیا  
وصل وہ بحر اسے جو دو منزل ہیں و عشق کی  
دل غریب ان میں خدا جانے کھل ملا گیا  
کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ  
آخر آخر میرے سر آستان ملا گیا

کب تک یہ ستم اٹھائے گا  
ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا  
شکل تصویر بے خودی کب تک؟  
کودن آپ میں بھی آئیے گا  
کہئے گا اس سے قصہ 'مجنوں'  
یعنی پردے میں غم سنائیے گا  
شرکت و شیخ و برہمن سے میرے (قلعہ) کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا  
اپنی ویرہ اینٹ کی جدی مسجد کسی ویرانہ میں بنائیے گا



دیر و حرم سے گزرے ابل، گھر بھارا  
 دنیا و دیں کی جانب میلان ہو نہ کیے  
 یوں دور سے کھرے ہو کیا معجزہ دونا  
 دامن سے باندھ دامن سے ابر تر بھارا  
 ہے ختم اس آٹے پر سیر و سفر بھارا

ابراٹھا تھا کبے سے اور جھرم پڑا میتھانے  
 باد کسوں کا جھڑپ ہے گشتہ دیر بھانے

دامن میں آج بتر کے داغ شراب سے  
 تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

پچھتائے نہ کیونکر بھی اس طرح سے دے کر  
 یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چکے ہیں

سوئے بہتے بہتے جفا کاریاں  
 فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا  
 خط و کاگل و زلف و انداز و ناز  
 تری آشنائی سے ہی حد ہوئی  
 نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں  
 کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں  
 مری آہ نے بر چھائیاں ماریاں  
 ہو میں دام رہ صد گرفتاریاں  
 بہت کی تھیں دتیاں ہم یاریاں  
 کھنچیں تیر تجھ سے ہی غواریاں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھے کیا کیا نہیں  
 بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں لکھنئے نہیں  
 لے کیا نہ کرنا، تو میرے پہنڈیب  
 آب و ہوائے ملک عشق تجربہ کی دمن بہت  
 نازبتال اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر  
 تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں  
 لیکل یہ قدر یک نگاہ دیکھے تو وفا نہیں  
 بات میں بات عیب میں لے تجھے کہا نہیں  
 کر کے دوائے درد دل کوئی بھی پھر جی نہیں  
 کبے میں جا کے رہ میاں تیرے غم نہیں

یہ جو چشم پر اب ہیں دونوں      ایک خانہ خراب ہیں دونوں  
 رونا آنکھوں کا رویئے کیتک      بکھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں  
 ہے تکلف نقاب و سہ رخسار      کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں  
 تن کے معمورے میں یہی دل و چشم      گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں  
 ایک سب آگ ایک سب پانی      دیدہ و دل مذاپ ہیں دونوں  
 آگے دریا تھے دیدہ تر میسر      اب جو دیکھو سرباب ہیں دونوں

کیا میں نے رو کر فشا رگریباں      رگ ابر تھاتا رمار گریباں  
 نشاں اشک غوین کے اڑتے چلے ہیں      خزان ہو چلی ہے بہار گریباں  
 جنوں حیرت مت ہے مجھ پر کہ تو نے      نہ رکھا مرے سر پر بار گریباں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں      اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں  
 ہستی اپنی ہے بیچ میں پر وہ      ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں  
 عشق کا گھر ہے میسر سے آباد      ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خواہاں کو جانتا ہی ہوں      پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں  
 قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور      اب مرے عہد میں فسانے ہیں  
 عشق کرتے ہیں اس پر ہی رو سے      میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

جھائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں      بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں  
 بنی نہ اپنی تو اسی جنگ جو سے ہرگز مہر      لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

کی راہبری میری صحرائے محبت میں      یاں حضرت خضر آپھی مدت سے بھٹکتے ہیں

تو طرہ جانان سے چاہے ہے ابھی مقصد برسوں سے پڑے ہم تو لے تیر شکستے ہیں

گری نہیں ہے ہم سے دہلے رشکِ قباب اب آگیا ہے فرق بہت اس تپاک میں  
ابکے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ ہے داس کے چاک اور گریباں کے چاک میں

زوتگان میں جہاں کے ہم بھی ہیں ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں  
جس جمن زار کا ہے تو گل تر بلبل اس گلستان کے ہم بھی ہیں  
وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو داں کے ہم بھی ہیں

گل نے نزار رنگ سخن سر کیا و سہ دل سے گھٹیں تہ باتیں تری سیاری ہاں  
بچ جاتا ایک رات جو گٹ جاتی اور تیر کاٹیں تھیں کو بھن رنے بہت رشتیں جارتیاں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے درد دوستی ننگ نہیں عیب نہیں مار نہیں  
ناز و انداز و اداعشہ و اغماض و حیا آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی سیار نہیں  
دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح تو کسو زلف کے پھندے میں غر زار نہیں

مجھ کو دماغ و صف گل و یاسمن نہیں میں جو نسیم باد فروش چمن نہیں  
گل کام آوے ہے ترے منہ کے تار کے صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

دیر و حرم سے تو تو تک گرم ناز نکلا ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہن میں

دل کھلتا ہے واں صحبت زندانہ جہاں غمخس ہوں اسی شہرے سے غائبہ جہاں ہو  
کچھ حال کہیں اپنا نہیں بخود ہی تجھ کو عشق آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو

دشت ہے خردمندوں کی صحبت مجھے میرے اب جا رہوں گا وہاں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچنے ہے یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو  
مغاں سے راہ تو ہو جائے نغمہ زلفہ سیج ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے یا اب چین میں طبل ہم ہی رہیں گے یا تو  
عالم ہے شوق کشہ خلقت ہے تیری زلفہ جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو  
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے ظالم معاف رکھو میرا کہاں سا تو  
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک دو گام تھا چین میں ٹمک ناز سے جلا تو  
کہہ سناجھ کے موئے کوئے میرے روئیں کبک جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

بھری رہے ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے  
کیونکہ چھپے ہو خوار بنی شب جب ایسے رات کے ماتے ہو  
سرو تہ و بالا ہوتا ہے، درہم بدرہم شاخ گل  
ناز سے آفت کش ہو کے چین میں ایک بلا تم لاتے ہو  
چشم تو ہے اک دید کی جا، پر کب تکلیف کے لاتی ہے  
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

سایہ میں ہر ملک کے خوابیدہ ہے قیامت اس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو  
بلبل بھی گل غلے پر مر کر چین سے نکلی اس مرغ شوق کش کی ٹمک تم وفا تو دیکھو

حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک زلفہ کب  
ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرے کیا رلبا محبت سے اُس آرام طلب کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے  
گو شکفتہ چمن چمن تھے گل  
اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ سمجھو  
غنیہ دل تو روا ہوا نہ سمجھو  
عشق کی پائی انتہا نہ کہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم  
بہر آدم نمود شبنم ہے  
اب جو ہیں خاک اہتا ہے یہ  
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ  
دیکھ بے دام لگا مجھے کہنے  
تیر کو کیوں کہ منہ ختم جانے  
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

کھینچا ہے دلوں کو صحر ا کچھ  
وینے ظاہر کا لطف ہے چھپنا  
ہے مزا جوں میں اپنے سودا کچھ  
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ  
تیر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ  
وصل اس کا خدا نصیب کرے

کچھ کر د فکر مجھ دوانے کی  
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور  
دھوم ہے پھر بہار آنے کی  
ہے یہ تقریب جی لکے جانے کی  
تھی خبر گرم اس کے آنے کی  
چال بے داول ہے زمانے کی  
جو ہے سو پال مال غم ہے تیر

ہستی اپنی جاب کی سی ہے  
ناز کی اس کے لب کی کیا کیے  
یہ نمائش سراب کی سی ہے  
پتھر ہی اک نگلاب کی سی ہے  
اُسی خانہ خراب کی سی ہے  
ساری مستی تیراب کی سی ہے  
میر ان نیم باد آنکھوں میں

جب نام ترا لیجے تب چشم بھرا آئے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے  
 لے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پر نہار قطعہ کیو جو کبھی تیر بلا کش ادھر آئے  
 مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو ہر گام یہ اس رہ میں سفر سے خدرا آئے  
 کچھ موج ہو ایجاں لے تیر نظر آئی شاید کہ بہار آئی ز بحر نظر آئی  
 ذلی کے نہ تھے کوچے اورانی مصور جو شکل نظر آئی تصویر نقشہ آئی

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہمارا زبان ہے پیارے  
 میسر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہاں ہے پیارے

تڑپنا بھی دیکھا نہ سہل کا اپنے میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے  
 بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

آرزو اس بلند بالا کی کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے  
 دیدنی ہے شگستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے  
 ہے لہجہ کہ سل ہیں بے ب یعنی ایک بات سی بنائی ہے  
 بے ستون کیا ہے کوئی نہیں کیا؟ عشق کی زور آزمائی ہے  
 مرگ مجنون سے عقل گم ہے تیر کیا دوانے نے موت پائی ہے

پھر اُس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے  
 کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے  
 سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سادہن غنچہ  
 تیکس کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

کیا کروں شمع خستہ بانی کی  
عالم بد گفتنی نہیں سیرا  
میں نے مرسر کے زندگانی کی  
تم نے پوچھا تو مہربانی کی  
اجدا پھر دہری کہانی کی  
جس سے کھوئی تھی مینہ میرے کس

بہیں دسواں جی گزرنے کے  
سیرے تیرے حال پرست جا  
ہے اسے ذوق دل لگانے کے  
اتفاقات ہیں زمانے کے  
اور بھی وقت تھے بہانے کے  
چڑھ گئی ہاتھ اُس دوانے کے  
دل و دیں ہوش و سیر بے ہی گئے  
آئے آجے ہمارے آنے کے

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی  
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں  
بیٹھ جا چلنے بار ہیں ہم بھی  
تختہ روزگار ہیں ہم بھی  
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی  
مخ گرے نہ کر تو اسے واضح

فقرانہ آئے صدا کر چلے  
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے  
ماں خوش رہو ہم دعا کر چلے  
ہر آگ چیز سے دل اٹھا کر چلے  
سو تم ہم سے منہ بھی چپا کر چلے  
حق بند لگی ہم ادا کر چلے  
نظر میں سبکوں کی خدا کر چلے  
پرستش کی یاں تک کہ ابے تہجے

زلفیں اس کی ہوا کریں برہم  
ہم کو بھی بیچ و تاب پے سو ہے

کوئی ہو محرم غوغا میں پوچھوں  
کہ بزم عین جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

غم بھریم رہے شرابی سے      دل پر خون کی اک گلابی سے  
 کلنا کچھ کچھ کھلی نے سیکھا ہے      اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے  
 کام نئے عشق میں بہت پرکھیں      ہم بھی فارغ ہونے تشابی سے

کچھ میں باب طیب      یہ دوری بتاں سے  
 اس نے ہمیں پھر کے یار واپس خدا کے ہاں سے  
 جب کو نہ دیتی ہے کبلی تب جانب گشتاں  
 رکھتی ہے پھیر میرے خاشاک آشیان سے  
 کیا خوبی اس کے مدد کی ہے غنچ اقل کرے ہے  
 تیرے نہ بول ظالم لا آتی ہے وہاں سے  
 اتنی بھی بد مزاجی ہر لمحہ مسیحا      غم کو  
 ایسا ڈب ڈب زمین سے جھگڑاں آسمان سے

فریاد و قیس گزرے اب رہے ہمارا      ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بچا گیا ہے

ہم جن میں گئے تھے وانہ ہوئے      ہنکت گل سے آشنا نہ ہوئے  
 کیا نیوٹا قفس سے سہ مارا      موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

خدا کرے مے دل کو ملک اک قرار آئے      کہ زندگی تو کروں جب ملک کے پار آئے  
 ہیں تو ایک ٹھری گل بغیر و بھر ہے      خدا ہی جانے کہ اب کب تک یہ آئے  
 نہیں چاہا بھلی اتنی بھی دعا کر میر      کہ اب جو دیکھوں یہ میں بت نہ پرا آئے



اس کے بدن میں ہر جادو لکھ دیا ہے یوں دلیکھ  
وہ دراز سے لگے ہم تصویر سے کھڑے ہیں  
پاسط یوح جگہ سے یا کج لب جگہ ہے  
وہ دراز گان کو اس کے گھٹس میں کب جگہ ہے

پتا پتا بڑا بوٹا حال ہمارا جانے پہنچے  
ہر روز دلفضہ خدایت کیسے واکھان میں نہیں  
جوانے نہ جانے گلی ہی جھٹلے باغ تو سارا جانے  
دراز جگہ کچھ نظر و فانیہ زمرہ اشیا جانے ہے

مالم یا عشق جو زبان ہے دنیا دنیا تبت ہے  
میں سے نکلو دیرانہ جیسے وداچی آتا تھا  
درازا میں سدا ہوں میں صحرایہ و شربت ہے  
آواز سدا ہنس کی شاہرہ دل سے ہائے رخصت ہے

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے روئے تیسری  
میں سے آج باغ میں جھگڑے بڑے ہے

و اعظا ناکس کی باتوں پر کوئی جانا ہے میر  
آؤ سے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے  
پراس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

یال و پر بھی گئے کہہ بار کے ساتھ  
کو ممکن کیا یہاں توڑے گا  
عشق نے دور آزمائی کی  
سامری کی کہ دل رہائی کی  
نسبت اس آستان سے کچھ نہ ہوئی  
برسوں تک ہم نے جی سانی کی

دل جادو ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے  
اب ہم تو پہلے یاں سے تو رہ جو رہا چاہے  
رنگ گل و بوٹ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قائلہ جاتا ہے ہو تو بھی چلا جائے

آگے ہمارے ہمد سے وحشت کو جائیگی  
سیکادہ سانسے ہے نچرن اب نواں میں نے  
دیکھے دیار حسن کے میں کارواں بہت  
لیکن کسوئے پاس سماعِ رفا نہ تھی

آتا نہیں خیال میں خوشی رو کوئی کچھو  
دل میں سودے کے جیت پر حضور یار  
تو مار ڈالید نہ مجھے اس نگاہ سے  
نکلانہ ایک عرف بھی میری زبان سے

روشن ہے چمکے مرنا پروانے کا تو لیکن  
لے شمع کچھ تو تو کہہ تیرے ہی تڑپاں سے

یہ چشم آئینہ دار رو تھی کسو کی  
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی  
بلا یا شب اک شعلہ دل نے ہم کو  
نہ تھے جد سے نازک میانان گلشن  
دم مرگ دشوار دی جان ان نے  
نظر اس طرف بھی کچھ تھی کسو کی  
کہ اس سست پہاں میں برقی کسو کی  
کہ اس تند کشر میں خو بھی کسو کی  
بہت تو کھر جیسے نو تھی کسو کی  
مگر مسد کو آرزو تھی کسو کی

## مرزا محمد رفیع سودا

چھینٹ باد بہاری میں ہوں بخت گل  
بھاڑ کر کپڑے ابھی گھر نے گل بادوں کا

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا  
دکھاؤں گا تجھے زہد اس آفت دین کو  
لو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا  
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

زبان بے شک میں تاجرِ شکرانی کے کہ جس نے دل سے مٹا غلشِ پانی کا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں رونما بھر کو پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

اس گلشنِ ہستی میں عجیب یہ ہے لیکن  
نہیں کھلی گلی کی تو موسم ہے خزاں  
لیکن کھلی خواہاں نہیں وارِ غلشِ گلی کو

تو دُعاِ عشق میں شہرین سے کو ممکن  
بازی اگرچہ باز نہ سہ سہ تو کھد سہ  
کس بندے اپنے آپ کو کس ہوشِ باز  
لے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ سہ

سو نہ تر تارِ دل ہے اتنا تو نہیں رو  
کیا جائے تو نے نہ کس آن میں دیکھا

وہ کہتے تھیں یہ ایک موبہِ غرض  
او دھڑکھلی جزلِ فانی ہر دل بھر گیا

سو دایہ کیا کرے گمانت اس قدر کارونا  
عالم کو اسے دو آنے مت ساتھ لے ڈیونا

بھگدڑ سے بھر پور مت اس سے ہو سو ہوا  
مبادا ہو کوئی ظالم تر اگر گیاں گیر  
بہیج پیکار سے سر زخمِ دل تاکہ یار  
ہے سن کے مری مر نہ شست وہ بے رحم  
یہ کون حال ہے احوالِ دل پر لے آٹھو  
دیا اسے دل دیں اب یہ جان ہے سودا  
یلاکشانِ محبت پر جو ہو سو ہوا  
مرے ہو کو تو دامن سے دھو ہو سو ہوا  
کوئی سیو کوئی مریم کرو ہو سو ہوا  
یہ کون ذکر ہے جانے ابھی دو ہو سو ہوا  
نہ جھوٹ جھوٹ کے آٹنا ہو سو ہوا  
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو سو ہوا

یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گذارنا کیا چشمِ خواہاں کے جو ہمار کا چاراز کیا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جتنے غم سے شینج یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

برابری کا تری نگل نے جب خیال کیا جمالِ یار نے نہ اس کا خوب حال کیا

ہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے تم بھی ٹھک دیکھو تو صاف نظر آئے کہ نہیں  
پائیں ناموس مجھے عشق کا ہے لے لے بلبل درازیاں کون سا اندازِ فناں کی کہ نہیں

تو نے سودا کے تیلِ قلب کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے تو ظالم سے کیا کہتے ہیں

کیفیتِ چشمِ اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغرِ کور سے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تو پلے ہے مرغِ قبل نما آشیانہ میں  
کیوں کر نہ چاک چاک محوِ بیان دلِ کرسن دیکھوں جو تیری زلف کو میں دستِ شایہ میں  
ہم ساتھ تو ایک ہم تھے سے ہیں محوِ جادیکھ لے تو آب کو آئینہ خازن میں  
سودا خدا کے واسطے کو قصہ مختصر اپنی تویندازِ محو تیرے فسانہ میں

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار ظالم بھرے ہے جام تو جلد ہی بھر دیا

خوبوں میں دل ہی کی خوش کم بہت ہے یا خواہاں عیاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یا

چشم ہوس اٹھائے تماشے سے جون جہاں      ناوید فی کا دید بس ایک دم بہت آیا  
دیجھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل      کم فرصتی طاپ کی باہم بہت بے ماں  
سودا کہہ اس سے دل کی تسلی کے واسطے      گوشہ سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

بل بے ساقی تیری بے پروا ایساں      جانیں شاقوں کی لب تک آئیاں

وے صورتیں الہی کس ملک بستیاں ہیں      اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں تنہا ہیں

یوں پاس بٹھا تو جس کو چاہے      پر جاگہ نہ دیکھو یار جی میں

یار آذر وہ ہوا رات جو مے نوشی میں      کیا ہوا ہم سے خدا جانے بے ہوشی میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہیں      اے الفت چمن تراخانہ خراب ہو

ترغیب نہ کر سیر چمن کی ہمیں سودا      ہر چند ہوا خوب سیر و اں لیک ہوس کو

مے نشان: روح جاری بھی کہی شاد کرو      ٹوٹے گریزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا      ہونی جو کچھ تھی قبل مصاحبات ہو گئی  
مستی سے اس نگاہ کی لے محنت خبر      دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی  
یار وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا      نظروں میں سوطح کی حکایات ہو گئی

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ٹھہری      اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد بے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ  
سودا آتری فریاد سے آنکھوں میں گئی ترانہ  
کافی ہے تسلی کو میرے ایک نظر بھی  
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم نہیں مر بھی

نسیم جی تو ہے چڑ میں اور صبا بھی ہے  
ترا غرور ہرا بنجر تا کجا ظالم  
ہماری خاک سے کچھ دیکھو یہ رہا بھی ہے  
ہر ایک بات کی آنکھ کچھ اُتتا بھی ہے  
کے رکھو قدم دشتِ خار میں نہ  
کہ اس ذرا میں سودا برہنہ پا بھی ہے

جس رہ زکسی اور یہ بیدار کرو گے  
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کر گئے

بے وفائی کیا کہیں دل ساتھ تجھ جو بکی  
تیری نسبت تو میاں بیل سے گل نے خوب

اے ہر صغیر فائدہ ناختی کے نور کا  
ہم تو نفس میں آن کے خاموش ہو گئے

پاس اب ہمارے نہمت گل کو نہ لائسیم  
دل سے ہوس چن کی اسیروں نے دو کی

دلفت میں کچھ اپنی بھی اڑھا ہے سودا  
ہر چہ نہ وفا شیرہ محبوب نہیں ہے

خواری کا نہ کرا اپنی دلایار سے شکوہ  
رہو ابو ہوا عشق میں کمال تو مہی ہے

## خواجہ مسیح درو

جنگ میں آگ اُدھر اُدھر دیکھا تیری آیا نظر جدھر دیکھا  
جان سے ہو گئے بدن خالی جس طرف تونے آتے تھے ہر دیکھ  
نالہ سنہ یاد و آہ اور زاری آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا  
اُن نبیوں نے نہ کی سیجائی ہم نے سو سو طرقات مر دیکھا  
زور عاشق مزاج ہے کوئی دراد کو قصہ مختصر دیکھا

ہم نے کس راست نالہ نہ کیا پڑا سے آہ کچھ اثر نہ کیا  
سب کے ہاں تم ہوتے کرم فرما اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا  
دیکھتے کو رہے ترستے ہم نہ کیا جسم تو نے پر نہ کیا  
کون سا دل ہے جس میں غائب کون آباد تو نے گھر نہ کیا  
سب کے جوہر نظر میں آئے درو بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا  
ساقی مرے بھی دل کی طرف ملک جا کر لب لشنہ تیرے ہی بزم میں یہ جام نہ کیا

ہم جانتے نہیں ہیں درو کیا ہے کعبہ جید مرے وہ ابرو اودھر نماز کرتا

جواب بن یار تھے آپ ہی ہم نکلی آنکھ جب کوئی پروا نہ دیکھا

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی گزربانی کا بھڑا دے منہ سے نہ ساقی ہمارا اور گلابی

۱۔ قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے ہمد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے صحنے شعلہ کے حضور  
 ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صبراً لیکن  
 باوجود کہ یہ وہاں نہ تھے آدم کے  
 غلبہ آج تو فیضانے میں تیرے ہاتھوں  
 درد کے ملنے سے لے کر ریا کیوں ملنے  
 شمع کے منہ پر جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا  
 میں نے پوچھا تو کہا خبر یہ نہ کہ رز تھا  
 پہنچا اس جا کہ توشتوں کا بھی عقد و نہ تھا  
 دل نہ تھا کوئی کہ پیشے کی طرح چور نہ تھا  
 اس کو کچھ اور زواید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حشرات سے چھا گیا  
 میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات  
 بس ہجرم یا بس جی ٹکھرا گیا  
 پر مری زنجیر اس کے ڈھبائے پائیا

گونا گونا رسا ہونہ ہو آہ میں اثر  
 میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہوگا

سہنجی تو کوئی دم دیکھ سکائے فلک  
 اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک سکرہ کھٹا

جگم میں کوئی نہ نکا ہنسنا ہوگا  
 اس نے قصداً بھی میرے نالے کو  
 دیکھئے غم سے اب کے جی میرا  
 دل زمانے کے ہاتھ سے سالم  
 حال مجھ غم زدہ کا جس تس نے  
 دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں  
 قتل سے میرے وہ جو باز نہ ما  
 دل بھی اسے درد قطرہ خون تھا  
 کہ نہ چلتے ہی رد دیا ہوگا  
 نہ سنا ہوگا گرسنا ہوگا  
 نہ پئے گا پئے گا کیسا ہوگا  
 کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا  
 بسبب سنا ہوگا رد دیا ہوگا  
 کہیں غصہ کوئی کھلا ہوگا  
 کسی بدخواہ نے کہا ہوگا  
 آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

لسان کا غذا آتش زدہ مے گل رو  
 ترے جملے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں



ہمارے پاس ہے کیا جو کس خدا تجھ پر  
 فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور تلو گیری  
 بتوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے  
 ہر ایک سنگ میں ہے شوخی بتاں بنائیں  
 وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا  
 اگر چہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

نئے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار  
 کس بات پر چین ہو س رنگ بو کر

ترد منی پیش رخ چاری نہ جائے  
 دامن پنجوڑ میں تو فرشتہ وضو کر

ہر چند تجھے صبر نہیں درد و لیکن  
 اتنا بھی نہ ٹھوکر وہ بدنام کہیں

خدا جانے کیا ہو گا انجام اس کا  
 تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا  
 کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں  
 نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر  
 میں بے صبر آتا ہوں وہ تند خو ہے  
 تری آرزو ہے اگر آرزو ہے  
 مجھے اپنے رونے ہی سے آرزو ہے  
 جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے  
 زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے  
 کیا ہمیں کام دن گلوں سے اے صبا  
 دوستو دیکھا تماشا یاں کایں  
 شمع کے مانند ہم اس بزم میں  
 ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کرپے  
 کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے  
 ہم تو اس جینے کے ماتھوں مر چلے  
 ایک دم آئے ادھر ادھر چلے  
 تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے  
 چشم تر آئے تھے دامن تر چلے  
 رخ صاحب جھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ ہی آرزو آگیا جیہرہم پہلے  
 جو ان خزار ہستی بے بودیاں بارے ہم بھی اپنی باہی پہر پہلے  
 ساتیاں لگا رہا ہے چل چلاؤ جب تک اس چل سیکرہ انفریڈے  
 درد کچھ معلوم ہے یہ توں سبب کس طرف سے آئے تھے کیکرہ صریح

بے غلط گر گمان میں کچھ ہے تجھے سوا بھی جہان میں کچھ ہے  
 دل بھی تیرے ہی ڈھاک سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے  
 درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں فائدہ اس زبان میں کچھ ہے

اس طرح سے یک محنت جو آنسو نہیں بھرتے معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں میں نہ چاؤں اب بھاپیلے یوں ہی خدا جو یہاں ہے تو بندہ کا کیا چیلے  
 کہہ بیٹھو درد کہ اپنی دوا ہوں یا اس بے وفا کے آئے جو ذریعہ وفا پیلے

دل بھلا ایسے کوئے درد نہ دیکھے کوئی ایک تو یار ہے اور تیرے ہر طرف بھی ہے

یہی پیغام درد کا کہتے گریبا کوئے یار میں گزرے  
 کوئی رات آن بیٹھے گا دن بہت انتظار میں گزرے

روندے بے مثل نقش قدم خنیاں مجھے اے معرفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ارض و سما کہاں تری دعوت کو پاسے ہیرا ہی دل ہی وہ کہ جہاں تو سما کے

خیر بیتی لے اے گلستان خوبی کرے ہے تیسرا گل فردوسی  
دشوار ہر ترقی غلام تجھ کو بھی نینہ آتی لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی  
یرے غبار کا کچھ پایا نشان نہ ہرگز صحرائیں جا صبا نے ہر چند خاک چھانی  
ست جا تروتازگی پہ اس کی عالم تو خیال کا چین ہے

### سید محمد میر سورت

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دوانا پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا  
کوئی دم تو نہ تھکے رہو پاس میرے میاں! میں بھی چلتا ہوں ٹک کے جانا  
مجھے تو تہاری خوشی چاہیے ہے نہیں گو ہے منظور میرا کڑھانا  
کہاں ٹھونڈوں پر کہ ہر جاؤں یا رب کہیں جاں کا پاتا نہیں میں ٹھکانا  
تڑپتی کیوں ہے لے بلب کمال اتنا تیرا کہ تیرا اشک جس جا کر پڑے گلزار ہو پڑا  
قتل سے یہ بے گنہ راضی ہو اپنے اس لئے ماتھے میں ایک روز تو دامان قاتل ہووے گا  
کیسے ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا جو تم سے بتو ہو گا سوا اللہ کرے گا  
کہتا نہ تھا میں لے دل اس کام سے تو بازو دیکھا مزانہ تو نے نادان ماضی کا

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب لے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

نافرستوں کی راہ ابرئے بند جو گزرتے کھجے طغواب ہے آج

بھائی میرے تو آئے گئے ادا ساق بھائی عشق تیری شرکت و شاق  
میں غم یار ایک دن دو دن اس سے زیادہ نہ ہو جو مہمان  
نہ کہ بیٹھے جو پاؤں پسیدا کر اپنے گھر جاؤ خانہ آباد ان

وہ صورتیں بنائے کس میں بتیاں ہیں اب دیکھنے کو جن آنکھیں تیاں ہیں

مرا جان جاتا ہے یار و بچالو کلیجہ میں کاٹا گزرا ہے نکالو  
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو  
خدا کے لئے میرے اے ہم نشینوں وہ بانکا جو جاتا ہے سکو بلالو  
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو  
نہ آوے اگر وہ تہا لے کچھ سے تو منت کرو گھبراتے گھر سے منالو  
کہو ایک بندہ ہوتا رہا رہے ہے اُسے جان کندن سے میل کر جالو  
جلوں کی بری آہ جوتی ہے چلیے تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا تو

او مار سیاہ زلف پر سح کہہ بتلا دے دل جہاں چھپا ہوا  
کنڈلی تلے دیکھو نہ ہو وے کاٹا نہ ہنسی ترا بُرا ہوا

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا جل گیا بل گیا کہا اب ہوا  
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھکتا کیا بلا دل ہی دل میں آب ہوا

یار اغیار ہو گیا یہاں کیا زمانے کا انقلاب ہوا

ہم نہ دیکھو آئینہ کا ترسی تاب لاسکے  
خبر شہید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا کے

ایک آفت سے قوم مر کے ہوا تھا جیسا  
پڑ گئی اور یہ کیسی سے اٹھ گئی

نظم ہے یا انتظار ہے کیا ہے  
دلی جواب بے قرار ہے کیا ہے

## شیخ فیاض الدین ناظم

حبیبہ دہانی سے نہ اس تک دل رہنمور گیا  
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

قسمت کو دیکھ لڑتی ہے جا کر کہاں گند  
دو چار باتھ جبکہ لب بام رہ گیا

معاذ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون  
پیا مبر کے ہیں ساتھ آپ باتا تھا

دو دو دل کچھ کہا نہیں جاتا  
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم  
کیا کردوں پر رہا نہیں جاتا

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتم سر نہیں۔

ہے یوں تو زلف یار بھی پر استدر نہیں؟

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ بس کے بچ  
 اہلکی سہی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کی سوچے  
 بے بند خوش رہا اب تم گل رنگزار کے ساتھ

دانا گل تیں ہے کہاں دسترس مجھے  
 تکلیف سیر باغ ذکر اسے ہوس مجھے

دو چیز ہیں یادگار دوران تیرا ستم اپنی جان فشانے

عشق تو قائم : ہوا آپ سے اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

دل ڈھونڈھتا سینہ میں کی مٹی ہے اک ٹھہرے پاں لکھ کا اور آگ دہی ہے

## انعام اللہ خاں یقین

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقین  
 اب کی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے حرج

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو  
 یقین کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کہ

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر جنوں کا عشق  
اس درد کی خدا کے بھی نگہ میں نہ آئیں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے دین مجھ کو  
کیا نیش کر گیا ہے ظالم و دانتہین میں

رواد محبت کی ست پر چھہ یقین مجھ سے  
کیا خوب نہیں سنتا افوں ہے یہ افسانہ

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا  
پہا ر آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریبا

## خواجہ احسن اللہ ربیان

مصلحت ترک عشق ہے نامح یک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا ہوں میں عرش پر اے نالہ جا پہنچ  
کانوں ملک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کدش خار  
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹا

کیا ہوا عرش پر گیس نالہ  
دل میں اُس شوق کے توراہ نہ کی

رہوا ایسی سے کرتی ہے اسے حسیں تر بجھے  
 آہ نیت اس کی بزم میں بارود گر بجھے

میں نے تجھ کو سب سے سزا دیا

میرے تبصرے تو کام ہو چکا کہ بتوں سے تیرے  
 پر دل کے ساتھ منت میں بدنام ہو گیا

یہ دانا میری کچھ نہیں تھمیر  
 مجھ کو میری وفا ہی رس نہیں  
 یوں خدا کی خدائی برقی بہت  
 پر ہیں تو اثر کی آس نہیں

موت پہنچ کہاں تک اب رگڑ کر رہی  
 باہم نہیں اس آہ میں یا آسمان نہیں  
 رہا پہنچ کر کنگال ہے تو اب بے نوا میں  
 وہ کھل جائیں گے وہ چلے طلاق میں

یاں تعاقب میں اپنا کام ہوا  
 تیرے نزدیک جفا ہی نہیں

مانا اثر کو وعلوہ فردا غلط نہیں  
 لیکن کٹی آج یہ شب انتظار کی

غرض آئینہ داسی دل سے  
 تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے

کر دیا کچھ سے کچھ ترسے غم نے  
 اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

ہر چید جی بے ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں  
 آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آگے



دل نے تھمے آگئی سوکھا کھیا کہوں بہر بان دینا ہے

دل مرا یک سے لڑا لے پھرتے ہو کیا کچھ تو ہم سے بھی نرا سیٹے لگی  
آگ آٹھا تو آتش اس نمودن ہر کبیر کی وفا نہ کھا بیٹے گا

فرست زندگی بہتاکم ہے منتقم ہے یہ دید جو دم ہے

## شیخ غلام ہمدانی مصحفی

جلی بھی جا جس غنچہ کی صدا پر نسیم کہیں تو قافلہ نو ہزار بجیرے گا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا  
جھکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

نہ دشت محبت کو سرسبز دیکھا کئی بار خضر اس بیاباں سے گذرا  
ہوئے فرش گل اس کے ہر قدم پر جو دامن کشاں وہ گلستاں سے گذرا

عشق مجھے اہل بصر کر گیا اشک کے قطرے کو گہر کر گیا  
رہ گئے ہم سوتے ہی افنوس ہے قافلہ صبح سفیر کر گیا

کہتے ہیں کہ پھر فصل نکل آئی ہے جنت میں کیوں دست تبون دھوم بجاتے نہیں دیتا

اس چشم کی گردش نے مجھ سے ہی لٹی تھی پڑھنی اپنے تئیں میں زور سنبھالا

کیا یہ میں نام کی کڑی جلوہ گری کا باں عمر کو وقفہ ہے پران سحری کا  
تربیت یہ مری ہوگئی نکل تازہ پڑھ لے احسان ہے مجھ پر یہ نیشم سحری کا

یہ ماہوانگی کہوں کیا میرے سے لوش نے رات  
سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا  
صحتی شہوت کی داوی میں سمجھ کر جانا  
آوی جائے ہے اس راہ میں اکشر مارا

اک طرف مے کدین صحبت ہوئی کہ رات زار کے سرے بخیہ دوستار لے گیا  
ہرگز بجی نہ جلس دن اگر یہ صحتی سو بار اس کو میں سہر بازار لے گیا

شونہی تو دیکھو تیر کو سینے سے بکنج کر کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

کیا یار کے دامن کی خبر بوجھو ہو ہم سے باں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

صحتی ہم تیر سے کھٹے تھے کہ ہوگا کوئی زخم تیرے دل میں آہستہ کام رفو کا ہلکا

شام ہی سے بچا سارا ہوتا ہے دل ہوا ہے چہرے سسکنا

تھوڑا کو کھینچ ہنس پڑے وہ بے مصحفی کشتہ اس اوکا

بے نفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجھو صیاد  
کہ گھڑی گھڑی وہ ہوئے دم بھر اب انسا  
میرے دم لٹنے کی جو خبر سکوری کسی نے  
وہیں نیم رہے تھوڑے بعد لٹنے لگا انسا  
میں عجیب یہ رسم دیکھی مجھے روز عید قرباں  
وہی ذبح بھی کئے تھے وہی لے کر اب انسا

ایک تیر میں جب اس نے نشانہ اڑا دیا  
اس وقت تھکے تھکے ہیں زمانہ اڑا دیا  
دست جنوں سے جب کہ نکلیں اڑنے و بولنے  
ہم نے بھی اپنا جیب سلطانہ اڑا دیا

تیرے کوچے ہر سانس مجھے دن بکرات کرنا  
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا  
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی میں کیا لائی  
کہ گیا تو بھول عالم ادھر انکسارت کرنا

بے گانگی ہے اسکی ملاقات میں ہنوز  
واحد تر کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز

اے مصحفی اس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے  
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفروز

پہنا جو میں نے جامہ دیوانگی تو عشق  
بو لاکہ یہ بدن پر ترے سج گیا لباس

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب چمن میں  
ہر گل کی ڈرائی ہے نیم سہری رنگ

اس کبدن حسی ٹپکتا نہیں تو پھر  
لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیر من تمام

برق و سیلاب نے کہاں پایا  
اس دل بقیہ دار کا عالم  
نکلے ہے اس کی زلف پر خم سے  
سنبل تابدار کا عالم

آئے درائے جس کے لئے چاک کیا ہو  
ناصح سے گریباں کو سنانے کے نہیں ہم

اور سب تم سے مجھ سے بیٹھے ہیں  
لیک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں  
چھٹ چکا جب سے گریباں تب سے  
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں  
شیشہ کی طرح نے ساقی  
چھیر مت ہمکو بھرے بیٹھے ہیں  
مصفیٰ یار کیے گھر کے آگے  
ہم نے کتنے گھر سے بیٹھے ہیں

رہنے دو میرے سیتے میں بیکان کو نہ چھڑو  
از بہر خدا تو ک جاناں کو نہ چھڑو  
ٹکنا رحم کرو چاک گریبان پر چھیرے  
یار و کوئی اس شوخ کے اماں نہ چھڑو  
اس دھوم سے آتی ہے ہمارا بچی کہ ہر سو  
قدغن ہے کہ برگ گل و ریاں کو نہ چھڑو  
یہ وہ نہیں نا سو رک ہو بند کسی سے  
بہنے دو میرے دیدہ گریباں کو نہ چھڑو  
اے نا صحو کچھ فکر کرو چاک جگر کا  
بیہودہ مرے چاک گریباں کو نہ چھڑو  
زلفیں می زائد سے اونگھتی ہیں تو انکھیں  
کہتی ہیں کہ اس مرد سماں کو نہ چھڑو  
رہنے دو پڑا مصغیٰ خاک بسر کو  
اس غمزدہ بے سرو ساماں کو نہ چھڑو

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھے کیا ہو  
سجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھے کیا ہو  
تعاظلوں نے تری ہم سے روز عشریر  
دکھا ہے وعدہ دیدار دیکھے کیا ہو

واں چشم فوں سادہ نے باتوں میں لگایا  
رے بیچ اوجہ زلف اڑالے گئی دل کو

ب زخم جگر سے ہی بنے ۴۹ خون دل ہم کو اب پئے ہی بنے  
 دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے دب یہ دل ہاتھ میں لئے ہی بنے  
 یار کا صبح پر ہے وعدہ وصل ایک شب اور بھی جئے ہی بنے

کچھ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر فصل بہار باغ میں دھویں بھائی گئی

مرغان تیز بال سے شکوہ ہر کہ ہائے ہم کو اسیر جنگل صیاد کر گئے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رشتے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

برق رخسار بار پھر چمکی اس جن کی ببار بھر چمکی  
 میرے گریہ سے آب تاب آیا صورت روزگار بھر چمکی

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے  
 پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے  
 ذرا جواب تو دے اٹھ کے اپنے سائل کو  
 یہ بے نصیب ترے آستان سے کیا پھر جائے

کون اس باغ سے لے باد صبا جاتا رہے رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا رہے  
 دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منت نہ پڑے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا رہے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی کیا گرفتار سے پوچھو ہو چین والوں کی

اے دستِ جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی  
 ایک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے  
 اے مٹھنی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا  
 لیکن نہ لگا اک یہ پریشان ٹھکانے

دخوں کے ہیں نہ تکلیف کرتا صبح ہیں ان دنوں چاک گریباں کا سنا مانع

ملنے کو جو تہم جا ہو تو ہے بات ذرا سی  
 ایک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی  
 نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے  
 ہو جاوے تنگا ہوں میں مکافات ذرا سی

ادوا من اٹھا کے جانے والے تک ہم کو بھی خاک سے اٹھالے

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے الفت تری اس قدر بہت ہے

مجھ کو پامال کر گیا ہے یہی یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

گل کو نسبت ہے اسی واسطے باہل جزو  
 وضع میں اسکی جو ایک جامہ دری بکلی

باد و تو میں کہتا نہیں پہنچوں میں اتنا  
 خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ حین سے  
 دشت تری نرگس فغان میں کچھ ہے  
 دامن میں کچھ ہے نہ گریبان میں کچھ ہے

پہل کے مشت پر بھی اڑاؤ تو سیر ہے  
 نالے تو ہم نے داؤدی غربت میں سر کئے  
 غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے  
 پر خشتگان خاک کو ناحق جگا چلے

کھول دیتا ہے تو جب عا کے چمن میں نقیض  
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے  
ہم نے اس شرخ کو مجبور کیا دیکھا ہے

شاد ہو تو اے شب مجبور  
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

کڑی ہے جب چمن میں نازک ہنال میرا  
ہر شاخ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے

ہیں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا چڑے  
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جانے

اسما کھان کج نقض آئی ہے بہار  
ایسے میں تم بھی دھوم مچاؤ تو خوب ہے

خامچرائے جنوں ابدست درازی تے ی  
چاک جاتے ہیں گریباں کو مے داماں کے

ادیدہ بشرط گریہ ابر بہار سے  
اتنا تو کھیو کہ مری آبرور سے

رملوک اب تو گریباں سے نئے دست جو  
چاک اک جھپکے میں تا دامن بھر پہنچے

جو کچھ شکستہ نقض کی بھی تیلیاں ملیں  
کسی طرح تو ترے دل کو بہراں کرتے

## خواجہ میر حسن، حسن

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی حسن اس نے احساں دوبار کیا

اظہار خموشی میں ہے سوطح کی فریاد ظاہر کا یہ پردا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

امٹد کے آنکھوں سے یک بار بہ چلے آنسو سنہسی سنہسی میں جو ذکر و دایا ہوا

دامن صحرائے انھنے کو حسن کا جی نہیں پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

اسکی جب بزم سے ہم ہونکے تہنگ آتے ہیں اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

پھر چھڑا حسن نے اپنا قصہ بس آج کی شب بھی سوچکے ہم

اترا یونٹ حسن پہ نادان بہت کچھ دیکھا ہے ان آنکھوں نے مری جان بہت کچھ

اس بت کی بندگی سے آزاد ہو حسن یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

شب فراق میں رو رو کے مر گئے آفر یہ رات جیسی تھی ویسی رہی عمر نہ ہوئی

کیا جانئے کہ فتح سے کیا صبح کہہ گئی اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش ہو گئی



شبلم کی طرح میری چن بھی ضرور ہے      رو دھو کے ایک رات یہاں بھی گزاریے

ہے بڑا کفر ترک عشق بستیاں      اپنا ایمان ہم نہ چھوڑیں گے  
دل نہ چھوڑے گا تیرا دامن اور      دل کا دامن ہم نہ چھوڑیں گے

## جعفر علی حسرت

دل پر نہیں اختیار اپنا      افسوس گیا قرار اپنا  
جون لالہ بہار کر رہا ہے      یہ سینہ داغدار اپنا  
کی دل نے بھی آہ بے وفائی      کوئی نہیں غمگسار اپنا

گر ہے یہی بہار کی شورش تو نا صحا      مجھ سے نہ ہر سکے گی گریباں کی احتیاط

کرنک تو اثر کہ اپنے جی سے      اے نالہ بے اثر گئے ہم  
شبلم کی مثال اس چمن میں      شب آئے تھے ہم سحر گئے ہم

## شیخ قلم درخش جرات

جو راہ ملاقات تھی سو جان گئے ہم      اے نحضر تصور ترے قربان گئے ہم  
جمیعت صن آپچی سب پر ہوئی ظاہر      جس بزم میں بحال پریشان گئے ہم

ایک واقف کار اپنے سے کہتا تھا یہ بات  
کیا جانئے کم بخت نے کیا ہم یہ کیا سحر  
جو بات کے جو گھبرات کو ہمان گئے ہم  
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

حال اپنا اس کو محض میں جتا سکتے ہیں  
دور بیٹھے ان آنکھوں میں یہی کہتے ہیں ہم  
دل پڑا تر پیے دے ہم تملتا سکتے نہیں  
تم بلا سکتے نہیں ہم آپ آ سکتے نہیں

دور دل بھی بہت کہا لیکن  
روئے ہے بات بات پر جرات  
اُس نے باتیں نہ کچھ سین نہ کہیں  
بے گرفتاریہ کہیں نہ کہیں

لگ جا گئے سے آج اب بے ناد نہیں  
کیا رک کے وہ کہے ہے جو شک اس لگ چک  
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لڑنے کی حق جی  
ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں  
بس بس پرے ہو شوق اپنے تئیں نہیں  
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسین نہیں

دیکھ لے عیار تو ناک میری بھی عیا ریاں  
غواب میں بھی وہ نظر آتا نہیں مت ہوئی  
کرتے ہیں تیرے لئے کس کس کی خاطر داراں  
جاگتے ہی جاگتے کنتی ہیں اتیں ساریاں

کب بیٹھے ہیں چین سے ایذا اٹھائے بن  
جب تک نہ بقیار ہوں پرتا نہیں قرار  
دیوانہ گر نہیں تو پری رو نہ دیکھیں سیر  
لگتا نہیں ہے جی کہیں بکا لگائے بن  
آتا نہیں ہے چین نہیں تملائے بن  
بگڑے ہے بات حال پریشاں بنائے بن

آہ اس شوق تسک کی اوہر ہو کہ نہ ہو  
ہر دم اسکی جو ملاقات میں ہو فرق تو آہ  
گزرے ہم جی ہی سے اب کس گذر ہو کہ نہ ہو  
حال ہر لحظہ مرا فوج دگر ہو کہ نہ ہو

ہے یہ ڈھب یا دھنسی کا اُسے جو اُس کے کوئی  
بس کسی کے تئیں جلدی سے بلا لیتا ہے

کیا پچارے سرنگوں میں آئی فرمیا  
جس جگہ رہتے ہیں جرات ہم مرین ختم یا

جو خواہش اس آنکھوں میں کڑی نظر ملانے کی  
گئے ہو جب تم یاں ہی نہیں بندھتے ہیں  
تو کہتے ہیں بنائی تو نے کیوں صورت دوانے کی  
دل وحشی کو خواہش ہے تہاں درپہ آنے کی

جی کے گن جانے کا کچھ بایا دلا تو نے مزا  
سوزش پروانہ ہوتی اس طرح کس سے بیان  
ہم نہ کہتے تھے بری ہوتی ہے دیوانے لگی  
جو غمخوئی میں زبان شمع بتلانے لگی

ہجر میں مضطرب سے ہو ہو کے  
نا صحا اس کو چھوڑ دیں کیونکر  
پیار سو دیکھتا ہوں رورو کے  
جس کو پایا ہو جان کھوکھو کے  
جاتے ہیں بے قرار ہو ہو کے  
گو بلاوے نہ ہم کو وہ جرات

قشقہ جو وہ کھینچے تو کھینچی جاتے دھرجا  
بیہوش سا محفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا  
اور چھوڑ دے زلفوں کو تو اس بار ہی ڈالے  
ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کچھ نہ سنے گالے

دیکھوں جرات اس کو تو کہتا ہے یہ نہ پھیر کے  
کن بری آنکھوں سے دیکھے ہے یہ سودا ہی مجھے

صحت اب یار میں اور مجھ میں کچھ شعلہ خض  
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں گھٹاتا ہے مجھے

اس کے آنے تک اسے دلِ میار جس طرح ہو سکے جیسے ہی بنے  
تو وہ آرام جاں ہے اسے کافر کہ گئے سے نکالے، یہی بنے  
رہوں جس جا کہیں یہ ہمسائے اس کو یاں سے اٹھا دیکھے ہی بنے

تو گیا اور ہم تری صورت کو دیکھتے رہ گئے  
حاشقوں کے دلِ بلاق یاں کے موتی کی طرح  
کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ  
ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ  
بجز دیکھ روئے تو پتہ نہ رہے تھے دیکھے  
بوسہ کی خواہش میں اس لب پر پٹکے رہ گئے  
شکر دیکھے مانند صحرا میں بھٹکتے رہ گئے  
اور ہم حراتِ پلک اپنی جھپکتے رہ گئے

جراتِ بلند مرتبہ عشق ہے بہت ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں سے سے

غم مجھے ناتوان رکھتا ہے شق بھی اک نشان رکھتا ہے  
شوق سننے کا ہے تو سن آکر دردِ دل کا بیان رکھتا ہے

ہے یہ ہوس کہ نصرت پر واز ایک بار صحنِ چین میں جھکا بھی لے باغیاں لے  
یہ بھی نہو سکے تو بھلا مجھ اسیر کو ایک دم قفس میں نصرت آہ و فغاں لے  
لے راہرو وغیرہ ہیں بڑا ست کی یلجیو حسرتِ زدوں کا تم کو جہاں کارواں لے

محروم ہیں اگرچہ دیدار سے یہ آنکھیں پر حسن کا کرشمہ دل میں سما گیا ہے

کہاں رنگل میں صفائی ترے بدن کی سی بھری ہماگ کی تس پر یہ بودھن کی سی  
یہ دھشتِ خار اب اپنے قدم کی برکت سے قدم قدم پر بہاں ہیں ہوجن کی سی  
جہتاؤں دردِ محبت تو کس اداسے کہے کرو نہ مجھ لئے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی

وہ ایک تو ہے مہجہو کا ساتھ لے جرات اتر تو بھی قیامت ہے بانگ بن کی سی

اجل گر اپنی خیال جہاں یاریں آئے تو پھر بجائے فرشتہ بری خیز میں آئے  
 بیک کر شہ جو بے اختیار کر ڈالے وہ عشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے  
 پس ارفنا جو تو دل چلے گی خاک اٹھے تو مضطرب سا دھواں اک نفر غبار میں آئے  
 اٹھے جہاں سے نہ جرات اٹھ کے دردِ فراق الہی موت بھی آئے تو وصل یاریں آئے

دور چھوڑا میں گلشن سے روئے کی ہے جا کہ منزاوار اسیری بھی نہ ہم ہاسم ہوئے  
 دم نہ قصص کہے جرات کوئی اس کا فرسے اک مسلمان کو کیوں جاتے ہو تر پائے ہوئے

مطف بنے یار ہیں سیرِ نکلان کبے دیکھے دیدہ گریاں گل خندان کبے  
 آنکھ جس سے ہو لگی وہ ہی ہوا پس تو پھر رنگ آنکھوں میں نضائے چنتاں کبے  
 جرات اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سیماں کبے

ازل سے گرفتار پیدا ہوا ہے یہ دل کیا مزے دار پیدا ہوا ہے  
 کہ دمنغ ناصح کو ہم سے نہ بولے کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے  
 کہے گر کوئی اس سے ملنے کو جرات تمہارا طلب نگار پیدا ہوا ہے  
 تو کہتے ہے وہ از رہ طبع ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے

قصہ مصلے وہ اٹھنے کا کرے ہے حقیقت دل بیتاب وہیں مجھ کو تبا دیتا ہے  
 ہم تین صفت ہو تھا گردہ سنوں بات قوی اک تصور ہے کہ وہ دھیان ٹا دیتا ہے

از بسکہ دل سے جرات نہ کہیں جس کے ہم سجدہ کریں اسی میں سجدہ جو ہے پری کی

ہماری تھے قافلے سب فریاد سے ہماری بے تابیوں کے مارے ہم کارواں کے نکلے  
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے اسکی چٹون سے تھا یہ ظاہر شخص ار سے نکلے  
اس انجن میں جرات سب کو مایا آئے حسرت بھرے پُر ارمان اک ہم وہاں سے نکلے

مجھ سے پوچھے ہے مجھ کو کہ حقیقت میری کچھ تو ہے بے خسروی بات بنانے دے مجھے  
انگلیاں پاؤں کی اب اپنی وہ دہرائے ہے کچھ تو ہے پاس ادب یاد بڑھانے دے مجھے  
تو بھی پھر پوچھو جرات سبب حیرانی پہلے آئینہ ذرا اسکو دکھانے دے مجھے

مت خا ہو یک دم یاں مٹنے سے سقدہ تک نہیں سن دیکھ کر اے مہر اٹھ جائیے  
ہم بھی اس ناغہاں میں شب کی شبمانی کی مثل شبنم صبح کو گریہ کیاں اٹھ جائیے  
تب منع عشق کا سودا بنے جرات بڑھا دوسرے سودو زیاں کے سبیاں اٹھ جائیے

مجھ کو ڈر ہے کہ کرے خسرت زریا یہ کہیں زریا اس دل مضطر کو دوائے رکھے  
بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کشتِ محو آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھے  
جب وہ بکھرے ہے تو کہتے ہیں یہی کارِ غور منہ نہایت ہوئے تیوری کو چڑھائے رکھے  
مٹنے محفل میں جو وہ تو یہی جی چاہے ہے روز و شب بس لوں یہی صحبت کو چاہے رکھے  
کچھ لگاؤٹ کا سبب اور نہیں پر جرات یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی لگائے رکھے

زیرِ خراب اس در یہ جو درباں نے لگائی کیا آہوں کی دھونی دل نالائے لگائی  
جامہ ترے وحشی کو کسی نے جو ہٹا یا قسمی وہیں گردن میں گرہاں نے لگائی  
اک آن پلاک سے نہیں تھکی پلکائے دئے بے تابی یہ مجھ کو تری مرزا گان نے لگائی

ہم کلام اتنے نہ جرات ہو تم رک رک کر بات اس بات سے کچھ اور میاں کھلتی ہے

جی جلا کر دل میں بے صدقے تمہارے جانے  
دیکھ مغلطہ رزم میں جھکے آنکھوں میں کیا  
گو بہر صورت میاں جرات بگاڑے تم نے

بھری جو حسرت وہ اس اپنی گفتگو میں ہے  
یہ حال ہے تیرے وحشی کے جیسے وہاں کا  
سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے جوتن میں  
جواب چشم کو جرات نے دی بصارت تو

پھرتے ہیں دن کو کچھ گزرے ہے شب کہ ہنستے  
ہستے یہ کیوں خرابیاں گر نہ کسی کو چاہتے

یا دس گل کی تھی یا رب مے تن میں لگی  
رنگ یہ لائی کہ حسرت سے ساکت ہے دل  
تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی تھی وہ کیا بڑا  
آگ سی دل میں جو برنگل و گلشن سے لگی  
اس کے قدموں سے خواہنے عجب نچ لگی  
تیس شرم نے جو شب اس مردشن سے لگی

نک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے  
یا رب یہ کس کے گھر سے میں نکلا کہ خلق میں  
جون بوئے گل کرے ہے زخوردنتمہ بومری  
ہے داستان در بدر و کو یہ کو مری

ہے شونخ کا مار زلف کالا کافر  
اس چشم پر آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا  
حلقہ مارے ہے تس یہ بالا کافر  
”جادو برحق ہے کرنے والا کافر“

شب ہجران نہیں بلا ہے یہ صبح ہوتی نہیں ہے کیا ہے یہ

ناصر میں اور ہم میں یں طرزِ بہشتیں ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے

جوشِ گل چاکِ چمن سے دم بدم دیکھائے سبے لونی میں بنائیں اور ہم دیکھائے

## میر انشا اللہ خاں انشا

جگو کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا لگا کے برف میں ساقی مراچی مئے ما  
محل کے وادی وحشت سے دیکھ لے محول کہ زورِ دھوم سے آتا ہے نافتہ لیلیا  
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھو انشا نیم صبح جوا چھو جائے رنگ ہو میللا

بجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب اٹا کہ پڑا ہے آج خم میں قلع خراب اٹا  
چلتے تھے حرمِ کورہ میں مجھے اک صدمہ طاش ہوا ثواب حاصل یہ لیا عذاب اٹا  
یہ تعجب مزا ہے یارو کہ بروزِ عید قربان وہی فوج بھی کرے ہے وہی ہے ثواب اٹا

گرمیار مئے پلائے تو پھر کیوں نہ بیجئے زائد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

مکر بانہ سے ہوئے چلنے کو یاں سب مجھے مینا بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں  
نہ پھیرے نہکت بادِ بہاری راہ لگا اپنی تجھے اٹھکیاں سو جھی ہیں ہم بنارٹھے ہیں  
قصورِ عرش پر ہے اور سر پہ پائے ساتی پر غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی تھوڑے بیٹھے ہیں  
بسانِ نقشِ پائے رہروان کوئے تناسی نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں چار بیٹھے ہیں  
جلاگردشِ فلک کی چین دیتی ہے کے انشا غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں



چند مدت کو فراق صدمہ دیر تو ہے جلد بھر کبھی ہو آئیں بھلا میرے تو ہے

جھڑکی بھی ادا اسی چین جیسی ہے یہ سب ہسی پر ایک نہیں کی نہیں ہسی  
گزنا زین کے کہنے سے مانا بار ہو کچھ میری طرف تو دیکھئے میں ناز میں ہسی

• غنچہ گل کی صبا گود بھری جاتی ہے اک پر ی آتی ہے اور ایک پر ی جاتی ہے

## شیخ ابراہیم ذوق

آنکھیں مری تلواروں کے بل جائے تو اچھا بے حسرت پاؤں نکل جائے تو اچھا  
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا  
ہے قطع رہ عشق میں بے ذوق ادب شرط جوں شیخ تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

وہ توں میں وہ نور و شوق میرے ساتھ جاتا ہے بزم گدا میرے ہوا نقش قدم میرا

آتی ہے صدائے جرس ناقہ رسیلی صد حیف کہ مجھوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

ل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا یہ بھی لہو دگ کے شہیدوں میں مل گیا

مقدم ہی پر گر سود و زیاں ہے تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

نذکر تری بزم میں کس کا نہیں آتا یہ ذکر ہمارا نہیں آتا ہمیں آتا  
ہم رونے پر آجائیں تو دریا ہی بہا دیں شبنم کی طرح سے نہیں رونا نہیں آتا

دیوے ساقی جے اک جام وہ دعوے ہے کجے کج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس  
زندگی چند نفس ہے کہو زہد سے کہ تو پاس کریش کا کیا کرتا ہے پاس انفس

تک نہیں حرف دل نشیں تھا، دہن کی سنگی سے تنگ ہو کر  
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

ہاں تان دم نازک تنگنی خوب نہیں ابھی جھاتی مری تیروں کے چھنی خوب نہیں  
خوئیاں یوں تو ہیں اس عالم تصور پر مرہب اک مگر ناز سے یہ کم سنی خوب نہیں  
یہ نہیں شیشہ شے ہے کسی سوز کا دل معتد بہ یکہ ذکر دل شکنی خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چا تر ہے جی باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں  
احسان نا خدا کے انصاف کے مری بلا کشتی اُخدا پر چھوڑ دوں انگڑی کو توڑ دوں  
نازک کھائیاں مری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں  
پھر اس شرہ کو یاد کرے دل تو دل میں قی نہ تر چھو کے میں سر نہ تر کو توڑ دوں  
یاں لب پر لاکھ لاکھ سخن اسطر اب میں وال ایک خاموشی تری کے جواب میں  
ہم اپنے بندہ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

ہے ان کی سادگی بھی کس کس عین کسانہ سیدھی سی بات بھی ہے تو ایک بالنگ کے ساتھ  
ناخن نہ دے خدا تجھے اے سنجبہ جنوں تیرے ارادے جسم کے تو پیراں کے ساتھ

بخت لے زندان جنس زنجیر رکھ کا ہے ہر مژدہ تھار دشت پھر تلو امر کھجور شہر  
مہر و وقت بیع اپنا اس کے زیر پائے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لو گنے کی جائے ہے  
اُن ہی بیابی کریاں تو دم ہی کھانا ہے لہ بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے

سک کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے  
ہر اک گردن میں سواں ناز و فتنہ را سمجھے  
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت خدا  
فلک کو ہم کتنی کافر کی چشم سر سا سمجھے  
حسابِ صفا نہ پوچھے جب سے میرے دل کے رنجوں کا  
حساب و ستاں دردِ دل اگر وہ دلِ بابا سمجھے

ہے میرے کان زلفِ معبر لگی ہوئی  
کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوسِ تاکِ جہانک  
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی  
چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی  
پر وہ ان سے ہے شیخ مقرر لگی ہوئی  
لے ذوقِ دیکھ دینتر ز کو نہ منہ لگا

خوب رو کا نکالتیوں سے مجھے  
واجب القتل اس نے ٹھہرایا  
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے  
آیتوں سے روایتوں سے مجھے  
اُس سر سے سب نہایتوں سے مجھے  
لے کئی عشق کی ہدایت ذوق

حزے جو موت کے عاشق بیاں کھجھکتے  
اگر یہ جانتے چن جن کے ہم کو توڑیں گے  
صبح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے  
تو لگی کبھی نہ تمنائے رنگِ بو کرتے  
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے  
سراغِ عمر گزشتہ تھا کھجھکار گھر ذوق

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چن میں اے ذوق  
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکتِ دل

پنچے تری پنچہ دہنی کو نہیں پاتے  
ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

اے شیخ تیری عمر طبعی ہے ایک رات  
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے  
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نگہ کا اور تعادل پر پھرنے جان مچی جلی تھی بر جھی کسی پر کسی کے آن لگی

اب تو گھر کے یہ کہتے ہیں کہ رہائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کہہ جائیں گے

دروازہ میکہدہ کا نہ کہ بند محاسب ظالم خدا سے ڈر کہ در تو بر باز ہے

باز آیا دیکھنے سے زائش رخوں کے دل سو بار آئے اُسے آنکھیں دکھا چکے

ابلی کس نے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے

کہ آج کو چہ میں اس کے شورباتی ذنب قلمتی ہے  
ہوئے میں تر گریہ ندامت اس قدر آئین دامن

کہ میری تردامنی کے آگے عرق پاکدامنی ہے

صبا جو آئے حسن و خار گلستاں کے لئے  
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے  
قفس میں کیونکہ نہ پھر کے دل آشاں کیلئے  
رہا ہے سینے میں کیا چشم خوش نشاں کیلئے  
بیان درو محبت جو ہو تو کیونکر ہو  
زباں نہ دل کے لئے نہ جو دل زباں کیلئے

## اسد اللہ خاں غالب

تھا خواب میں خیال کا تجھ سے معاملہ  
تیسے بغیر مر نہ سکا کو بہن اسد  
جب آنکھ کھل گئی نہ زبان تھا نہ سودھتا  
گر گشتہ خار رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زلیت کا مزہ پایا  
درد کی دو اپائی درد بے دو پایا

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم  
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری  
شور پسند ناصح نے دُخم پر ننگ چھڑکا  
آہ بے اثر دیکھی 'نالہ' مار سا پایا  
حسن کو تغافل میں جرات آزا پایا  
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیلئے پایا

شوق پر رنک رقیب سرو سامان نکلا  
زخم نے دادِ دوی تنگی دل کی یارب  
بوسے گل 'نالہ' دل 'دود' چراغِ محفل  
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا  
تیر بھی سینہ بسل سے پرافشاں نکلا  
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

شونی رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک  
تھی نو آموز قفا، بہت دشوار پسند  
آخر اے عہد شکن، تو بھی پشماں نکلا  
سخت شکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

سائیش گرے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا  
کیا آئینہ خاند کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے  
مری تعمیر میں معمور ہے اک صورتِ خرابی کی  
وہ اک گلدستہ ہی ہم بخودوں کے طاقِ نیاں کا  
کرے جو پر تو خورشید عالمِ شہنشاہ کا  
یہ سونی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دماغ کا

بہت تھی چمن سے لیکن اب بے دماغی ہے  
کہ مہج بڑے گل سے ناک میں آتا ہوم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی  
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اورافوںِ حاصل کا

دنگ شکستہ صبحِ بہارِ نظار ہے  
کاوش کا دل کہے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز  
یہ وقت ہے شگفتنِ گل اے ناز کا  
ناخن پر قرضِ اسما گروہِ نیم باز کا

بس کہ دھوا ہے ہر کام کا آسان ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آپ جانا اُدھر اور آپ ہی میرا ہونا  
ہے اس زود پیشاں کا پیشاں ہونا  
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو  
کی مرے قتل کے بعد اس نے جھانے  
جیف اس چار گزہ کپڑے کی قسمت غائب

زخم کے بھرنے تک ناخن بڑھائیں گے کیا  
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا  
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا  
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا  
ہیں گرفتار وفا زندان سے گھرائیں گے کیا

دوست غم خواری میں میری سہمی فرمائیں گے کیا  
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کہ تلک  
حضرت ناصح گرا آئیں دیدہ و دل فرشاہ  
گر کیا ناصح نے ہم کو قتل اچھا ہوں سہی  
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا  
کہ خوشی سے مرنا جاتے اگر اعتبار ہوتا  
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا  
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگہ کے پا ہوتا  
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر اضرار ہوتا  
مجھے کیا برا تھا مرنے اگر ایک بار ہوتا  
تبھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ دقتی ہماری قسمت کو دو سال یا رہوتا  
ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ بان بھوٹ جاتا  
تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا جہد ودا  
کوئی میرے دل سے پوچھے تے تیرے کش کو  
یہ کہاں کی دوستی کہ کہنے میں دوست ناصح  
رنگ سنگ سے نیکنا وہ لہو کو پھر نہ تھمتا  
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری جا  
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

کہاں تک اسے سراپا ناز کیا کیا  
شکایت ہائے زنجیں کا گھا کیا  
تغافل ہائے تمکین آزما کیا  
غم آوارگی ہائے صبا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا  
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں  
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں  
دماغ عطریرا ہن نہیں ہے

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا  
شبیدان تنگ کا خون بہا کیا  
شکت قیمت دل کی صد کیا  
شکیب خاطر عاشق ہلا کیا  
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا المیہ  
حیا کیا ہے میں نہ من اوھر دیکھ  
من اسے غارت گر جنس وفا سن  
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ  
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر

ہر گل تر ایک چشم خوں نشان ہو جائے گا

بلغ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا  
اک تماشا ہوا نگلا نہ ہوا  
تو ہی جب تخیل آزمائے ہوا  
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

درد منت کش دوانہ ہوا  
جمع کرتے ہو یہ کویں رقیبوں کو  
ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
کتھے شیریں ہیں تیرے لب کو رقیب  
جان دی ہوئی اسی کی تھی

گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا  
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا  
خنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے ہی

گر میں نے کی تھی تو بے ساقی کو کیا ہوا تھا  
جب رشتہ بے گرو تھا ناخن گرہ کشا تھا

میں اور بزم مئے سے یوں شہنہ کام آؤں  
درد مانگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

بھر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا  
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو دیراں ہوتا  
تنگی دل کا گلہ کیا کہ وہ کا فردل ہے

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا      دل، جگ تشنہ فریاد آیا  
 دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز      پھر ترا وقت سفر یاد آیا  
 سادگی ہائے تمنا یعنی      ہمسروہ نیزنگ نظر یاد آیا  
 زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی      کیوں ترا راہ گذر یاد آیا  
 کوئی ویرانی سی ویرانی ہے      دشت کو دیکھ کے گھراؤ آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا      آپ آتے تھے گویا غمان گیر بھی تھا  
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا کھلا      اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا  
 قید میں ہے تے وحشی کو وہی زلف کی یاد      ہاں کچھ اک پنج گراں بارہی زنجیر بھی تھا  
 بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا      بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا  
 بچڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے نالہ      آدمی کوئی ہمارا دم خسیر بھی تھا

توفیق بے اندازہ ہمت ہے ازل سے      آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر ہوا تھا  
 جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم      میں معقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا  
 دریائے معاصی تنگ آبی سے ہوا خشک      میرا سرد امن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف      عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہر کس کا آشنا  
 میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے      عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا  
 کو بھن نقاش یک مثال شیریں تھا اسد      سنگ سے سراور کہ ہووے نہ پیدہ آشنا

ذکر اس پری وش کا اور چھریاں اپنا      بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا  
 مے وہ کیوں بہت پیتے بزم فیض یارب      آج ہی ہوا منظور ان کو امتحان اپنا  
 نے وہ جس قدر دولت ہم منہی میں نہیں گئے      بارے آشنا نکلا ان کا پاسبیل اپنا



دردِ دل لکھوں کبتک جاؤں ان کو دکھا دو  
انکھیاں فگار اپنی خامہ خوں چکیاں اپنا  
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو  
دوست کی شکایت میں ہم نے ہنریاں اپنا  
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنریاں تھیں  
بے سبب ہوا غالب دشمن ہمارا اپنا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ  
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا  
بیچ غم بسرے گذری کیوں نہ جائے  
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا  
پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے  
کوئی بستلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حریفِ جوشِ دریا نہیں خود درئی ساحل  
جہاں ساقی ہو تو باطل و دعویٰ ہو تیلہ کی

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا  
دل سے مٹا دی انگشتِ خانی کا خلی  
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا  
گر نہیں نہمت گل کو ترے کوچے کی ہوس  
کیوں ہے گردِ رہ جو لان صبا ہو جانا  
بخنے ہے جلوہ گل ذوقِ تماشا غالب  
جشم کو چاہئے ہر رنگ میں دوا ہو جانا

رہطیکِ شیرازہ وحشت نہیں اجئے بہار  
ہنر و بیگانہ، مہا آوارہ گل نا آشنا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے  
رنگ اڑتا ہے گلستان کے ہوا داروں کا

لیک ایک قطرے کا بھجے دینا پڑ احباب  
خون جگر و دیتِ فرکانِ یار تھا  
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر آب  
دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا

بیل کے کاروبار پہ ہیں خند ہائے گل  
کہتے ہیں جس کو عشقِ خلل ہے دماغ کا

لب خشک در تشنگی مردگان کا  
غریب بدر جستہ باز گشتن  
سراپا یک آئینہ دار گشتن  
ہمہ نا امید ی ، ہمہ ہند گمانی  
بصورت تکلف ، بمعنی تاسف  
زیارت کردہ ہوں دل آزدگان کا  
سخن ہوں سخن براب آزدگان کا  
ارادہ ہوں یک عالم آفرندگان کا  
میں دل ہوں فریب و فاختہ زدگان کا  
اسد میں تبسم ہوں پرمردگان کا

(نستہ بحدیدہ)

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میر بعد  
کون ہوتا ہے حریفے مردانگن عشق  
آئے ہے بنے محسوس عشق پر رونا غالب  
بائے آرام سے میں اہل جنائیر سے بعد  
ہے مکر لب سانی یہ صلیب سے بعد  
کس کے گھر جائے گا سیلاب بنا میر بعد

لوہم مریض عشق کے نیما ردار ہیں  
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر  
چلتا نہیں بے دشتہ و خجریہ بغیر  
نبتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر  
چھوڑوں گائیں نہ اس بت کافر کا پوجنا  
مقصود ہے ناز و غرہ و لے گفتگوں کام  
ہر چہ ہوا مشاہدہ حق کی گفتگو

ان آبلوں سے پاؤں کے گھرا گیا تھا میں  
گفتی تھی ہم پر برق تجسلی نہ طور پر  
سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا  
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر  
دیتے ہیں بادہ طرف قلعہ خوار دیکھ کر  
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ دناص سے غالب کیا ہوا اگر سن نہ دے  
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

ہے بلکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشان اور  
کرنے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یار بے باوہ نہ سمجھے ہیں مجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

نہ کچھ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز  
تو اور آرائش خم کا کل  
لافت تمکین فریب سا وہ دلی  
ہوں گرفتار الفت صیاد  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز  
ہم ہیں اور سارے سیتہ گداز  
وراثہ باقی ہے طاقت پر واز

آء کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک  
دام بہ موج میں ہے صنفِ صد کام نہنگ  
خدا شہیدِ عصمِ خدیب اور تنائے تاب  
ہم نے مانا کہ فنا غل نہ کر دے لیکن  
پر تو خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم  
کون جیتا ہے تری زلف کے سرخونے تک  
دیکھیں کیا نڈر سے ہے قطرے بہ گہ نونے تک  
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر نونے تک  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو بھر نونے تک  
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر نونے تک

اذا آنجا کہ حسرت کش یار میں ہم  
رسیہ ن گل باغ و اما ندگی ہے  
نفس ہو نہ مغرول شعلہ دروون  
تماشائے گلشن متنائے چیدن  
نہ ذوق گریباں نہ بولے دالہا  
استدشکہ کفر و دماناں پاسی  
رقیب متنائے دیدار ہیں ہم  
عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم  
کہ ضبط پیش سے شہر کار ہیں ہم  
بہار آفرینا اگنہ گار ہیں ہم  
نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم  
ہجوم تنائے لاچار ہیں ہم  
(سوقہ حمید بیہ)

آہ کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں  
ذوق ہستی ہے عشق خاد ویراں ساز سے  
زخم سوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا بطن  
ہے گریباں ننگ پیر میں مجھ دامن میں ہیں  
اجن بے شے ہے گز برقِ خم میں ہیں  
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

کس مزے شکر کیجے اس لطف خاص کا  
ہم کو ستم مزید ستم ہو کہ ہم غریب  
پرستش ہے اویسے سخن درمیان نہیں  
ناہرباں نہیں ہے اگر ہر باں نہیں

عشق تا پیر سے تو مید نہیں  
ہے تجلی تری سامان وجود  
جاں سیاری شجر بید نہیں  
ذرہ بے پر تو خورشید نہیں  
راز معشوق نہ رسوا ہو جائے  
ورنہ مر جانے میں کچھ بید نہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
ترے سرو قامت سے اک قد آدم  
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں  
قیامت کے نفع کو کم دیکھتے ہیں  
تماشا کراے عوایں نہ داری  
تجھے کس تمنا سے ہم داغ دیکھتے ہیں  
بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب  
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دو جام  
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں  
جو شکر وفا ہو فریب اس پر کیا چلے  
کیوں بد گناہ ہوں دست سے دکن کجا میں  
میں اور خط وصل خدا سزا بات ہے  
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا  
لاکھوں بناؤ ایک گجڑا نعتاب میں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھتے تھے  
شرم اک او اے ناز ہے اپنے ہی سے سہی  
نے ہاتھ باگ پر سے نہ پا ہے رکاب میں  
ہیں کتنے بے حجاب کہیں حجاب میں  
ہے غیب غیب جس کی سمجھتے ہیں ہم شہود  
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چو زانہ رشک کے ترے گھر کا نام لوں  
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جالوں کفر کو میں

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے رنگ و نام ہے  
 پہچانتا اگر تو لٹا ناہنگر کو میں  
 چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اکیتے رنگ کا

نالہ جگر حسن طلب لے تم ایجاد نہیں  
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں پرست معلوم  
 عشق و مزدوری عشق تو خسرو کیا خوب  
 کم نہیں جلوہ گری میں سے کوچے کے بہشت  
 ہے تقاضائے جفا شکوہ بیدار نہیں  
 دشت میں ہے مجھے وہ عشق کہ گھر پاؤ نہیں  
 ہم کو تسلیم نگو نامی نسر ہوا نہیں  
 یہی نقشہ ہے وئے اس قدر آباد نہیں

دو فوج جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش با  
 تھک تھک کے ہر مقام پر دو چارہ گئے  
 یاں آپڑی یہ شرم کہ مکار کیا کریں  
 تیرا پتہ نہ پایاں تو ناچار کیا کریں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں  
 تم ان کے وعدے کا ذکر ان کے کیوں غالب  
 کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں  
 یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے  
 تیری فرصت کے مقابلے عمر  
 نشہ رنگ سے ہے دامن گل  
 اہل تدبیر کی واما ندگیاں  
 ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں  
 برق کو یا بہ خنایا بندھتے ہیں  
 مست کب بند قبا باندھتے ہیں  
 آبلوں پر بھی خنایا بندھتے ہیں  
 ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
 یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آریاں  
 خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ نہاں ہو گئیں  
 لیکن اب نقش و نگار طاق نیاں ہو گئیں  
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پشیاں ہو گئیں  
 تیرا دماغ اس کا ہے لڑائی کی

وہ نگاہیں کیوں مٹی جاتی ہیں تار پل کے پار جو مری کوتاہی قسمت سے فرغانہ ہو گئیں  
جانفراہیہ بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب بکریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا رستے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خیال جلیں گل سے خراب ہیں میکش شرابِ خاد کے دیدار و در میں خاک نہیں  
ہوا ہوں شش کی غارت گری سے فرزند سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے زنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں بیٹھے ہیں رہ گزر یہ ہم کوئی ہمیں ستائے کیوں

جب وہ جمال و لغز و صورت مہر نیم روز آپ ہی ہو نظر رہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

حسن اور اس پر حسنِ طن، رہ گئی بوا اہوس کی شرم اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آواز مائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا بھی جس کو بودین و دل عزیز اس کی گلی میں جا بے کیوں

واں وہ غرور و عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع راہ میں ہم طیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

غائبِ حصہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئے زار زار کیا، کبھے ہائے کیوں

غنجہ نامہ سلفہ کو دور سے مت دکھا کر یوں  
پرسش طرز دلبری کبھی کیا کہ بن کہے  
میں نے کہا کہ زم تاز چاہیے غیر سے تھی  
کب مجھے کوئے یا کہیں ہنسنے کی وضع یاد تھی  
گرتے دل میں ہو خیال اصل میں تو گراؤں  
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں نہ سے مجھے تاکہ پو  
اس کے ہر اک اشارہ میں نیکی و یاد اکہ پو  
سن کے ستر ظریف نے مجھ کو اکھا دیا کہ پو  
آئینہ دار بن اٹھی نہیرت نقش پاکہ یوں  
صبح محیط آب میں ٹالے ہے دست پاکہ یوں

طاعت میں تاپے نہ سنے وہ نگیں کی لاگ  
دوزخ میں ڈال دو کوئی نے کر بہشت کو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال  
ہنگامہ زبانی ہست ہے انفعال  
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو  
حاصل نہ سمجھتے ہم در سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

خدا شائے اہقوں کو کہہ رکھتے ہیں کشاکش میں  
وفاداری بشرط استواری اصل ایل ہے  
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دہن کو  
مرے بت خانے میں کہے میں گارڈ و برہن کو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ  
ہے جو ش گل پہار میں یاں تک کہ ہر طرف  
ہو کر اسیر و اتے ہیں اہرن کے پاؤں  
رشتے چھٹے ابھتے ہیں مرغ چین کے پاؤں

تم جاؤ غیر سے جو تبیں رسم در راہ ہو  
ابھرا ہوا نقاب میں ان کے ہے ایک تار  
مجدد ہو، مدرس ہو کوئی خاندان ہو  
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو  
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا ناناہ ہو  
سزا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو  
جب میکہ چھٹا تو چہر اب کیا آنچہ کی قید  
نستے ہیں جو بہشت کی تعریف سب سے

ہائے ذمہ میں اس فکر کا ہے نام و صلا  
کہ گر ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجیے  
 حیا ہے اور یہی جو منگو تو کیونکر ہو  
 تم ہی کہو کہ گداہہ ہضم رستوں کا  
 تلوں کی ہوا اگر ایسی ہی تو کیونکر ہو  
 قلعہ نہ تھا ہمیں نظر پر شکارِ تسلی کا  
 نہ مانے دیدار جو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سچ فضاں کیوں ہو  
 نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو بھر منہ میں زبان کیوں ہو  
 کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو  
 نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا زداں کیوں ہو  
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا پھیرا  
 تو پھر اسے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو  
 قفس میں مجھ سے رو دادِ جہنم کہتے نہ ڈر ہدم  
 گری ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو  
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ  
 کہ جب دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں کے نہاں کیوں ہو

بیادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم ہر ایک داغِ جگر آفتابِ عشر ہو  
 ستم بخشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا اب اس سے ربط کروں جو بہت سنگرا ہو

میں کے زیر سایہ خرابات چاہیے بھوں پاس آنکھ قبلہ عاجات چاہیے  
 مجھ سے غرضِ نشاط ہے کسی رویا کو ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی  
 سو رہتا ہے باندا ز چکیدن سرنگوں وہ بھی



رہے اس شوخ سے آزر دہ ہم چندے تکلف سے  
 تکلف برطنت تھا ایک انداز جنوں وہ بھی  
 نہ کرنا کاشش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمد  
 کہ ہو گا باعثِ آخر الیش دردِ دروں وہ بھی  
 مئے عشرت کی خواہش ساقی گروں سے کیا کجھے  
 لئے بیٹھائے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی  
 مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجر  
 خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گھر میں تھا کیا کہ تراغم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ قیصر ہے  
 تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھو دکھو دے پوچھو حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں لگ رہی ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی  
 قطع نہ کیجئے نہ تعلق ہم سے  
 میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی  
 اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو  
 عمر ہر چند کہ ہے برقِ خدام  
 ہم کوئی ترک و فاکر تے ہیں  
 ہم بھی تسلیم کی خود ایں گے  
 یا رے پھیر چلی جائے اسد  
 میری وحشت تیری شہرت ہی سہی  
 کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی  
 اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی  
 آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی  
 دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی  
 نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی  
 بے نیازی تری عادت ہی سہی  
 مگر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا  
 جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم  
ہو جس گل کا تصور میں بھی کھلے نہ رہا  
لے لیا مجھ سے سری تہمت ملی نے مجھے  
عجب آرام دیا بے پروائی نے مجھے

آگ رہا ہر درویش کے سرو غائب  
ہم سیاہاں میں ہیں اور گھر میں بہا آتی

دیکھنا تفریق کی لذت کہ جو اس نے کہا  
مگر چہ ہے کس کس برائی سے ملے بائیں ہمہ  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے  
یہ جو اک لذت ہماری سبھی حاصل میں ہے  
رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جھڑک اتر گئی  
شقی ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ  
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی  
اٹھتے ہیں اب کہ لذت خواب سحر گئی  
بارے اب اسے ہوا ہوس بال فر گئی  
صبح خرام یار بھی کیا گل کستہ نچئی  
اب آبروئے شیمہ اہل نظر گئی  
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی  
گل تم گئے کہ ہم پر قیامت گذر گئی  
وہ دلا لے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کوئی اُمید برہنیں آتی  
آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی  
اب کسی بات پر ہنیں آتی  
ہے کچھ ایسی بھی بات جو چپ ہوا  
ورنہ کیا بات کرہنیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  
کچھ کس نہ سے جاؤ گئے غالب  
کچھ ہماری خبر نہیں آتی  
شرم تم کو سگر نہیں آتی

دلِ نادان بٹھے ہوا کیا ہے  
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار  
یا الہی یہ ماجرا کیا ہے  
کاش بد چھو کہ مدعا کیا ہے  
جیکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود  
پری چہرہ لگ کیسے ہیں  
غزہ و عشوہ واد کیا ہے  
تنگ چشم سرما کیا ہے  
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے نہیں  
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر  
اُس در پہ ہنس یار تو کبھی کی ہو آئے  
اچھے رہے آپ اس سے مگر ٹھکڑ بولے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے  
پھر جگر کھودنے لگا ناخن  
سینہ جو یاے زخم کاری ہے  
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے  
پھر وہی پردہ عساری ہے  
وہی صد گونہ اشک باری ہے  
دل ہوئے خرام ناز سے پھر  
بے خودی بے سبب نہیں غالب  
محشرِ ستاں بے قراری ہے  
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات جو بچکاں  
پھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی  
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے  
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق <sup>۳۱۰</sup> نوٹ غم ہی ہسی نغمہ شادی نہ ہسی

گھر سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو  
شکوہ جو رے سرگرم بجا ہوتا ہے  
کیوں نہ تھیریں ہفتِ ناک بیدار کہ ہم  
آپ اٹھلاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے  
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے  
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا  
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے  
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ تم سے  
وگر نہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے  
لہگوں میں دوڑنے پھرنے کے علمِ ہستی نال  
جب آنکھ ہی سے نہ پڑکا تو پھر ہو کیا ہے  
وہ چیز جس کے لئے ہم کو بوہشتِ ناز  
سوائے بادۂ گلفام مشک ہو کیا ہے  
سہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی  
تو کس امید پر کہنے کہ آرزو کیا ہے

میں انھیں چھڑوں اور کچھ نہ کہیں  
چل نکلتے جوئے پئے ہوتے  
قہر بڑایا بلا ہو جو کچھ ہو  
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے  
مری قسمت میں غم اگر اتنا تھا  
دل بھی یارب کئی دے ہوتے  
آہی جاتا وہ راہ پر غالب  
کوئی دن اور بھی بچے ہوتے

تب چاک گریبان کا مزہ ہے دلِ داں  
جب اک نفس الجھا ہو اہر تار میں آوے

اُن کے دیکھے جو آجاتی ہے نہ بد رونق  
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے  
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پہننے کو ترے کیا سمجھا تھا دل  
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کریب بے ایام گلی  
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی  
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے  
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے  
مختصر کرنے پہ ہوجیس کی اسید  
نا امید ہی اس کی دیکھا چاہئے  
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد  
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

ہر قدم دھڑکی منزل ہے نمایاں مجھ سے  
گردش کا غرصد جلوہ رنگیں تجھ سے  
میری زلفاں سے بھاگے ہے یہاں مجھ سے  
آئینہ داری یک دیدہ حیران مجھ سے  
نکھ گرم سے اک آگ بجتی ہے اسد  
ہے چراغان حسن خاشاک گلستاں مجھ سے

میں بلاتا تو ہوں اس کو گرے جذبہ دل  
اس نزاکت کا براہ وہ بھلے ہیں تو کیا  
اس پر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے ذنب  
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے ذنب  
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غائب  
کہ لگائے نہ لگے اور بھجائے نہ بنے

رہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فرس  
تہیں نہیں ہے سر رشته رونا کا خیال  
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے  
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے  
کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن  
سوائے اس کے کہ اتنے سر ہے کیا کہیے

طبع ہے شتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں  
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے  
خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٰہی ہے  
جھٹلے دے مجھ نے ناامیدی کیا قیامت ہے  
ہرے ہیں باؤں ہی پہلے بزدلش میں تھی  
جھٹلے کر کے اپنی یاد شرم جائے ہے مجھ سے  
کہ جتنا مہینچنا ہوں اور کھینچا جائے ہے مجھ سے  
کہ دامن نیال یا چھوٹا جائے ہے مجھ سے  
نہ جھٹکا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہوش مدعی کا ہم سفر ہے وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سوتا جانتے ہیں

رونے سے اور عشق میں بے پاکی ہو گئے  
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاکی ہو گئے  
کہتا ہے کون نالہ بیل کو بے اثر  
پردہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

جب تک وہاں زخم نہ پیرا کرے کوئی  
چاک جگر سے جب رہ پریش نہ واپس  
ناکامی بنگاہ ہے برق نظارہ سوز  
سرور ہستی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر  
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن واکرے کوئی  
کیا فائدہ کہ عیب کو رسوا کرے کوئی  
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی  
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی  
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا لے کوئی  
بیکاری جنوں کو ہے سر پہنے کا شغل

ابن مریم ہوا کرے کوئی  
غمر و آئین پر مدار سہی  
چال جیسے کوڑی کمان کا تیر  
بات پرواں زبان کشتی ہے  
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی  
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی  
مل میں ایسے کے جا کرے کوئی  
وہ کہیں اور سننا کرے کوئی  
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی  
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی  
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ  
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

ہوں میں بھی تماشا بی زیرنگ تمنا  
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب بیکار کو

تجھ آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے  
بے پردہ سوئے وادی جنوں گزر کر  
وہ کہے یا نہ کہے پیاں انتظار ہے  
ہر دے کے نقاب میں دل متویر ہے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے  
ہے چشمِ تریں حسرت دیدار سے نہاں شوقِ عنانِ گیسختہ دریا کہیں جسے

غم کھلنے میں بود اولِ ناکام بہرے یہ بچ کہ کم ہے غمِ کلفِ مہبت ہے  
کھینچتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثہ ہے یوں کہ مجھے دردِ جام بہت ہے

پرطاؤسِ تماشا نظر آیا ہے مجھے ایک دل تھا کہ بر صدِ شرم دکھایا ہے مجھے  
لالہ و گل بہم آئینہ اخلاق بہار ہوں میں وہ داغ کہ پھولیں لبِ لبایا ہے مجھے  
جامِ ہرزہ ہے سرشارِ غما مجھے کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے  
(نسخہ عید)

## بہادر شاہ ظفر

نہاں سیرِ چین کی نگہ کی ہوا سرعاشق میں ہے اس ہر دینِ بوی کی ہوا

نہی حال کی جب ہیں اپنی خبر رہے دیکھنے اوروں کے عیب ہنر  
بڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا  
کئی روزیں آج وہ ہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما  
مجھے صبر و قرار نہ رہا اسے پاس و حجابِ ذرا نہ رہا

تو کہیں ہو دل دیوانہ داں پہنچے ہی گا شمع ہوے گی جہاں پہنچے ہی گا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا  
 کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا  
 مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ بیخ و ملال تھا  
 وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو بیخ تھا نہ ملال تھا

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے لٹ جائے کہیں زاد میں سامان کسی کا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا  
 جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

صبر خشک ہے ذکر صبر کا دعویٰ ہرگز عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

ات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی  
 نے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار بقراری تجھے لے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

بس وقت اسکی زلف گرہ گیر کھل پڑی سودائیوں کے پاؤں کی زنجیر کھل پڑی

## میر مہدی مجروح

کچھ عرض تمنا میں شکوہ رستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا اور آئے کیا جانا  
 انجام ہوا اپنا آغا ر محبت میں اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا



ہم بھی امید وصل سے خوش ہیں ہے زمانہ کو انقلاب بہت

دیکھ کر دل کو یار کہتا ہے چیز اچھی تھی گرد لگتا داغ

گریباں پاک ہے کلی بوستاں میں اثر کتنا ہے بھل کی فغاں میں  
 نفس صیاد کا خالی پڑا ہے نہ ہوں بے چین کیونکر آئیاں میں  
 نئے گر حالم خفتہ کا فقطہ تو نیند آ جائے چشم باساں میں  
 سنا حال دل مجروح رب کو کوئی حسرت سی حسرت اٹھتی یاں میں

کیا چن میں ہے گئی بوئے گریباں اکی کچ غم کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں

شوق سے شوق ہے کچھ منزل کا راہ میرے بھی بڑھے جاتے ہیں  
 دور ہے منزل مقصد لے خضر آپ کیوں پیچھے رہے جاتے ہیں

آنکھ نرگس کی خواب ہے لیکن ہائے وہ چشم نیم خواب کہاں  
 کچ ادائی یہ رب ہیں نک تھی اب زمانے کو انقلاب کہاں

لمتی ہے اس کی وضع زبغے یار میں آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں  
 کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ملے ہیں دست جنوں کا دھیان کو ایک ایک تار میں  
 ہر ایک جانتا ہے کہ مجھ پر نظر پڑی کیا شوخیاں ہیں اس لمحہ سحر کار میں

دل کی بیچینیاں گئیں نہ کہیں ایک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں  
 ہر کیا چیز ہے وفا کیسی؟ یہ تو باتیں ہیں اب رہیں نہ کہیں

غالی جائے یہ وہ بہتاؤ نہیں آج جائیں گے وہ کہیں نہ کہیں

کسی کی کاکل مشکیں کی بہت خوش نے گل شگفتہ میں چھوڑا نہ رنگ بوباقی  
اگرچہ آپ کو کھوپا تلاش میں اس کی گرہے دل میں وہی شوق جستجو باقی

پھر کس سے یہ شکوے شب ہواں میں ہوں گے کام اپنا کہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے  
تشبیہ مرے حال پریشاں سے نہ دیتا ایسا نہ ہو وہ طرہ شب رنگ بھر جائے  
دل خوگر شادی ہو یہ ممکن ہے یہ یارو فرماؤ کہ یہ حسرت جاوید کدھر جائے  
ظاہر ہے کہ باطن کی لگاؤ ہے وگرنہ کیوں غیر کی جانب تری ذریعہ نظر جائے  
آنکھوں میں کسی کی جو جگہ پاؤں تو کیونکر میں خواب پریشاں ہوں جو دیکھے وہی فر جائے  
اچھا ہے جو مجروح کو روکے کوئی اٹھ کر یہ عینے سے بیزار ہے کیا جانے کدھر جائے

## مفتی صدر الدین آزاد روہ

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر کہیں پرسش داد خواہاں نہیں  
یہ باتہ اس کے دامن تلک پہونچے مک رسائی جسے تاگر سیاں نہیں  
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور کہ اپنے کئے سے پشیمان نہیں

افردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند کس دن کھلا ہوا در پریناں نہیں  
لے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو آتیا زباں نہیں  
کتنی کھی طرح سے نہیں یہ شب فراق شاید کہ گردش کج تجھے آسماں نہیں

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں  
یارب یہ کس نے پہرے اٹانے کا جو سورخنے اپ بھٹکنے لگے آفتاب میں

کائنات اس فرقہ زہاد سے اٹھانہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی زندانِ عجبِ خوار ہوئے

## مومن خاں مومن

شعلہ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

اس نقشِ پاک سے سجے نے کیا کیا کاویاں میں کو چڑ رقیب میں بھی سر کے بل گیا نہ  
بت خانے سے نہ کہے کو تکلیف دے مجھے مومن بس اب صاف کہیاں جی پہل گیا

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا  
یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دجائے وصل نہ کی دقت تھا اثر کا سا  
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دیدہ حیدراں نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا  
مر گئے اُس کے لب جاں بخش پر ہم نے علاجِ آبِ ہی استا کیا  
جائے تھی تیری مرے دل میں سوئے غیر سے کیوں شکوہ بُنے جا کیا

شبِ غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مرنے دکھائے دم ر کے تھا سینے میں کبخت جی گھٹے تھا  
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھے غلط پیغام سائے کون یاں نہکے تھا  
باتِ شب کو اُس سے سبقتِ باری پر رُشی ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پر کیا تصور کا عالم رہا  
ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا  
نماز شوخی دیکھنا وقتِ نظمِ مبدع  
جھ سے وہ غدر جتا کرتا تھا اور خضبتا تھا  
ہو گئی وہ روز کی الفت میں یہ کلمات بھی  
مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جلے تھا

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آسان نہیں  
میں گرفتارِ خسم گیسو صیاد رہا  
گم غم عور مجھے عشقِ تباں ہے مومن  
میں سدا سوختہ حسنِ خدا اور رہا

عشر میں یا س کیوں دم فریاد آگیا  
رحم اس نے کب کیا تھا کاب یاد آگیا  
الہا ہے یا توں یار کا زلفِ دراز میں  
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا  
جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ محال  
دم میں ہمارے وہ ستم ایسا یاد آگیا  
ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ  
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کچھ نفس میں ان دنوں لگتا ہے جی  
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا  
دلِ ربائی زلفِ جاناں کی نہیں  
بیچ و تاب طہرہ شمشاد کیا  
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس  
آسمان بھی ہے ستم ایسا دیکھا  
بتکدہ جنت ہے چلے بے ہراس  
لب پہ مومن ہر چہ آباد آباد کیا

اگر گردشِ ہی ہے بیچوں کی خیمِ میگوں کی  
کفِ ساقی میں جامِ بادہ لگلوں ٹھہرے گا  
طوافِ کعبہ کا خوگر ہے دیکھو صدائے سوز و  
تو سمجھ ذرا مومن ہے مومن ہیں ٹھہرے گا

یہ حذرِ استخوانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا  
میں الزام اس کو دیتا تھا قصورِ انسا نکل آیا  
حذنگِ یار کے ہمراہ تخیلی جان سینے سے  
یہی اسان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

ناصح سے طعنہ زن مری ناکامیوں پر کیا  
ہول کیوں نہ محو حیرت نیرنگہائے شوق  
دہجیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا  
جودل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آتھا

بزم سے میں بس ایک میں محروم  
یا دایام وصل یا رافسوس  
آپ کے ابقناب نے مارا  
دہر کے انقلاب نے مارا  
جب سائی کا بھی نہیں مقتدر  
مومن ازبس ہیں بے شمار گستاہ  
ان کی عالی جناب نے مارا  
غم روز حساب نے مارا

غیروں پر کھل نہ جائے کہیں راز نہ کھینا  
اُڑنے ہی رنگ رخ مرانظروں سے تھانہ  
میری طرف بھی غمزدہ غماز دیکھنا  
اس رخ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا  
دشنام یا رطیع حوزین پر گراں نہیں  
دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب  
کشتہ ہوں اسکی چشم فوں گر کالے مسج  
مومن غم مال کا آغماز دیکھنا  
ترک صنم بھی کم نہیں سوز جیم سے

تلخ کامی پر مجھے تھک کر لب شیریں باز  
چھڑے بت خانہ کو مومن سجدہ کئے میں نگر  
آمرے جادو سے اعجاز مسیحا فی ملا  
خاک میں ظالم زیوں قد جبریں سائی ملا

دھو دیا اشک ندامت گناہوں کے  
مومن دیندار نے کی بت پرستی اختیار  
تر ہو ادا من تو بارے پاک دامن ہو گیا  
ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

بے نجت رنگ خوبی کس کام کا کہ مرق  
مفت اول سخن میں عاشق نے جان دی  
تھا گل وے کسی کی دستار تک پہنچا  
قاصد ترابیاں تو ادار تک نہ پہنچا

پوچھنا حال یار ہے منظور  
میں نے ناصح کا تہ عا جاننا  
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا  
تو نے موتن بتوں کو کیا جاننا

بیکار رہی امید سے فرصت ہے رات دن  
نہیں آجھی قضا نہ کیسو وزلے سے  
وہ کاروبار حسرت و حرمان نہیں ہا  
دہم و گمان خواب پریشاں نہیں ہا  
موتن کا یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں  
ذلی میں کوئی دشمن ایمان نہیں رہا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا  
فکر وغیبار سے ہوا معلوم  
رنج راحت فزا نہیں ہوتا  
حرف ناصح برا نہیں ہوتا  
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے  
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا  
تم امرے پاس ہوتے ہو گویا  
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا  
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو  
دست عاشق رسا نہیں ہوتا  
چارہ دل سوائے صبر نہیں  
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا  
کیوں سے عرض مضطرب موتن  
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم جان فدا کر لے گروعدہ وفا ہوتا  
ایک ایک ادا سو دیتی ہے جواباً  
مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا  
کیونکہ لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا  
جنت کی ہوس و اعطیہ بجا ہے کما فی حق  
ہاں سیریں جی لگنا گردن نہ لگا ہوتا  
دیوانے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اس کا  
ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ دہوتا  
ہم بندگی بہت سے ہوتے نہ کبھی کافر  
ہر جگہ اگر موتن موجود خدا ہوتا

عدم میں رہتے قوت درہتے اُسے بھی فکر تم نہ ہوتا  
جو ہم نہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنایس اب تو ہم کو جو اس نے خط پرہ کے نام پر ہے  
 کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر استخبار رقم : ہوتا  
 یہ بے تکلف پھر راجی سے کشمش دل عاشقوں کی اس  
 وخر نہ ایسی تیر کتول پر حسد صم نانہ کہ قدم نہ ہوتا  
 ہوا مسلمان میں اور دوسرے نہ درس و اعطاء کو سنے ہوئے  
 خیاتی دوزخ بلا سے بنتی نذا سبب تاخیر صم نہ ہوتا

ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن ملے وہ دل ہی میں رہی بخش جہاں کی شکایت  
 صلہ شکر وہ اٹھی ہوئی تقریر نہ سمجھا تھی برائی زلف پریشان کی شکایت  
 لے شور جنوں درہے زبان بند نہ ہوئے گرائے ہوں پر مرنے زلف کی شکایت

ہر غنچہ لب سے شوق کا اظہار ہے غلط اس بحث صحیح کی تکرار ہے غلط  
 کرتے ہیں مجھ سے دعویٰ الفت وہ کیا کرنا کیونکر کہیں مقولہ اغیار ہے غلط  
 کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح گویا کہ قول محرم امرار ہے غلط  
 سچ تو یہ ہے کہ اس بت کا فرکے دوریا لاف و گداز مومن دیندار ہے غلط

ٹھانی تھی دل میں اٹھیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں کہ ہڑ گئے ناچار ہی سے ہم  
 پستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس نے کسی سے ہم  
 اس کو میں جا میں گئے مدد لے ہوم نرنج باج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم  
 صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا نو بندگی کہ جھوٹ گئے بندگی سے ہم  
 کیا گل کھلے گا دیکھئے فضل گل نمود اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ بھی سے ہم  
 اب مجھے زلف سے جو پریشانیوں میں ہم کرتے ہیں اس پر ناز ادا دانیوں میں ہم  
 گر گرم رقص تازہ ہیں قربانیوں میں ہم سرخی سے کس کی آئے ہیں جولا نیوں میں ہم

نابت کو چہرہ شکوہ دنا بہر گناہ رشک  
سیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم  
مارے خوشی کے سہیلے حبیب شب فراق  
کتے سبگ ہوئے ہیں مگر آجانیوں میں ہم

نالہ ہوں نیکے پیسے گو ہم مدد مانگے کو ہیں  
لب نہیں کہنے میں اب کیا جائے کیا کہنے کو کیا  
تر چلانے اس بشارت سے بغیر کونک  
جوں زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں  
وینچھنا اس حال سے کمر ہلانے کو کیا دیا  
نخت تیرے عاشقوں کے نادر اکہنے کو سہی  
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں  
ہو گئے تمام تیرا دل شستہ ہی موتیں بے قرار

کھنا پڑا مجھے پیسے الزام پسند گو  
وہ ماجرا جو لائق شرح و بیان نہیں  
ڈرتا ہوں آسمان سے علی اندر گرے  
صیاد کی نگاہ سوئے آشیان نہیں  
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق  
ناصح ہی کو لے آؤ گرافسانہ خواں نہیں

کہتے ہیں تم کو بہر شش نہیں اضطراب میں  
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں  
تقدیر بھی بری میری تدبیر بھی بری  
بجڑے وہ پیش سبب اجنباب میں  
یہ ہم سجدو پائے صنم پر دم و دماغ  
موتن خدا کو بہول گئے اضطراب میں

اٹنے وہ ہشکومہ کرتے ہیں کس کس ادا کے ساتھ  
بے طاقنی کے طعنے ہیں عذر حق کے ساتھ  
اشد ری گرا ہی بہت و بہت خانہ چھوڑ کر  
موتن چلا ہے کہے کو اک پار سے ملنے

نہ جائے کیوں دل مرغ جن کو سیکھ گئی  
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی  
پھر اب کے لارے قربان جاؤں جلیوں  
گئے ہیں یاں سے وہ سو گند کھائے آنے کی  
خیال زلف میں خود رفتگی نے تھر کیا  
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی  
کردوں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس  
اصل بھی رہ گئی نظام سنا کے آنے کی



حسن و زافروں پر غرا کس لئے اے بارو  
تاب طاقت عبور راحت جان ایمان غفلت ہو  
یوں ہی گھٹ چلے ہوا جتنا کہ بڑھتا جاوے  
ہائے کیا کہنے کہ دل کے ساتھ کیا چلے نہ

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دلوں  
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرے  
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم  
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے یشمان کہ بسا  
ہم نکالیں گے سن لے سوج ہو ابل تیرا  
صبر یا رب سب سے دشت کا بڑے کا کہ نہیں  
چاک پر دس سے یہ فتنے ہیں تو لے پڑھ نشین  
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی  
عمر ساری تو کئی عشق ریتاں میں ہو من

اور بن جائیں گے تصویر جو حیران رہے  
ہم تو کل خوابِ حرام میں شبِ حرام رہے  
ماکہ ناوان ہوئے کیا تجھ سے بھی ادا ہوئے  
ایک وہ ہیں کہ جن میں جاہ کے ارمان رہے  
اس کی زلفوں کے اگر زبانی ریشاں ہوئے  
چارہ و ما بھی کبھی قیدی زندان ہوئے  
ایک میں کیا کہ سبھی جاگ رہاں میں ہے  
پھر وہی پاؤں ہی غارِ مغیلاں میں ہے  
آخری وقت میں کیا خاکِ مسلمان ہوئے

آج اس بزم میں خوفِ انٹھا کے اٹھے  
گو کہ ہم صفحہ ہستی پر تھے اک حرفِ غلط  
اٹ رہا ہی گرنی محبت کے ترے سوختہ چل  
یاں تلک روئے کہ اس کو ہم نہ انا کہنے نہ

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجبور کا  
لے پھرتے بنے محبت کو گلہائے شبینہ کی  
یہ کون کہے اس سے کی ترک و فاس نے  
سجود نہ کیوں کرنا سو من قدم بتا پر

سایہ سے مرے دشت لے رہا کیے برائی  
اب تم سے بھی چل نکلی یادِ عمرِ حیات  
کر تو ہی ذرا تا صبح پیغامِ پری آتی  
کھبے ہی میرے موتی ہے یہ جو وہ سری آتی

نہر نہ اُٹھتا، اثر نہ ہو جاتا ہے  
 کہیں پاؤں نہ سحر نہ ہو جاتا ہے  
 تیرا کہ اپنی نظر نہ ہو جاتا ہے  
 وہ بت کہ نہ وہ نہ ہو جاتا ہے

کیا نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر  
 کیا نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر  
 کیا نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر  
 کیا نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر نہ ہو کر

دل میں اس طرح کے جو راہ نہ کی  
 میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے  
 مومن اس زمین سے خطا پر حیف  
 ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

شمع تم جو بزمِ بھیر میں آکھیں چراگئے  
 نے مومن آپ جیسے ہوئے بندہ بیتاں  
 کھوئے گئے ہم ایسے کہ اعتبار پائے گئے  
 بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

بندھا خیال جاں بعد ترک یار مجھے  
 وہ رند نکلہ کش ہیں کہ نہ رہتے ہیں  
 ہر آن آن دو کا ہوا میں عاشق زار  
 ثواب ترکِ کسبم سچ سہی ولے مومن  
 کیا ہے یاس نے کیا کیا امیدوار مجھے  
 تنگ آ کے حرفیاں بادہ خوار مجھے  
 وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے  
 یہ کیا سبب کہ ساتے ہو بار بار مجھے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی  
 سوئے آواز الفت میں ہم افوس  
 تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی  
 اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال      کہے دینی سے بے باکی اور کی  
 مجھے اے دل تری جلدی نے مارا      نہیں تقصیر اس ویر آستان کی  
 کہا اس بت سے مرا ہوں تو مومن      کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

شب بھر میں کیا ہجوم بلا ہے      زبان تھکا گئی مر جا کہے کہتے  
 رشک دشمن بہانہ تھا کچ ہے      میں نہیں تم سے بے وفا کی

## ۛ نسیم دہلوی

پھر غفلت ہے آمد فصل بہار کا      بگڑا مزاج میرے دل بے قرار کا  
 وحشت میں بھی نازک محبت ہو انیم      منہ آبلوں نے چوم دیا فک خار کا

اشہ رے درازی آغاز دعا      نکلا جو حرف منہ سے میرے داستان بنا  
 نیل و ہنسار گیو در خسار یار میں      جی چاہتا ہے بیٹھ رہیں اک جہاں بنا

گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا      ہوئی تھی صلیح کس شکل سے پھر جگر انجلی آیا

افسائے محبت کا جو تھا خوف تر رشک      آنکھوں میں نہا تھا کوئی داس میں عیاں تھا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے      تم نے تو خود آب کو رسوا کیا

بھروسہ جوش و خشت سے جھوٹے ہیں بے ادب ایسے  
 گریبوں سے اُنچھ کر ہاتھ آجاتے ہیں دامن تک  
 خوش قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پر دے  
 نظر بھی اب تو جاسکتی ہنسی دیوار گلشن تک

دیکھو وہ قاتل بسر کرتے ہیں کس شکر سے ہم  
 ہنسے کیلئے خود کیا ہے غفلت امید نے  
 تالی از احسان نہیں یہ بھی کہ وقت اضطرار  
 چار و گھر سے درو نالاں در دے دل دل سو ہم  
 حال دل کہتے ہیں اپنا بھرنی قاتل سے ہم  
 خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدہ باطل سے ہم

لطف تکلف قفس کچھ ہم سے بوجھا جائے  
 برتنے اک طرز بنے تابی مر گیا تو تنہا  
 بلیل بستان رعدت ہے یہاں چل نہ تم  
 مدتیں آخر ہوئی ہیں خدمت عباد میں  
 سینکڑوں باتیں ہیں ایسی غلط فہمیوں  
 عمر کو ضائع نہ کر اس گلشن ایجاد میں

لے جائے اسے بھی سبکدوش ہوں کہیں  
 گھبرا گئے تم ایک ہی عرض بیان میں آج  
 رکھے مری امید بھی اپنی جائے ساتھ  
 سو حشر میں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

اب وہ گلی جائے خطر ہو گئی  
 دیکھیں گے اسے ضبط یہ دعوے ترے  
 حال سے لوگوں کو خبر ہو گئی  
 رات جدائی کی اگر ہو گئی

کیا جانئے آتے ہیں کہاں سے سے شکوے  
 بے فائدہ ہے فکر مری چارہ گوؤں کو  
 کم ہوجتے ہیں ہر چند مگو کم نہیں ہوتے  
 سب زعم جگو قابل مرہم نہیں ہوتے

مرنے بھی نہ دیگی مجھے محرومی تقدیر  
 کچھ آنکھ چراتا ہے وہ قاتل کئی دن سے

نئے ڈھب کا کچھ جوش سودا ہوا ہے  
خدا جانے اب کئی مجھے کیا ہوا ہے  
شعلن ان آنکھوں سے پیدا ہوا ہے  
بہت دن کا یہ خواب دیکھا ہو ہے  
ذرا دم تو لینے دے اے چشم جاود  
بڑی مدتوں میں دنیا اچھا ہوا ہے

## آتش

اے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے  
میں جا ہی ڈھونڈتا آتش میں رہ گیا

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا  
کتنی ہے تجھ کی خلق کا غام کیا نہ کیا  
صیاد اسیر دام نگہ گل ہے غلیب  
دکھلا رہا ہے چپ کے اسے آپ دانہ کیا  
چاروں طرف سے صورت جانناں ہر جگہ  
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

سمجھتے تھے وہم آتا در اندازے جنوں تھکوں  
گریباں سے شعلن ہو گیا سو قطف امن کا

کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا  
کبھی سامنے ہو کے مجھوں نہ نکلا  
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا  
جو چیرا تو اک قطر خون نکلا

نبرد چہ حال مرا چوب خشک صحر اہل  
لگا کے آگ مجھے کارواںِ ولہ ہوا

خار و امن سے الجھتے ہیں ہمارا کئی کر  
چاک کرنے کو کیا گل نے گریباں پیدا  
موجہاں کی ہے سید روزی ہمارا آتش  
ہم دہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا

نام اس زلفِ معین کا توڑ لے شانے  
سلسلہ ہے یہ مولے دل کی گرفتاری کا

فریبِ حسن سے مگر مسلمان کیا نہیں بگڑا خدا کی یاد بھولا شیخ تب سے برسوں بگڑا  
لگے نہ بھی چڑانے نہ بیٹے۔ یہ گناہ کب کا کیا گیا زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر تھے دین بگڑا

کیوں مکر وہ ناز تیں نہ کرے سے تیار یاں کیوں چاہا کہ حسنِ امنی سے نہ رشتہ آنسکار  
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا روئے حقیقت اٹھے جو پردہ مجاز کا

صافی سچا خبر، مانتاں کہ جو فیصل کی کہ ہے ہر قدم پر ہے یقین یاں وہ گیا واپس گیا

ہجر کی شب ہو بھی روزِ قیامت کے دراز اس بٹائے جان سے آتش دیکھئے کیوں نہ بے  
دوش سے پیچھے ہنس اترے ابھی گیسو دست دل سوایشی سے : اتر گز دل سوا زکونے دست

فصل گل سے لٹنے کیفیت سے خانہ آج دوت ساقی سے مالا مال ہے بیان آج  
نہ پاک ہو گا کبھی حسن و عشق کا بھگڑا یہ قہقہہ ہے کہ جس کا کوئی گوشہ نہیں

باغ میں آئے ہوساتھ انکے بھی پھر دو دو گام تنہا دکھاؤں کا جھگڑا ہے چکاتے نہ چلو

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی ٹہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی  
نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے جفا سے یار کے آڑے مری وفا آئی

محتاج بہت شیخ سے پروا نہ ہوا ہے موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نقشِ پاک سے زنگار کے آ رہی ہے یہ صدا دو قدم میں اٹھ ہے شوقِ منزلِ طہ ہے

دکھائے حسنِ بار کا حیدہ ہمیں خوشی  
کس کس طرح سے لطف تماشا اٹھائیے  
اب کی ہر دیر کا جب ہمیں ملے چلے بولنا  
جن جن کے داغ لالہ عورت اٹھائیے  
نفس بہار آئی پو سو نیر خراب  
بس ہر چکی مساز مٹلا اٹھائیے

گرد و فراز کوئی شہسوار راہ میں ہے  
یمنہ آج ہر ایت اختیار راہ میں ہے  
تسکِ شکر کا شدر سے شوق آسائش  
عنان گستہ بے اختیار راہ میں ہے

حیا سے یار تے بدلا جو کیف سے میں نگ  
یقین ہوا یہ ہیں پارسا ہی مشک ہے

سننے والا نہیں ہے روئے پر  
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

لگی ہے دیر بہتہ نام برکے آنے میں  
وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کیے بدلے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیسا  
دکھاتا ہے رنگ آسماں کیے کیے  
زمطر کر کے بے درد قاتل نے دیکھا  
تڑپتے رہے نیم جاں کیے کیے  
تہا رے شہیدوں میں خاص مجھے ہیں  
گل و لالہ وار غواں کیے کیے  
بہار آئی ہے نشہ میں جھونے ہیں  
مریدانِ پیر مناں کیے کیے

صورت شمع ہوں ہر چند فروغ بھل  
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹی ہے

دیکھتے کرتا ہے کینو نگار سے گستاخاں  
شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہئے  
حال دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بلاں کیار  
بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہئے

پیا مہر ہو تو خوب ہوا زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سج ابرو سے کیا قتل مجھے قاتل نے وہ مزادی جو محبت کے گنہ گار کی تھی  
راہ صحرایں جنوں کیوں نہ رہے گزشتہ چشمہ آبِ پایوں کو ترسے خار کی تھی

گئے جس بزم میں روشن چراغ حسن کو کرا بہار تازہ آنی تم اگر گلزار میں آئے

عاشق کے سر کے ساتھ ہر سو آگے مار مومن نہ تھا وہ جس کو ہوا جہاں نہ تھی

جہن میں کھلتی ہے کس مزے سے غنیمت و گل سے مگر باغِ حبیب کی پاک دامانی نہیں جاتی

رہ گیا چاک سے دشت میں گسباں خالی بے چلے خار سے ہم گوشہ داماں خالی

سودا زہ زلفوں کا نہ تھا اپنے سوا ایک آزاد دو عالم تھا اگر قرار ہیں تھے

صبا کی طرح ہر اک غیرت گل سے ہیں گل چلتے محبت ہے سرشت اپنی ہیں بارانہ آتا ہے

## شیخ امام بخش ناسخ

ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتش شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا  
اس رشک گل کے جاتے ہی ہیں آگ کی خزاں ہر گل بھی ساتھ بونے چمن سے نکل گیا



مرا سپنہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجران کا  
طلوع صبحِ معشر چاک ہے میرے گریباں کا

قدح لئے ہوئے گلِ مثلِ بادہ خوار کیا  
خزاں چین سے گئی موسمِ بہار آیا  
تمام عمر میں ہی ہو گئی سیر اپنی  
شبِ فراقِ گئی روزِ انتظار آیا۔

بریز اس کے ہاتھ میں ساغرِ شراب کا  
ہنستا ہے عکسِ بے حسے کٹورا گلاب کا

آج مجھ کو دشتِ وحشت میں وطنِ یاد آگیا  
بوئے گل کو بعدِ بربادی چینِ یاد آگیا

اشک سے نام نہیں لیتے کہ سونچے نہ کوئی  
زل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تنا ہے ساقی بھی بزمِ مئے میں  
وہ سرشار ہوا اور ہشیار میں ہوں

رفت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں  
جس سر دین کے ہم ہیں وہاں آسمان نہیں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں  
زندگی زندہ بلی کا ہے نام  
نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں  
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تو نے ہجور کر دیا ہسم کو  
دل بنا عاشقی میں خود مختار  
سخت رنجور کر دیا ہسم کو  
اور ہجور کر دیا ہسم کو

گلوں کی پردہ دری کیا تھیں ہوئی منظور  
جو آج سیر گلستان کو بنے نقاب چلے

شوق مٹنے کے دیا اس نے جو مجھ کو دیکھ کر  
عقبت رہا یہ بھی غافلِ خمار کی

کس کو ہمارے یار کے قتلے کے کرتوت  
خوشید جس کو کہتے ہیں اسکی نقاب ہے

چھٹنے سے عمر وہاں اپنی فشر جاتی ہے  
جب ترا جنم بد رفتار نظر آتا ہے

ڈرتا اثر کا اس کو سود بھی نکلی گیا  
نام ہوا ہوں نہ سے میں نہ نکال کے

فرقت قبل رشک کے صدے ہنیں چل  
کیا آئیں ہم رقیب ہی انہن میں ہے

## ۴. برق لکھنوی

کیا جو عدہ فردا سمجھ گئے عاشق  
کہ اس سوال کا اب مشہر جواب ہے

دیکھنا تیر دستی ساقی  
حسن نے اس کو جن لیا اے برق  
جام کو رشک آفتاب کیا  
عشق نے ہم کو انتخاب کیا

اتنا تو جذب عشق نے بارے اثر کیا  
اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

اذاں دی کبے میں ناقوس دیر میں پھونکا  
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو  
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

تیر کو ہم سے خدا جدا نہ کرے ہم جلازتم سے ہوں خدا نہ کرے  
 شب فرقت بھی کھاٹ ویسے تیرا کیا کریں لکھراگر وفادار نہ کرے  
 لکھنا علم فرشتہ کو جو شریانی نے آنکھوں سے لاکھ دھواہٹ من کے قریب

## جلال لکھنوی

باغیاں لاکھ چھپایا کئے لیکن نہ چھپا مزن مرغان چمن رنگ ہر بونہوا  
 بتوں کو شوق ہوا عالم آشنائی کا بغیر بھی رنگ پسند آ گیا خدائی کا  
 بہت ڈر سے ہوئے شے لایں شیخ و زاہد اٹھا کچے ہیں ہم الزام پارسائی کا  
 بڑی امید ہے منزل میں ناتوانی سے یہی تو ساتھ بنا ہے گی نارسائی کا  
 شوخیوں نے تری کچھ کام نکلے دیا رنگ حیرت سے زمانے کو بدلنے نہ دیا  
 کبھی نالے نے دکھائی نہ بہا رتا شیر شجر اے عشق دیا پھولنے پھلنے نہ دیا  
 آہ تک کر کے محفل جاناں میں فلک یہ بھی حسرت تھی کوئی جس کو نکلے نہ دیا  
 گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں لقا یاری پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا  
 چراغ لے کے ارادہ تھا نعت کو دھونڈھیں شب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا  
 جلال باغ جہاں میں عندیہ میں ہم چمن کو پھول ملے ہم کو دغ بھی نہ ملا  
 میں شوق دیدیں کیا جانے کسی دور آیا کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا  
 تڑپ بھی پہلے نہ تھی تجھ میں سے دل بیتا کسی کو رحم ترے حال پر ضرور آیا

بے پردہ ترے دیکھنے کا حوصلہ کر کے دل آپ مری آنکھ سے محبوب ہے میرا

شوق مجنوں نے وہ لنگوٹ کی اٹھ گیا آپ پردہ محل کا

کہہ کے وہ اٹھ گئے کہ مشکل ہے سہل کرنا تمہاری مشکل کا  
نام اس بے وفا کا لونہ حقائق زخمِ آپ کیا گئے ہوئے دل کا

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے غائب حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خفا  
پھرن کو بھروسہ وصل میں ہونے لگی تمیز بے خود ترے نہ آپ میں آنے تو خوب تھا

حسرت تھی دید کی جو تری جلوہ گاہ میں کچھ دل میں ہم وہ ملے کے چلے کچھ نگاہ میں

منزل میں لے کے بیٹھ گیا ہے ہجوم میں تھکے زخم تھکے ہوئے کاروان کے ہیں  
نقش قدم پکارتے ہیں راہِ عشق میں مٹ جائے حوصلے جسے نام و نشان کے ہیں

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ جن شگوفے دیکھیں انھیں کیا اقبال کرتے ہیں

اندازہ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں

خاک اپنی اُڑ کے فوقِ تباہی میں گئی کم بخت پڑ کے دیدہ راہی میں رہ گئی  
تھی اک شکایت اس شہِ خوبان کے چھین شکر گدا نوازی شاہی میں رہ گئی  
حسرت نہ نکلی وصل میں بھی دستِ شوق کی اندیشہ ہائے افتساہی میں رہ گئی

سناغ کہہ کر کہہ رہا تھا چشم یار کا  
دل سب کے نرم بادہ برستاں میں کھلے  
بکھا شک دل سے کئے کھینکے خواجہ جمال  
ذوق خلش نے ادیرہ عمریاں ترکھلے

زادہ کو رند اُبھار کے لائے ہیں رنہ پر  
کچھ کچھ مگر کرامت پیر مغاں بھی ہے

کہتا ہوں داغ جس کو وہ حسرتِ بولی کی  
یرے جگر کی چانسِ محبت کا راز ہے

مہم بہب سے کئے ہوش تری جلوہ گری نے  
کیا کیا نہ خبردار کیا بے خبری نے

اُٹھی ہی نہیں شرم سے اپنی ہنک شوق  
محبوب کیا ہے یہ تری پردہ درسی نے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق  
حسرت نیک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ایک سی شوخیِ خدائے دی ہے حسی عشق کو  
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے دل میں

خبر دیوں کے بگڑنے میں بھی ہلکے بناؤ  
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دل ناشار ہے  
وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد ہے

## صبا لکھنوی

جوش الفت میں او ضبط لے دل  
جبر پر اختیار کیا کہتا

آبدودل کی کدورت نے زچا ہی ورتہ یہ وہ قطرہ ہے جو ٹرے جاتا تو دیا ہوتا

پھر میر لالہ زار کھہم لئے تیا چٹنے آئی بہار داغ جنوں پھر اُ بھر گیا

مری نجات کچھ ان دامنظوں نے ہاتھ نہیں  
بڑا کریم ہنہ جنیں کا گستاہنگار ہوں میں

نیرنگی نصیب ہے غم کے بیان میں سورنگ کے طلسم ہیں اک اُستان میں

یوں ہی اذا کریں گی گریباں کی دھیلا  
نقل جنوں ہے جامہ درمی کی بہا ہے  
جب تک کہ ہاتھ دامن جانناں کو دور ہے  
لوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

پھر چلے دامن صحرا کی طرف آئی بہار  
پھر ہوا جوش جنوں دست گریباں ہم

مرگئے عاشقِ آلاں تو کہا اس بستے  
کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے  
سو گئے فقہِ محشر کے حکانے والے  
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

## ۲ ماہ لکھنوی

اس گلشنِ ایجاد میں رنگِ رخ ہر گل  
وہ درد طلب ہیں کہ تری راہ میں میں نے  
عین جگر بلبلِ شیدا سے نکالا  
کانٹا نہ کبھی آبدِ پا سے نکالا

اس سیما سے علاجِ دل شیدا ہوا  
یہ بھی اچھا ہوا یا نہ ہوا چھانہ ہوا

جوشِ جنوں میں ہم نے گریاں کھچاؤ کر اے دشتِ تیرے واسطے دامنِ بناوِیا

ہاے نالہٴ دل کی بھی کچھ سنی تاثیر جو پہنچے کانِ تکان کے تو کچھ اثر بھی ہو

کیا زور تھا کیا شور تھا اک قطرہٴ جنوں کا اے حضرت دل دیکھیں کراماتِ تمہاری

## تسلیم لکھنوی

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کئے جا  
لے دل خمِ ابروئے صنم میں سحر و شام  
بکھ بندگیِ حسنِ خداداد کئے جا  
سیرِ چمنِ گلشنِ ایجاب کئے جا

ہائے جب کہتا ہوں اے سوزِ دل کہتے ہیں  
چپ رہو رازِ محبتِ داستانِ مہربانیکا

اللہ لے اضطرابِ تنائے دیدار  
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے  
اک فرصتِ بنگاہ میں سو بار دیکھنا  
اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دشتِ جنوں

اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

نالہٴ کھینچا ہے دل ہے خفا شوقِ یادِ اہں  
تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

وہ دیکھ کر مجھے بے پردہ کیوں ہوئے اے دل  
نگاہِ شوق نے سمجھا دیا نقاب میں کیا

ہمیشہ یاس کے آگے دیکھ جاتی ہے کئی امید ہے باقی دلِ خواب میں کیا

بزمِ ساقی آگئی ہے یاد کس نے نوش کو جامِ چھلکا شیشہ تھے ہچکیاں لینے لگا

چائے مینائے نے کو سجدہ شکر نہ آج سر کے بل آتا ہے زاہد جانبِ خانہ آج  
کل نگاہِ منتظر و بولی ہوئی تھی جام میں بھرتی ہے آنکھوں میں میری گردشِ پایہ آج

پردہ ازاد لین میں امیری ہوئی نصیب گریا قفس میں تھے جوازے آشیانِ سہم

حسنِ دل افروز کا دیوانہ ہوں شمعِ رو کوئی ہو میں پروانہ ہوں  
مر کے بھی چھوٹے نہ ساقی کے قدم آج تک خاک درِ میخانہ ہوں

مانا کہ حسنِ یاد سے لبریز ہے جہاں لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں  
ہر وقت یا رتھا رگ جاں سے قریب تر تسلیم تو خراب پھر اعر بھر کہاں

سببِ شرم التجا ہوں میں لبِ خاموش مدعا ہوں میں  
یہ حقیقت نہ جان لے تسلیم منظرِ قدرت خدا ہوں میں

رہ نہ جائے آرزو سے چارہ گر لذتِ تکلیف درماں دیکھ لیں  
الغاف جوشِ وحشت پھر کہاں ہو سکے جیتک بیاباں دیکھ لیں  
گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو دور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

ہنستے ہیں گلی بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں گویا جن میں چاک گریاں ہیں فہیں



ناصح خطا معاف سنیں کیا بہار میں ہم اختیار میں ہیں ددل اختیار میں  
کیا کیا خیال حسرت دیدار فیس تھا چھپ چھپ گیا ہے ناتواں الیٰ الیٰ غبار میں

نکتہ پاہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤ مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستو لگائے چلو  
عدم میں ترسو گئے درد جگر کوئے تسلیم جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

کیا عجب حشر پر موقوف ہو ملنا اس کا ناامیدی نہ کر اتنا ابھی بیدل مجھ کو  
فرصت دید نہیں ہے شرار شیخ کی طرح بھوکے دیتی ہے تری گری محفل مجھ کو

گر یہی ہے پاس آداب سکوت کس طرح فریاد لب تک آئے گی  
یہ تو مانا دیجھ آئیں کوئے یار بھر تمنا اور سمجھ فرمائے گی  
جانے دو صبر و قرار و ہوش کو تو کہاں اے بے قرار می جائے گی

اللہ رہ ضبط راز محبت کہ آج تک جو حرف مدعا ہے مرا ناشنید ہے  
تکلیف التماس ہے پاک مدعا غماز عاشقی مرارنگ پریدہ ہے

اے دل دیوانہ اُمید رہائی کس لئے پیچ و خم کا ہے کوزلف پر شکن کے جائیں گے

کیا کہہ کے غنایب جن سے کل گئی کیا سن لیا گلوں نے کہ زنگت بدل گئی

افسانہ گوئے اور بھی بے خواب کر دیا ظالم سدا ہے مریخا داستان مجھے  
وہ گم شدہ ہوں سوئے عدم منظر اب میں دوڑی گئی ہے دھوڑا ہے عمر رواں مجھے

۳۴۰  
 شمیم یار نہ جب تک چمن میں جھو آئے نہ رنگ آئے کسی پھول میں نہ بو آئے  
 دماغ دے جو خدا گلشن محبت میں ہر ایک گل سے ترے پیر سن کی بو آئے

اس عشق کا ریا ہو کہ اپنے نفس سے ہم کیا کیا پست کے روئے ہیں جن دم رہا ہو

### ۴۔ مضمیر بلکہ امی

جو شمش شوق شب بھل میں شمس ٹھہری تنگ آئی ہے مری آرزوے دل کیا کیا  
 جستجو میں تری تنگ تنگ گئے پہلنے والے پاؤں پھیلائے پڑے ہیں ہر منزل کیا کیا

ہر دم صدای ہی ہے ترے داد خواہ کی مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی

تو نے گلگشت جو موت کیال گل تر پھول مر جائے چلے آتے ہیں گلزار دے

### ۵۔ مرزا رحیم الدین حیا

بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں ہے اشب ذاق کٹی روز انتظار آیا  
 کھلی رہ آنکھ ترے کشتہ رشتہ اقل کی ہزار شور قیامت اسے بچار آیا

خدا ہی ہے کہ اہے قوبر کعبہ جاتے تک قدم قدم ہے تصور شراب خانے کا

قبا کے ٹکڑے کے پر قبا جب بھی کھیا گھر ہی گھر ہی کی جنوں زور آزمائی کیا  
 دیتی ہتھیں دلا جو عشق جین تہمت عبت ہے موج نیم بہار پر

## خواجہ محمد زید وزیر

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادمان ہو کر  
زمین کو لے جاناں بیخ دیگی آسمان ہو کر  
اسی باعث تو قتل عاشقان سے مت کرے تھر  
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کار وں ہو کر

ترجی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو  
یکے تیر انداز ہو سیدھا تو کرو تیر کو

ہے چشم نیم باز مجب خواب ناز ہے  
نفتہ تو مسور رہے در قسنہ باز ہے

باں و پر بھی گئے بہار کے ساتھ  
اب تو تجھ نہیں رہائی کی

## ۴ ضیای سگیم ضیائی

تہا را ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز  
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہوتا زک میں تو ان ہوں

## غیر شکوہ آبادی

غم ہستے ہیں پر غمزدہ بے جا نہیں اٹھتا  
مرتے ہیں مگر ناز میں جا نہیں اٹھتا

دشت جنوں سے نقش کن بالہ مرٹا  
شکر خدا کہ پاؤں مراد میں نہ تھا  
بجلی تھی ہر بان، کبھی آتش بہار  
صد شکر کہ چراغ مرا آشیان نہ تھا

۳۴۲  
اُن کے جاتے ہی نہ ٹھہرے گی بہارِ بزمِ عیش  
ساتھ اپنے ایک گل سارا چمن لے جائیگا

شاید نگہ یار ہی اس کو چے میں ٹھہرے  
اب تک رگ جاں میں کئی نشتر تو نہ ٹھہرا

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ تباہ تک  
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

## نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

دامنِ تباہ کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ  
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامنِ بنادیا

مشاطہ کا قصور سہی سب بناؤ میں  
اس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُرفتنِ بنادیا

اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ  
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمنِ بنادیا

کیا میکدوں میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں  
ساتی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو  
البتہ ایک ڈال بے مدد مانہ تھا  
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

وصل کے لطف اٹھاؤں کیونکر  
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ  
تاب اس جلوے کی لاؤں کیونکر  
اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

جہاں تھیکہ میں ہے اک اک زبان پر  
افسوسِ مدرے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشتیاں ہمنور

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں کچھ آگ بھری ہوئی ہے لے میں  
کچھ زہرا گل رہا ہے بلبل کچھ زہر ملا ہوا ہے لے میں  
بدست جہان ہو رہا ہے ہے یار کی بوہرا ایک شے میں  
ہے مستی نیم خام کا ڈور اصرار ہے جام پے پے میں  
میں خائے نشیں و قدم نہ رکھیں بزم و بارگاہ کئے میں  
کچھ شیفۂ یہ غزل ہے آفت کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

محفل میں اک نگاہ اگر وہ ادھر کریں سو سو اشارے غیرے پھر رات بھر کریں  
طوفان فوج لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ انڈ کریں

رات ساقی نے کہا جس کے یہ طلوعے ہیں وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں  
رند خانہ بھی ہوئے جام سج گئی تھے اور زائد ابھی آننگ ظہارت میں نہیں  
دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ ہم شیفۂ زمرہ اصحاب تجارت میں نہیں

ہے امتزاج مشک کے لعل فام میں آئی جو آج کام میں صہبائے تند و تلخ  
آتی ہے بولے غیر ہمارے مشام میں ساقی نے خوب راز کہے بارعام میں

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا جواب میں جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں  
لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی کے شیفۂ ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

ہر خار و خس ہر درد میں ہر رنگ و خشت کیا میکشوں مے آگے کہا خانقاہ میں

آشفۂ خاطرِ وہ بلا ہے کہ سیفتہ طاعت میں کچھ مرا ہے نہ لذتِ کماہ میں

گر یہی ہے ہجومِ ابرسیاہ گر کوئی ہے بے بعید نہیں  
ذکرِ میرا سنو نہ محضوں کا لطف بے قصہ جدید نہیں

ناصح تری زبان ترے بس میں جتنو انصاف کر کہ دل پر مرا زور کیا ملے  
افسوس اس نے کچھ نہ کہا سن کے حالِ دل ہم قصہ خواں کی طرح فناء سنا چلے

نیرنگ عشق دیکھ کہ منظور ہے انھیں گلگونہ میں چکیدہ مژگان تر ملے  
محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤنگا وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے  
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی میں کیا کہوں کہ رات مجھے گس کے گھر ملے

اتنی بھی بری ہے بے تسداری اب آپ سے انس کم کریں گے

ہزار شکوہ کہ اسکی گلی میں چھوڑ گئی نسیم جان کے ایک ناتواں غبار مجھے  
جو شورشیں نہ بچاتا ابیر کیوں ہوتا خراب تو نے کیا جلوہ بہار مجھے  
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جیسے غزل ہو آئے کرے شکار مجھے  
بڑے فساد انھیں شیفتہ خدا نہ کرے کہ ان کی بزم میں ہو دخل اختیار مجھے

یہ عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

## مائل دہلوی

حشر میں شیخ و برہمن کے جھگڑے پھیلے کوئی پرسان نہ ہوا ہم سے گز گاروں کا

محروم پھر آیا درمیانہ سے واعظ رندان قلع خوار کی ہمت کو ہوا کیا

بھیسکی تھی ذرا آنکھ کہ وہ خواب میں گئے اس رات کو اب میں شب غم کہ نہیں سکتا

میں کسی سے تو بدنام ہوں نہ مانے میں ابھی گئے ہیں وہ مجھ کو سنا کے پڑے میں  
نہ مانگ ڈا ہد ناداں اذرا سمجھ تو بھی شکایتیں ہیں یہ کس کی دعا کے پڑے میں

کیا کہتی ہے یہ چشم فوں گراؤں دیکھو لوہم نہ کہیں گے ستم ایجاد کسی کو

ہم تو اس فکر میں تھے ہیں کہاں کا انصاف دیکھئے داور معشر بھی کدھر ہوتا ہے

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی مسجد میں جا پڑیں گے جو منجانہ بند ہے

## زکی دہلوی

رسوا کن جہاں نگہ ناز ہی نہیں پہناؤ رہے یہ عیش کا انداز ہی نہیں

کچھ ایسے تنگ ہیں غم دل سے کہ جی میں بچہ کہتے ہیں دل کو دے کے غم روزگار میں  
پہلو وہ کون ہے تجھے جس سے کئے نصین کروٹ ہم اب کہ بھر کو دل بقرار میں

نفس نفس ہے نیم وفا محرک شوق یہ وہ مزہ ہے جسے ذوق جاوداں کہئے  
وہاں یہ فکر کہ راز دل آشکار نہ ہو یہاں یہ شوق کہ کچھ حسرت نہاں کہئے  
وہ سادگی سے تغافل کو تازہ کہتے ہیں مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہئے

دل کو یہ شوق کہ وعدہ کی وفایا دہے وہ نئے حسن سے مخمور نہیں کیا یاد دہے

وہ میرا غم ہی نہیں پوری داستانِ سہمی حکایت دل بے تاب درمیاں سہمی  
خوش و غم جو محض من کوئی بات ہے زبان دی ہے خدا نے تھیں نہاں سہمی  
ہنیں ہے عشق کی گشتِ تنگی میں ساتھ ضرور میں تو خاک اڑانی ہے کلاماں نہ سہمی

ان کا جس راہ میں نقش کف پایا ہوتا ہے ہر قدم سجدہ ارباب وفا ہوتا ہے

## میر حسین تسکین

زلف پہ پہنچ کو کھولا ہے کسی نے یارب کہ مرے پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں

اے چشم سر مگیں تری گردش نے کیا کیا راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم



## سید ظہیر الدین ظہیر

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا  
 نگاہ شریکوں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا  
 دل خوں گشتِ حسرت نے کیا کچھ گل کھلے ہیں  
 بہار آگیاں ہے کچھ اب کی برس فصل خزاں کیا کیا  
 تصور میں وصال یار کے سامان ہوتے ہیں  
 ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا  
 قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے  
 بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجدہ آستان کیا کیا

بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے  
 کہیں جو ذکر حریفان بادہ خوار آیا

اعجاز دلفریبی انداز دیکھنا  
 ہر ہر ادبہ مجھ کو گمان نظر رہا

بات کیا ان سے کروں ان کو اٹھاؤں کچھ  
 وہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیر  
 ہم عی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں  
 ہم الگ توب سے گنہ گار بنے بیٹھے ہیں

کہئے تو کہوں انجن غیر کی روداد  
 کیا اب بھی اسے آپ کرامت کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الہی کیا قیامت ہے  
 الجھتے ہیں دم رفتار سو سوار وہ ہیں  
 الجھ کر خاندان سے میرے کیا کیا بیشان ہیں  
 کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار اس کے

## عبد العليم آسی

رشک خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو      کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دنیا  
درد کا کوئی عمل ہی انہیں تہیٰ ل کے سوا      مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہر تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن محال یا رنہ تھا      میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا  
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل      کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے لے باد صبا      یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

ہوا کے رخ تو ذرا آ کے بیٹھا جا اوقیس      نسیم صبح نے پھیرا ہے دلفیلی کو

## خیر الدین یاس شاگرد مومن

رہب غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو      دل میں سمجھو کہ یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو  
عشوہ و ناز و ادا طعن سے کہتے ہیں مجھے      ایک دل رنختے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

## غلام علی خان وحشت شاگرد مومن

منفعل ضعف جنوں سے ہوئے ایسے کہ نہ بوجھ      طوق آہن جسے سمجھے تھے گریباں بھلا

## نظام شاہ نظام رامپوری

کون پر ساں ہے حال سبل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

خدا جانے بھکود کھائے گا کیسا یہ چھپ چھپ کے اپنا ادھر دیکھنا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا

یوں تو روٹھے ہیں مگر نوگوں سے پوچھتے حال ہیں اکشر میرا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو منہ کو چھوڑ دیئے سکر کے ہاتھ  
وینا وہ اس کا ساغر نے یاد ہے نظام منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بٹھا کے ہاتھ

## محمد یوسف علی خان ناظم رامپوری

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

مجھے اٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے یہ غلط خلص وہ لوگ کون چلے آتے ہیں ادھر دیکھو

ہنسی ہے اشک یہ ہے نور دیدہ ہجران ہنسی ہے داغ یہ ہے شمع دو دمان فراق  
غبار دشت ہے افزائش جمال جنوں شمع دور ہے آرایش دوکان فراق

پیردہ نہ رکھتا تیرے لب روح فزائے ہم جانتے تھے آب بقا اور ہی کچھ ہے

## گستاخ رامپوری

صد سالہ دورِ جبرخ تھا ساغر کا ایک دور  
بکھلے جو سیکدے سے تو دنیا بدل گئی

## امانت لکھنوی

رکنا قدم اے دل رہ دشت میں سمجھ کر  
زنجیر کا ہے سانا منزل یہ کڑی ہے

## رند لکھنوی

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا  
دید لیلیٰ کے لئے دیدہ مجنوں ہے ضرور  
سب بیگانہ ہے اے دوست ثنا سائیر  
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشائیر

نیم صبح چمن تک مجھے تو ہی پہونچا  
بھٹک رہا ہوں میں گم کردہ اشیاء کا  
نصیر کیا ترا ساقی افلک نہ دیکھ سکا  
گرایا ہاتھ سے لب تک جو میرے جام آیا

اے رند شوق جامہ درمی پھر چمک گیا  
پھر ہاتھ رفتہ رفتہ گریاں تلک گیا

کبھی نفس راہ چمن نہ کیا اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

نہ رہا ہوش بے خودی ہی تو ہے ساقیا! فضل ے کشتی ہی تو ہے  
دل ہمارا اداس ہے لبیل! نہیں لگتا چمن میں جی ہی تو ہے

چمن میں جو کل جا کے دیکھا گلوں کو نہ تیری سی زنگت نہ تیری سی بو ہے

نستاہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی ایسا نہ ہوسن لے کہیں اللہ کسی کی

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی باد بہاری کیا اب کی برس چاک گریباں کریں گے

## رشتگی دہلوی

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و درسن کہاں

ہیم ہ بحر ال ہے کبھی اور کبھی امید وصال کون کہتا ہے مزہ سستی پیاں میں نہیں  
اہل دل سے نہ کبھی آپ سین گے ناہ چاک دل میں ہے مگر چاک گریباں میں نہیں

مسجد میں آ کے ادھر ہی عالم دکھائیے بت خانہ کو تو عالم تصویر کر چکے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو لے دل مگر کسی کے یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

## دآغ دہلوی

بتاں ماہ و ش اُچڑی ہوئی لبتی مٹتے ہیں کہ جس کی جان جاتی دہا سی کے دل مٹتے ہیں  
خدا رکھے جنت نے کئے آباد دو تونوں گھر میں اُن کے دل میں بتا ہوں سرے ل میں تہ ہیں  
کوئی نام و نشان پوچھے تو لے قاصد بتا دینا تخلص دآغ ہے اور عاشقوں کے دل میں تہ ہیں

مرادیں مان رہا ہوں قضا کے آنے کی بُری گھڑی تھی دل مبتلا کے آنے کی  
ابھی تو کھیل ہیں لے دآغ خوئیاں اُن کی پھر آرزو کس کر دگے حیا کے آنے کی

پیامی کا میا سب آئے نہ آئے خدا جانے جواب آئے نہ آئے  
ترے غمروں کو اپنے کام سے کام کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے  
تم آؤ جب سوار تو سن ناز قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ذکر ہرود فنا تو ہم کرتے پر تمہیں شہسار کون کرے  
آفت روزگار جب اُغم ہو شکوہ روزگار کون کرے  
وعدہ کرتے نہیں یہ کہتے ہیں تجھ کو امید دار کون کرے

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا  
زندہ بے رویا کی ہے صحبت کے نصیب زائد بھی ہم میں میچھ کے انسان ہو گیا  
اس غمخ میں سمائی ہے وخت ہنگن تو دل کتنی نیگیوں پہ بیابان ہو گیا  
لو اسے تو سنو کہ وہ دآغ صنم پرست مسجد میں جا کے آج مسلمان ہو گیا

دل سے کے اسکی بزم میں جایا نہ جائے گا یہ مدعی بغل میں پھیپا یا نہ جائے گا  
اسے حشر اقیانوس ہم ہیں شہید ناز مردوں کی طح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا  
دل کیا ملاؤ گے کہ میں جو گیا یہ یقین تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کی ترک مئے تو مائل پسندار ہو گیا میں توبہ کر کے اور گنہ گار ہو گیا  
وہ نقشہ جس کا حشر پہ اٹھنا ہے مختصر ہر بار تیری چال سے بیدار ہو گیا  
اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہو گئے تنہا سی بات کہہ کے محنت گار ہو گیا

ستم ہی کرنا، جہاں کرنا، نگاہ الفت کبھی نہ کرنا  
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہائے حق میں کتنی کرنا  
لئے تو چلتے ہیں حضرت دل نہیں بھی اس سخن میں نہیں  
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر غم ہیں سے پہلو تہی نہ کرنا  
مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اسکی مصطفیٰ کا  
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروردی نہ کرنا

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا اس طرف بھی خدام کرنا تھا  
تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل عاشقی کو سلام کرنا تھا

ہلے اہل بزم چشم مردت کو کیا ہوا کیوں دیکھتے نہیں مری صورت کو کیا ہوا  
بے جستجو ملے گا ذلے دل سلغ دوست تو کچھ تو قصد کرتی بہت کو کیا ہوا  
ٹھٹھا اڑا ہے داغ دل داغدار عشق اس آفتاب حشر کی حدت کو کیا ہوا

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

میری وفانے مجھے خوب شرمسار کیا  
 یہ کیا کیا کہ جہاں کو اسلہ دار کیا  
 چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا  
 مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا  
 ستم کیا تو بڑا تو نے انفسار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا  
 تجھے تو وعدہ دیدار ہم سے کون تھا  
 بھلا بھلا کے بتایا ہے ان کو رازِ نال  
 ہم ایسے بھولنا وہ نہ تھے جو ہوش آسا  
 وہ بات کر جو کبھی آسمان سے ہونہ سکے

دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ حال سا  
 وہ بھی بڑا ہے میری طرح راہ میں پائمال سا  
 در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستِ حال سا

عرض و ناپہ دیکھنا اسکی ادائے دلفریب  
 فتنہ شکرک اٹھا اس کے خرامِ ناز سے  
 پوچھتے کیا ہو کون تھا ہونہ ہو وہ ہی داغ تھا

مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا  
 تہا ہے برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا  
 ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

مے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے  
 نگاہِ شوق پہ الزام ہے فستاری کا  
 وہ جب چلے تو قیامتِ باقی جاوِ وطن

سو دا جو نہ ہوتا تو مرا سر بھی نہ ہوتا  
 ہوتا جو نہ انصاف تو محشر بھی نہ ہوتا  
 بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا  
 بہتر تو یہی تھا کہ وہ بہتر بھی نہ ہوتا  
 مگر عشق نہ ہوتا کوئی کا فر بھی نہ ہوتا

بے عشق کے جیتا مجھے دم بھر بھی نہ ہوتا  
 ہے واسطے ہر کام کے اک روز سفر  
 آنا جو یہاں روزِ جزا اے شبِ بحر  
 ظالم جو کہا اس کو یہ ہے حسن کی خوبی  
 غارت گزایاں تو ہے لے داغِ کافر

الفت میں کوئی کار نمایاں نہ ہوا تھا  
 آتی تھی اجل درد کا درواں ہوا تھا  
 گویا نہ کیا تھا کبھی پیمیاں نہ ہوا تھا

جتنک سے گریہ سے طوفان نہ ہوا تھا  
 شامتِ مری جو میں نے سہا نہیں جاتا  
 اس وعدہ فراموش کا اللہ کے تغافل



جلوہ دیکھا تری رعنائی کا کیا کلبا ہے تماشا ی کا  
آئی شوخی میں کہاں ہے ٹھیکن پڑ گیا صبر تمنائی کا  
ضعف نے دل کو ترپنے دیا ہو گیا نام شکبائی کا

انداز کچھ ملانے لگا جو ریا رکا  
رہتی تھی اسکی یاد وہ راتیں کدھر گئیں  
اب مجھ کو انتظار ہے اس انتظار کا  
دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا  
اے چشم یار دیکھ تغافل سے باز آ

یاں امتحان برق تجلی ضرور تھا  
ہم بوسہ لے گئے ان سے عجب چال کر گئے  
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا  
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا  
یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا  
لے آ داغ صدمہ غم ہجران کیا درست

ہمیں زمانے میں بد نام تیری غونے کیا  
غور کیوں نہ ہو جب دل سی جزا تھے لگے  
دل فریفتہ جو کچھ کیا سو تو نے کیا  
بڑا دماغ تری زلف مشک بونے کیا  
خفا تو ان کو مری شرح آرزو نے کیا  
کھلا میں ان سے تو وہ اور وائع مجھ کے کیا

شوخی سے تھرتی نہیں قاتل کی نظر آج  
وہ جاتے ہیں اُتی ہے قیامت کی ہر آج  
یہ برق بلا دیکھے گرتی ہے کدھر آج  
روتا ہے لکھنے کے دعاؤں سے آج

پیکارتی ہے خموشی مری نچاں کی طرح  
کبھی تو صلح بھی ہو جائے زہد مونی میں  
نگاہیں کہتی ہیں سب زب زباں کی طرح  
الہی شیخ بھی سے خواہو نچاں کی طرح  
جلا کے داغ محبت نے دل کو خاک کیا  
حیا نے روک لیا جذب ل نے کھینچ کیا  
بہار آتی مریے باغ میں خزاں کی طرح  
چلے وہ تیر کی صورت کھینچے کہاں کی طرح

بھگی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود جیسے وہ آئیے  
 یرسد راہ ہوا گس کا پاس رسدانی  
 گری ہی پرتی ہے بیمار ناتواں کی طرح  
 رزکے ہوئے ہیں سے اشک گرواں کی طرح  
 اداسے مطلب دل ہم سے نیکیہ باتے کوئی  
 ابھیں سہی دیا حال داتاں کی طرح  
 کچھ اُن سے کہنے کو اچھے تھے ہم کہ خلوت میں  
 رقیب آہی گیا مرگ ناگہاں کی طرح  
 زبان خام ہوئی ترکاری دشت سے  
 کہ چھالے بھونے کے پیغم خوشی کی طرح  
 خدا قبول کرے راغ تم جو سوئے دم  
 چیلے ہو عشق بتوں کے ارمنوں کی طرح

وہی تو ہے شعلہ تجلی کہ دشت امین سے تنگ ہو کر  
 جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حینوں پر رنگ ہو کر  
 وہ ہم ہیں مجنون دشت پیا جنوں کو ہوتا ہے ہم سے سودا  
 کہ چشم آہو میں بھلی دشت ہماری دشت سے تنگ ہو کر  
 بھلی ذرا چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی  
 برا مزا اس طاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

آئے وہ بے وفایاں اسکی ہا کو کیا ہن  
 جائے در قبول تک میری دعا کو کیا ہن  
 اسکی گلی سے آئے کیوں نہمت زلف لائے کیوں  
 مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا ہن  
 یہ ٹوٹا ہی کام ہے سجدے کروں تویں کیوں  
 کیوں ترے پاؤں پر گرے زلف سا کو کیا ہن

ہے چارہ ساز گلچیں گھٹائے دل و دل کا  
 شامت بہار کی ہے آئی جو اس جن میں  
 یہ شوق خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے  
 بے تاب تجھ کو دنیا خلوت سے انجن میں  
 کیا کہ دل میں آؤ تو خاک میں ملاؤ  
 رونق ہو انجن کی میٹھو جس انجن میں

آغاز شوق میں نہیں انجام کی غمیر  
 اس بتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں

مے خانے کے قریب تھی مسجد پہلے کو دماغ ہر ایک پوچھتا ہے کہ "حضرت ادھر کہیں"

دل میں گھریار کے پیکان کئے بیٹھے ہیں تجھے پہ قبضہ مرے وہاں کئے بیٹھے ہیں  
ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاج بہار پہلے ہی پاک گریبان کئے بیٹھے ہیں

منکشف شدہ کہ گھنگور گھٹائیں آئیں تم پہ رحمت ہوئیں اقبویہ پہ بڑائیں آئیں  
کتنی زلفیں مجھے یاد آئیں شب بچراں میں کہ بلائیں مری بیٹھے کہ بلائیں آئیں  
ناز ہے ان کو کرم یہ کہ نہیں خبر کا حسنا کس خطا وار کی گنتی میں خطائیں آئیں

ہم تری نرم سے اسے یار چلے ہندو جہی سے پہلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں  
گرچہ سو سو ہیں تعاضلی کہ نہ جانے کوئی ان نگاہوں کے منکر وار چلے جاتے ہیں  
نبھول کر راہ چلے آئے ہیں لہ نہ خستہ ہم خطاوار گسہ کار چلے جاتے ہیں

دل میں سما گئیں ہیں قنایت کی شوقینا رو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں  
اس توجہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں  
تائید کے سنگ حوادث سے آئے کیا نہری دغا بھی ٹھوکریں کھاتی ہے راہ میں

دھوم ہے حسرت کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے  
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا سگر کچھ بھی نہیں  
ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالہ 'دل  
یہ تو کچھ بھی نہوا یہ تو اثر کچھ بھی نہیں  
اک بھائی تیری جو کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے  
اک دغا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

حشر میں دست جنوں سے نہ بخل ہوں اے داغ  
کہ مرے پاس بجز دامن ترکچہ بھی نہیں

دست و حشمت کے لئے تار رگ جاں میں نہیں  
تیرے اقرار میں انکار تری جاں میں نہیں  
بجھ کو حیرت کا گماں دل میں تنہا کا یقین  
جلوہ ہوش ربا دیکھ لیا اے موسیٰ  
دیکھئے راہ میں ٹھوکر سے کھل جائے گمرہ  
اف سے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے  
زنگ گل، نغمہ بلب، اثر باد بہار

جلوے مری نگاہ میں کون و مکان کے ہیں  
جس دن سے کچھ شریک ہو میری رشتہ خاک  
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں  
اس روز سے زین پر ستم آسمان کے ہیں

بات میری کبھی سنی ہی نہیں  
لطف سے تجھ سے کیا کہوں زاہد  
اڑ گئی یوں وفاز مانے سے  
دل لگی دل لگی نہیں تاحص  
داغ کیوں تم کو بے وفا کہت  
جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں  
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں  
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں  
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں  
وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

کبھی فلک کو بڑا دل جلوں سے کام نہیں  
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں  
اگر آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں  
مگر انھیں تو کسی بات پر قیام نہیں

چماک ہو پروہ دُشست مجھے منظور نہیں  
 دلی کوڑ جوتی ہے خیر تپ کہیں یا کہیں  
 وہ نہ یہ ہاتھ گر بیان سے کچھ دہرا نہیں  
 ہم کو معلوم ہے وہ بات جو مشور نہیں  
 دیکھ بچھتا ہے گا خاموش یہ دستور نہیں

کتنا با وضع ہے خیال اس کا  
 ناامیدی مٹائے جاتی ہے  
 بہت لمبے خاک ہاں مددائے ضعف  
 اس کا آگاہ تو درکنار اس داغ  
 بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے  
 شوق نقشہ جمائے جاتا ہے  
 کوئی دامن بچائے جاتا ہے  
 دل ہی قابو سے ہائے جاتا ہے

اس شخص میں سے بہت بے قرار ہو کے چلے  
 نری نگاہ بہت رست ی سنبھل گئے ذرا  
 سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے  
 کسی کے دل سے ٹیکنے قرار ہو کے چلے  
 سند ناز و اکوار سوار ہو کے چلے  
 کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہو کے چلے

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی  
 رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں  
 یہ جڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی  
 یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی  
 جہاں تک ہماری نظر جائے گی  
 جب آئے گی برباد کر جائے گی  
 گذر فی جو ہو گی گذر جائے گی  
 دیا دل تو اسے داغ اندیشہ کیا

ابھی نزاکتِ خیال باقی ہے  
 غراں بنے دیکھ کے دشت سجی چھائی ہو  
 ابھی زمانہ ناپائدار باقی ہے  
 ابھی نظارہٴ فصل بہار باقی ہے  
 ابھی تو شمعِ دل بجے قرار باقی ہے  
 جو عشق ہے تو غم بے شمار باقی ہے  
 ابھی زار کا سنتے ہی ماجرا کھراٹے  
 جو یہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں غلش باقی

طلب ہے چاہئے والوں سے امتحانوں کی  
خدا کرے انہی سے باغیاں گرے بھلی  
قدیم قدم چہ تری چاں کا نیا انداز  
بڑی غی ہے خدا خیر کرے جانوں کی  
ترے چمن کو لگے آگ آشیانوں کی  
وگر نہ ایک روش ہے سب آسمانوں کی

منصفی بنیا سے ساری اٹھ گئی  
یہ طرح پھیلے ان زلفوں کا حال  
دور میں اس چشم مست ناز کے  
کس سے رکھئے داغ چشم دوستی  
اسے تو ایماندار ہی اٹھ گئی  
اب امید رستگار کی اٹھ گئی  
لذت پر تمہیں نگاری اٹھ گئی  
اٹھ گئی یاروں سے یاد ہی اٹھ گئی

نگہ چلی باد صبا کیا کسی مستانے سے  
روح کس بہت کی پیاسی گئی مے خانے سے  
وہی وحشت ہے وہی فوار وہی دیراز  
ایک چلو میں بہت داغ بہکسا اٹھے تھے  
جھومتی آج چلی آتی ہے مے خانے سے  
مے اڑی جاتی ہے ساقی سے پیانے سے  
دشت کس بات میں آج امرے کاٹنے سے  
آج سنتے ہیں نکالے گئے مے خانے سے

شعفی میں آگئی چھیر ہے کچھ اضطراب کی  
اس روئے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب  
تم اور آرزو مرے ملنے کی روز حشر  
لے اشک ڈوب مر تری تاثیر دیکھ لی  
در پردہ جوش حسن نے بے پردہ کر دیا  
اے دل کمی کرے نہ کہیں طول مدعا  
گھر کہ گئی وفا کسی خانہ خراب کی  
بھکی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی  
میں اور گفت گو ستم بے حساب کی  
الہی ہنسی اڑی مری چشم پر آب کی  
ٹوٹی گزہ تڑاق سے بند نقاب کی  
لینے ہے کل خبر مجھے روز صاب کی

کو شوق ہے اثر نہ ہوئی  
حال وہ کیا جو حشر میں نہ کہا  
تم کو پردہ میں کیا نظر نہ ہوئی  
بات وہ کیا جو وقت پر نہ ہوئی

یار کا پاس نزاکت دل ناشارہ ہے  
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے  
تم نے بسے داغِ محبت سے کیا ہے انگا  
یہ سخن یاد رہے یاد رہے یاد رہے

شوق میں ایک فتنہ قیامت کے  
ہم گلے مل گئے قیامت کے  
آئی تیشہ سے یہ صدا اب ہم  
کوہن کام ہیں یہ فرصت کے  
وہ نزاکت سے ہم گئے چل کر  
وہ قدم گز گئے قیامت کے

کیا تھا جرم و فتنہ سزا کے لئے  
ستم کے لطف اٹھائے منے جفا کے لئے  
بڑا نزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ  
وہ سنتوں سے کہیں جپ ہو خدا کے لئے  
لے تو محشر میں لے لوں ازبانِ ناصح کی  
بجیب چیز ہے یہ ظولِ مدعا کے لئے

شکرِ کرم غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری  
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری  
کیا چلائی انکا اثر ہے کہ شبِ تنہائی  
میری تصویر سے متی نہیں صورت میری  
وہ دے پاؤں چہیں جسٹ کے دے تو بہ  
فکر ہے چال اڑا لے نہ قیامت میری  
کون سائب ہے کہ جس پر نہیں شکوہ تیرا  
کون سادل ہے کہ جس میں نہیں حسرت میری

آشفستگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی  
بن بن کے پنج پر زلف تہا لے کھر گئی  
وقتِ نظارہ کی کششِ حسن نے کی  
آنکھوں کو لے کے ساتھ زبیری نظر گئی

فسردہ دل کبھی خلوتِ انجمن میں ہے  
بہار ہو کے رہے ہم تو جن جن میں ہے  
ترا وہ حسن ہے اے شعلہ روجو تو چاہے  
بغیر شمع کے پروانہ انجمن میں رہے  
زبان دے نہ عدو کو کہ یہ تو وہ سے ہے  
ترے دہن میں ہے یا مرے دہن میں ہے

اب وہ میر کہہ رہے ہیں مری مان جائیے اقدیری شان کے قربان جائیے

پھر سے روہ سے وہ یہاں آتے آتے اجل مرہی تو کہاں آتے آتے  
نہ جانتا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی ہرہاں آتے آتے  
سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے  
مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا بھل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

دل جو ناکام ہوا جاتا ہے شوق کا کام ہوا جاتا ہے  
آج کل کثرت عشاق سے عشق شیوہ عام ہوا جاتا ہے

عشاق لکھنے خالق میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی

رونی گلشن جو وہ رند شرابی ہو گیا پھول ساغب بن گیا غنچہ گللابی ہو گیا  
نہکت گل سے چیتا ہے سوا رنگ جنوں کوئی مجھ سا بھی نہ آمادہ سودا ہو گا  
مسجد نے کل کر میں رہ بنکدہ بھولا تقدیر نے میری مجھے رکھنا کہیں کا  
گرا جو ہاتھ سے جام اختیار کیا ساقی تجھے طال مجھے انفعال ہونا تھا  
دعا وصال صنم کی ضرور کی اے دل خدا سے طالب امر حال ہونا تھا  
اس بچ کی ناز کی ہے گل تازہ بہا ہزار زلف رشتہ شیرازہ بہار



ہر دغ سینہ لالہ گلزار فیض ہے <sup>۳۶۳</sup> پاتے ہیں پاک حبیب میں، اندازہ تھا

زمانے کی ہے یہ طاقت کہ کوئی دم ٹھہرے پھر اہی ہے یہ تیری نگاہ کی گردش

جب سے بلند نالہ سوزاں مرا ہوا کرتی ہے برق اپنے گریباں کی احتیاط

پہنچی ہے تری زلف سا بڑھ کے قدم تک <sup>۳۶۴</sup> یس خاک شیس ہم بھی ضرور آئیگی ہم تک  
دغ دل سوزاں سے ہوں میں غمِ شبتان ہے گری ہنگامہ محل مرے دم تک

نبض بیمار جو لے رشک سوا دیگھی <sup>۳۶۵</sup> آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیگھی  
خندہ گل ہے کہیں نالہ بیل ہے کہیں سیر اس گلشن ایجاد میں کیا کیا دیگھی

آج ساقی میں ہنس گو کہ مروت باقی <sup>۳۶۶</sup> خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی  
رات صیاد کو کیا کیا نہ سائے قصے نہ رہی کوئی گلستان کی حکایت باقی

چنچہ ساں سانے اس گل کے پرے ہم غموش <sup>۳۶۷</sup> سوز باین تھیں مگر طاقت گفتار نہ تھی

دخل اغیار نہیں بزم گل و بیل میں <sup>۳۶۸</sup> پاؤں کچھ سوچ کے لے باد بہاری سکھنا

شیشہ ہاتھ آیا نہ ہم نے کوئی ساغر پایا <sup>۳۶۹</sup> ساقیا لے تری محض سے چلے بھر پایا

باغ میں بھول بھلے موسم سودا آیا <sup>۳۷۰</sup> گرم بازار ہوا دقت تماشا آیا  
سارباں ناقہ بیل کو نہ جوڑا آتا پاؤں مجنوں کے تھکے ہاتھ ترے کیا آیا

گلشن دہریں پھر فصل بہار آئی ہے      مہینے شاد ہیں سیکڑے آباد ہیں سب  
قابل صحبت خواہاں تو نہیں ہوں لیکن      ربط کے جتنے ہیں انداز مجھے یاد ہیں سب

ہوا جو خاک بدن ساغر شراب بنا      ہزار شکر کہ ذرہ سے آفتاب بنا

خاواہ ملتے ہیں انزا کوئی نہیں کہتا      کہ خون عاشق رشید احضور ہوتا ہے

رونے سے مرے اس گل خوبی کو خبر ہے      وعدہ شکر کہ اشکوں میں ابھی رنگ اتر ہے

شیم گل میں جو بلبوس یار کی ہوتی      ہوا کچھ اور نسیم بہار کی ہوتی

## غشی امیرا حمد امیر علیسنائی

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل      کانا تھا ایک میں سوچن نے گل گیا

بہار آئی ہے لے دست جنوں یا عید آئی ہے      گریباں سے گلے ملتے چلا ہے چاکہ امن کا

گردش نخت کہاں سے ہیں لائی ہے کہاں      فنز لوں وادی غربت سے وطن دور رہا  
جلوہ برق بجلی نظر آیا نہ کبھی      مدتوں جا کے میں زیر شجر طور رہا  
ہم بھی موجود تھے گل محفل باناں میں امیر      رات کو دیر تک آپ کا مذکور رہا

بھارتا ہے یہ ناز اس کی کبریائی کا      کہ لے اڑا ہے مجھے شوق خود نمائی کا

عزیز کیوں نہ ہو ذراغ اسکی بے وفائی کا  
مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں کے  
کہ جوڑ دے کوئی میٹھا شبِ جدائی کا  
یہ عذر نگ تمہاری شکستہ پائی کا

جب آئی جوش پہ میرے کیرم کی حیرت  
گرا جو آنکھ سے آنسو در یگانہ ہوا

انصاف جو ریا خدا سے طلب کیا  
تم نے بھی اسے امیر بڑا ہی غضب کیا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہ گاروں میں  
اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا

قرب ہے، یا روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر  
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنان سب راجھی  
ہوا نہ ہم ایسوں سے اتنا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر  
ہو زیم جاناں میں حشر بیا ترپ کا دل کے تھا یہ قافضا  
مگر بڑی مشکلوں سے رو کا ادب نے زانو دبا دبا کر

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوچا کچھ  
فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ  
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں  
جہاں بنے ہیں آسمانے خافقا ہیں تھیں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں  
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں گے ہیں

گھر کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل  
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں  
آئی صد ایہی تو مقام امتحاں کے ہیں  
پہنچ جتا یہ نغض انھیں کی زباں کے ہیں

پرے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بیا  
زاہد امید رحمت حق اور بھوسے  
اسے آفتاب حشر نمودار بھی تو ہو  
پہلے شراب پی کے غمگین گار بھی تو ہو

کھانے ہو قسم نہیں ہیں عاشق  
صورت تو امیسر اپنی دیکھو

ہمارے دل سے مٹے گا ز داغ شوق سجد  
اتیر جمع ہیں اجاب درد دل کہہ لے  
جس رہے نہ رہے آساں رہے نہ رہے  
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

پھولوں میں اگر ہے بو تہاری  
اس دل پہ ہزار جان صد سے  
کانٹوں میں بھی ہوگی خوش تہاری  
جس دل میں ہے آرزو تہاری

ہم اور معرکہ امتحاں سے ٹل جاتے  
جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے

تین قاتل پہ ادا لوٹ گئی  
پس گیا چشم پر سرما  
رقص بسلی پہ قضا لوٹ گئی  
پائے رنگیں پہ خالوٹ گئی  
اس روش سے وہ چلے گلشن میں  
بچھ گئے بھول صبا لوٹ گئی

دم ایڑ ہے لازم نظر راہ کرنا  
اتیر جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو  
خدا سے کام پڑا ہے تو خبر لینا  
پڑے گاراہ میں کعبہ سلام کر لینا

غیروں کے کبھی ہے کبھی مجھ سے ہے لگاؤٹ  
کس نطفہ کی جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں صل  
بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج  
ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کدھر آج  
آغوش تمنا کی طرح باب اثر آج  
مانگی ہے دعا کس نے الہی کہ کھتا ہے

اپنی گردن بہت ہر تجھے اے چنچ گھنڈ  
جب میں جانوں کہ شب غم کی سحریدہ اگر

اے دیکھا لصدق کر دیا دل  
اے میرا اس ناز سے ظالم نے دیکھا  
کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل  
نگاہیں بول انھیں وہ لے لیا دل

اس شان سے ہم کئے تری جلوہ نگاہ میں  
اندھیر کر رہی ہے چشم سیاہ میں  
شوخ کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں  
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں  
وہ دُشمنی سے دیکھتے ہیں کو دیکھتے تو ہیں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں  
پھر اسکی شان کریمی کے حوصلے دیکھے  
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں  
بکارتا ہے یہ ساتی کہ ہوشیار ہوں میں  
وہ بے قرار ہوں کیجئے اگر تڑپ میری  
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

شوخ تھی قیامت تری ستارہ ادا میں  
مشکل ہے مسحا کو بھی اب جان بچانا  
فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں  
نکلی ہے قضا چھپ کے حینوں کی اداس

خالق ہی جب نہ دے تو گلہ آسمان سے کیا  
ساتی نہ لگائے تو ساغر سے کیا کہیں

۳۶۸ کیا قدر ہے فسانۃ الفت کی یاں امیرؔ جلتے ہیں ہم سنیں نہ سنیں تم کہا کرو

داغِ افسردہ ہو چلے دل کے جھللاتے چراغِ محفل کے  
دل میں آکر نہ دل سے بھر نکلے تم تو ارمان بن گئے دل کے  
اسکی رحمت سے لو لگا کر امیرؔ آڑے آئے گی وقت مشکل کے

کہہ دی ہر حشر میںؔ آنکھ شرمائی ہوئی ہائے کسی اس بھری محفل میں سوائی ہوئی  
وصل کی شبِ ہزاری بے تابئی شوقِ وصل شرم بھی نہ سچی نگاہوں سے تماشائی ہوئی

بال کھولے جو یار آتا ہے گھر کے ابر بہا راتا ہے  
دردِ دل میں مری تسلی کو گریہ بے اختیار آتا ہے  
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ مجھ کو غصہ یہ پیار آتا ہے

چپے بیل تو نے دو تیکے لئے لونٹی میں بکلیاں ان کے لئے  
باغیاں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے  
وصل کا دن اور آسنا مختصر دن گئے جاتے ہیں اس دن کے لئے

آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے چلے چمن میں زگرس بیار ہو گئی ہے  
انگور میں تھی یہ نئے پانی کی چار بوندیں جس دن سے کھینچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

عشق نے زور دکھایا تھا امیرؔ کو کہن کو کہن کیا کرتا

ہے آج جو سرگزشتِ بستی کل اس کی کہانیاں نہیں گی

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبط آہ سے حسرت نیک رہی ہے ہماری نگاہ سے۔

لہجہ رکھ کر مرے سینے یہ جگر تھام لیا تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

یو چھوڑنا اس زمانے میں الفت کمال کچھ اک دم مٹھی قدیم سو سو خوف ہو گئی

خنجر چلے کسی پر ریتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا دود پناہ جگر میں ہے

چھوڑے کہیں گریبوں پر خم نے اس کی جگہ کچھ وہ تجھے تو بڑے مقدر میں نہ گئے

تم دکھاتے تو ہو اسیر کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

خانقاہوں میں جو یہ پھرتی رہی ہیکل ہیکل تو بہ بھاپی کے مگر کھلی ہے غلے سے

دمت ہے نہ کوئی ہو شیار باقی ہے حجاب کس سے اب چشم مار باقی ہے

صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کس کی جوری کی کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی بچھن سولی ہے

عجب سائی قسمت کے لئے ضابطہ جی جی جو چھوٹ گیا دستہ نازیں ہیں

## خواجہ الطاف حسین حالی

تم نے کیوں دوسل میں پہلو بدلتا کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں تم جانتا کہ بزم میں ایک خستہ جاں نہ تھا

دل سے خیال بہت بلیا نہ جائے گا نیلے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا  
تم گو نہ از شرم ہسی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا  
مے تند و طرت حوصلہ اہل بزم تنگ ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

دیکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل اگر تیرا اس کا خطا ہو گیا  
سبب ہو نہ لوں یہ آنا کھڑا مرا شکر اسی کا گلہ ہو گیا  
وہ امید کیا جس کی ہوا انتہا وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا  
نہیں بھوتا اسکی نصحت کا وقت وہ رورو کے ملنا بلا ہو گیا  
پہنچتا ہے اشعارِ حالی سے حال کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اب محمد رشتہ گل پہ ہوا کب دل حزیں ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا  
ہر نسبتِ نگرِ رنائقِ الیا ملت ہے پہنچنے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

کس سے چمان و قابا ندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ ترکِ صورت  
بے غم روزِ جدائی نہ نشاطِ غلبہ وصل ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت  
اپنے بلوتوں سے پس سارے نازی ہنسیار اک جزدگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت



ان کو حالی بھی بلاتے ہیں مگر اپنے مہمان دیکھتا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

آگے بڑھے نہ فقیر عشق بیتال سے ہم  
اب بھاگتے ہیں سایہ عشق تباہ سے ہم  
کچھ دل سے ہیں دے ہوئے کچھ آسمان سے ہم  
نچھ پانگھے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب ہے خوب تر کہاں  
یار اب اس اختلاط کا انجام ہو یہ نصیر  
اب ٹھیرتی ہے دیکھتے جا کر نظر کہاں  
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں  
آگ عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق  
ہم جس پر مر رہے ہیں تے بات ہی کچھ اور  
دل لچا ہوتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں  
آئے ہر وقت صبح رہے رات بھر کہاں

کچھ منہ ہی کھل سنبھلا غم بھراں میں نہیں  
نہمودیا یا اس نے ذوقِ حلاوت فکر و مسائل  
چاک دلی میں ہے درد جو کہ گریباں میں نہیں  
اک مزا تھا سودہ اب کاوش نہاں میں نہیں  
جس کم ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں  
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنوان میں نہیں  
ایسے الجھاؤ تری کا کل بیجاں میں نہیں  
اب وہ انگلی سی درازی شب ہجران میں نہیں  
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلمان میں نہیں

کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے  
بات جودل میں چھپائے نہیں تیری عالی  
جب یہ جانا کہ ہیں طاقت رفتار نہیں  
سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

یاران تیز گام نے حمل کو جالیسا  
یا کھینچ لئے دیر سے زندوں کو اہل وعظا  
ہم محو تار و جرس کارواں ہے  
کشتی کشتی کی پار ہو یا قدمیاں رہے

رہرو تشنہ ب نہ گھبرانا  
خوش ہے امید خلد پر حاکمی  
اب لیا حشر بقا تو نے  
کوئی پرچھے کہ کیا کیا تو نے

حق و نفا کا جو ہم جتانے لگے  
سخت مشکل ہے سسیرہ تسخیم  
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے  
ہم بھی آخر کو جی جرانے لگے

کیوں ٹرھاتے ہو اختلاط بہت  
نہ ملا کوئی غارت ایمان  
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی  
رہ آگئی سسیرہ پار سائی کی

## سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی

جھٹکے یار کا دل کو طال ہی گھا  
ذرا سی تھیس بھی شیشہ کو تھی بہت ساقی  
ہزار دھیان کو ٹالنا خیال آ ہی گیا  
ہزار تو نے بچا یا تھا بال آ ہی گیا

پیر معان کے معجز دیکھ چکے ہو مظلوم  
تم نہ پوچھوئے تو خیر حکم تو دہ جواز کہ

آئے اگر عروس ہر محل کے میکے میں اب کہہ دو یہ صومعہ نہیں زاہد پاک باز کا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا شراب بعد کو دی پہلے سب کو ست کیا  
کوئی خفا ہو تو ہو امر حق گریوں ہے تجوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

ناموں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تار نفس بھی ٹوٹ گیا  
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب تو وہ تیدی چھوٹ گیا  
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا  
اک شخص لگی تھی یوں ہی سی کیا جلدیشیشہ ٹوٹ گیا

آکے درخیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون کس کے دل میں ہر ادب آکے دیوانے کا  
خود چل اس کو چے میں چلنا ہے چلے پائے طلب کوئی وال ہاتھ پڑا کر نہیں لے جانے کا

نرگس پر خار یا کرتی ہے کام نہ ہر کا بادہ خوشگوار میں گھول دیا کسی ہم

ڈھونڈھو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں آیا اب ہیں ہم  
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم لے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم  
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ملکوں ساحل پر  
دریائے محبت کہتا ہے کچھ بھی نہیں آیا اب ہیں ہم  
لے شوق پہ کچھ تو ہی تاب تک یہ کرشمہ کچھ نہ ٹھہرا  
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں آیا آپ دل بتیا اب ہیں ہم  
مہر خان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے  
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاد اب ہیں ہم

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر ہیں فقط ہیں دو نام  
یہ اگر تسبیح ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں  
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں  
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے ہر گمراہ

ہوں گی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگہ ہنسائیاں  
دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں  
فصل خزاں ہے پد ملا اس سے خدا پناہ دے  
سنا یہ صبا کے بھی گلو پھٹنے لگی ہوئیاں  
حشر میں رند تھے خوش صحبت مئے سے چھوٹ کر  
بیر مغساں کو دیکھ کر دینے لگے دباٹیاں

دسریں سوہانہ دل میں آجوں نہ لب پہ ساقی قضاں رہے گی  
یہ ہی جو سماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی  
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو بچھا چلا اپنے دل کی تسکین  
بہت دنوں تک دلی دباؤ یہ آگ اے کارواں رہے گی  
بہت سے تیکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو  
نفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیان چہ گی  
ہزار کھینچ کر جدا ہو مجھ سے ہزار دوری ہو میرے تیرے  
جواک کشش حسن و عشق میں ہے مرے تیرے ریاں ہے گی  
ہزار نقش قدم سا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے  
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش لے کارواں رہے گی  
بہت سے بھولیں گے عجیبہ و گل یہی تو اس بلوغ کی روش ہے

چڑھائے جائیں گے آگ پر جو انہیں کی خوشبو میں ہے گی

نغمہ راس کا رکھ دل میں ہے میدا کا پڑا لگاے منہ جو آئینے کو آئینہ اسی کا ہے  
یہ بزم سے ہے میں کو تہہ دستی میں ہے محرمی بو بڑھ کر غور اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

گاہاں ہیں کچھ ایسے ادا فنا زمان کے کہ پہچتے جاتے ہیں نغزش سے پاکبازان کے  
تجھی کو نزع میں یو چھترے غمخوشتوں نے اخیر وقت جب آیا پیچھے نہ رازان کے  
نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر جبکہ گاہے رکتے ہیں رازان کو سرخ رازان کے

دل اپنی طلب میں صادق تھا مگر کچھ سوئے مطلوبہ گیا  
دریا سے یہ سوتی نکلتا تھا اور یا ہی میں جا کر دوب گیا  
لاریب غمخوشتی نے یتری تاثیر دکھائی مستوں کو  
بے باک جو میکش تھا ساتی اس بزم سے وہ محبوب گیا

تناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہکایا گیا ہوں  
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ اُدھر سے بدلوں آیا گیا ہوں  
ہیں اُختے قدم کیوں جانب دیر کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں  
دل مضطر ہے کوچہ لے رونق بزم میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

سید اکبر حسین کبر الہ آبادی

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام  
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

نہ سحر چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزہ ساقی • تو بچر صحنِ چین میں دیدہ زنگسے کیا حاصل

غیر کے ذکر میں کرتے نہیں میرا وہ لحاظ • تذکرے آتے ہیں اور نامِ بنام آتے ہیں

کم بختِ دل کو کیوں ہے نگاہِ نہیں سیاتہ • ان کو تو شوقِ ناز و اداس کے ساتھ ہی

دل کو انا جگہ تیر قضا کرتی ہے • حسن کا حق وہ نظرِ خوب ادا کرتی ہے

### محمد ہادی عزیز لکھنوی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن • بھوتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

شمع بج کر رہ گئی پر واز نہ جل کر رہ گیا • یادگارِ حسن و عشق اک داغِ دل پر رہ گیا

ایسے پھوڑ کے دیجھا کئے صورتِ میری • دل مضطرب نے مرے ان کو سنورنے نہ دیا  
اٹھ گیا آنجن ناز سے گھر کے کوئی • دردِ دل اپنا مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا  
تیرے دریاےِ محبت کے تھی کیا چیزِ عزیز • جو کوئی ڈوب گیا اس کو ابھرنے نہ دیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں گے کہیں • غصہ یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا  
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھ • تیرے ہر انداز کو چھب کر کوئی دیکھا کیا

یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعت نظر دینا ہے سب مری نگہ انتظار میں  
لے بید لی زبوں کھی بے کس کی اس توڑ دینا ہے شوق ہے دل اسیدوار میں

چارہ گر چپ میں کیوں علاج کریں کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

ہاں نہ پھیرو اے طلبگارِ امانِ نشاط ہم پر ہنسی اپنے تصور سے بہتے بایں گے

بیخودی کو چہ جاناں میں لئے جاتی ہے دیکھے کون مجھے میری خبر دیتا ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں پیدا ہو گیا جب مرے شکوے انھیں کچھ کچھ نزدینے لگے

## مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

بلائیں لے رہا ہوں اس میں کئے ذلّت کی لٹا تھا جس جگہ راہ وفا میں کارواں میرا

و فور شوق میں اک اک قدم میرا قیامت تھا خدا معلوم کیونکر جلوہ زار حسن تک پہنچا

زورِ نظر سے خود بخود بند نقاب کھل گئے حوصلہ چشم شوق کا ہم نے انھیں دکھا دیا

لئے میں عشق کے دل ویرانہ چھٹ گیا چشم و چراغ خلوت جا نا نہ چھٹ گیا  
اے محبت خدا کے لئے اپنی راہ لے گویا تیرے چھڑاے سے بچنا چھٹ گیا

ہم بھی بیٹھے ہیں مانغ و دل کو آماڈ کرے<sup>۳۷</sup> جب سے یہ شہرت ہوئی کھلنے کو نہیں گیسو رست

ہزاروں مر گئے مجنوں کے ایسے دیوانے مگر ملی نہ کسی کو بھی اتہمائے بہار

وہی یہ پھول ہیں جن کو ابھی یکھا تھا گلشن مگر کچھ اور ہی غصے ہو گئے گلچیں کے دہن

دے کے ساغر مجھے کس لطف سراتی نے کہا تو دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمہیں کیا دیتے ہیں

جہاں تک بس چلا شو رنغاں روکیں گے فرقت میں  
ذرا سی بات پر بدنام نام عاشقی کیوں ہو؟

زخم ننگا ناز وہ دیکھیں کہ نہ دیکھیں کیا داد نہ دیں گے مجھے ارباب نظر

ہجوم یاس جو دم بھر کو دل سے رست نجا تو لب تک آنے کی حرف دجا گوارا دے  
میں اپنی تار نظر کی بنا رہا ہوں نقاب یہ مدعا ہے مجھی سے تری نگاہ ملے

مذاق بے محل سے وحشیوں میں رہی ہوگی ہنسی رو کے رہیں چاک گریبان کھینچنے والے

کمال خیمہ گر زور جنوں پر خندہ زن ہوگا الہی آبرور کھمارے چاک گریبان

ریاض احمد ریاض خیر آبادی

پھول ہے لالہ صحرائی کا یا یکلیجہ ترے سودائی کا



اٹھے کبھی گھبرا کے تو بیٹھانے میں ہو آئے پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

فصل مئے میں ہن اہد کے فرشتے بھی نہ رکے • یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے

شیخ جی اگر گئے تھے حوض میں بیٹھانے کے • ڈوب کر حشر کو تر کے کنارے نکلے

بکال دوں گا شب وصل بل نزاکت کے • ڈر لیا ہے بہت تیوریاں چڑھائے مجھے

— تو بہ سے ہماری بولتی اچھی • جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

## رضا علی وحشت

ترنی سنا زرقاری سے ظاہر موج دریا تھا • نری ہنگامہ آرائی سے پیدا شور و عشر تھا

میں سادہ لوح واقف دم بتاں تھا • اقوار عشق کر کے گنہ گار ہو گیا

بنے گا ذوق عطا خود اس کا محرکہ آشنا نوازی

طلب کی خاطر دلا زکرنا ضرور کیا دست آرزو کا

دل و جگر خون کر رہی ہے سرور عشرت کی ناکامی

شراب فنا نہ میں تیرے ساقی ہے کام کیا ساغر و سبو کا

مطلب ہے ہر سیر باغ سے افزائش جنون • ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں

وحشت نہ پوچھ سستی جب جنون مست • وحشت کے گل کھلائے ہیں خوش ہلا میں

تلخی کشِ نو میدی دِویدار بہت ہیں اس نرگسِ بیمار کے بیمار بہت ہیں  
 عالم پہ ہے چھایا ہوا اک یاس کا عالم یعنی کہ تنہا تھے مگر قنار بہت ہیں  
 کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ رانی وہ طوفانِ یاد ہے اب تک زمین کوئے جاناں کو  
 کیوں مجھ کو زخوِ درقہ کئے دیتی ہے یار وہ بوئے دل آویز کہ ہمدوش صبا ہے  
 شمعِ عشق کہ ہم ہو گئے رسولے جہاں خوبیِ حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے  
 اک آن میں وہ کچھ ہیں تو اک آن میں کچھ ہیں کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی  
 ظالم کی تو عادت ہے سنا ہی رہے گا اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہے گی  
 کیا کیا بگڑ رہے ہیں وہ اہلِ نظارہ پر تقریب ہے کشوِ دن بند نقاب کی  
 ترے پھر کر آتے آتے کہیں نہ ہو کہ قاصد سری جان پر بنا دے مری دل کی نصیحت

### مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب قزلباش لکھنوی

بڑھائے جھیلے دریا دلی نے ساقی کی ذراے جام میں سوار آفتاب آیا  
 سنائیں کیا تمہیں نیزنگِ عشق کا قصہ تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خوب آیا  
 مری قید کا دل شکن ماجرا تھا بہار آئی تھی آشیایاں بن چکا ہے

میری قضاحتی برق تجلی کا کیا قصو  
وارثہ زلف کا نہیں پایہ فصل گل  
بدنام مفت جلوہ جانا نہ ہو گیا  
جب دل میں لہر آگئی دیوانہ ہو گیا

زاد حیات نے نہ سکا قصد دل کا تھ  
اس درپے جاتے جاتے میں افسانہ ہو گیا

بس اے فلک نشاط دل کا انتقام ہو گیا  
یہ خذہ طرب نما مبارک اہل دہر کو  
نہ دم لے لے نہ شریک غم، تجھے قسم عشق کی  
ہے وہ دل میں مدتوں لنگر سنبھل گیا  
یہ آشیانہ ستم، چمن میں ہو تو خرب ستم  
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں فصل میرا ہو چکا  
سہنا تھا جس قدر کبھی زیادہ اس سے رو چکا  
بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا  
فلک کو چھوڑا ہے کون اگر مجھے دبو چکا  
مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا  
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں فصل میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا دُوب کے ابھرا کیا حسن  
حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر بھی  
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا  
مجھ پر احسان تری آئی ہو می انگریزی کا

سلسلہ ذکر جنوں کا آج کل باقی کر کوں  
سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ لے دست جنوں  
ختم کب کا قلعہ حب میریاں ہو گیا  
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

متاع عشق کا ہر دل کے بعد کیا سودا  
کہ غم شدہ کا بھروسہ نہیں ملتا ملا  
تڑپوں تو راز کھولوں سینہ میں عشق ناخود

جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر  
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

بوٹے گل پھولوں میں جیتی تھی مگر وہ نہ سکی  
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

ان کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی  
نالہ کش برسوں کا ایک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر  
یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

تیرے ہوتے گل گلشن کو میں کچھوں تو یہ  
ابھی ایسی تو تھیں قوتِ تسخیر بہار  
میں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دردی میں شغول  
سب کو دیوانہ ٹھکے دیتی ہے تاثیر بہار

ہے روشنی قفس میں مگر سو جتا نہیں  
ابر سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

صبر کی سالم قبا میں تو ہزاروں ہیں مگر  
ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دل صد چاک

غیبت ہے قفسِ فکرِ ہائی کیا کریا ہم  
ہنیں معلوم اب کیسی ہو اچلتی ہو گلشن میں

بیانِ برقِ تختی چھڑا ہے اب سر طور  
عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے

ہجر کی شبِ نالہ دل وہ صدا دینے لگے  
سنے والے رات کٹنے کی دوا دینے لگے  
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مے  
جن پہ نیکہ تھا وہی پتے ہو ادینے لگے  
ایک نہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا  
کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

ہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے  
نہیں نہ جتنا نشانی تو رہتی  
بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بستے  
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رکھتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا  
ہیں سو گئے داستان کہتے کہتے  
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا  
زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے  
ہری ناؤ اس غم کے دریا میں ثابت  
کنارے پہ آہی لنگی بہتے بہتے

چلے ہدم ذرا سا زطرب کی چھٹی بھی سن لیں  
اگر ذل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

مرار و ناشب فرقت تماشا گاہ انجم ہے  
مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفان دیکھنے والے  
کہے جا بندہ چلا ہے داستان کا رنگ محفل کیا  
مری سنتے گئے ہیں نئے جاناں دیکھنے والے

بہت سی عمر کا رجبے بنا یا تھا  
مکان وہ جل گیا تھوڑی سی دہائی کے لئے  
بنا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے  
وہ نیکیاں نہیں ابھی جو ہوں بی کے لئے

شوق بہار باغ میں سینکے جتنے تو ہیں  
دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے  
غربت میں راہ گنتی ہے ناقب کے سبب  
قصہ سمجھ رہا ہے مرا ہم سفر مجھے

یادگار دہر ہے یہ خود فراموشی مری  
آپ کو بھولا ہوں زوروں کا فسانا یاد ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں درد دل  
بو جھ بیر ہے مگر سارے جہاں پہاڑ ہے

آئینہ اُن کو دکھایا جو خود آرائی نے  
ہاتھ رکھا مری آنکھوں پر شکیبائی نے  
طور پر تاب رہی یا نہ رہی خیر اسگر  
کچھ تو دکھلایا دیا ذوق تنہائی نے

بے شاد اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے میں دیکھتا ہوں خواب پریشاں کبھی کبھی  
اک عمر کاٹ دی ہے سوا دکشاہ میں دھوتا ہوں شب کو جیٹھ کے دامن کبھی کبھی

صبح وصال دور تو اتنی نہیں مگو راتیں ہیں بیچ میں ہی زلف سیرا کی

جدائی میں جس کو مٹاتی ہے الفت وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے  
وہی رات میری وہی رات اُن کی کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

دل اپنا خوف اسیری سے مطمئن کب تھا رہے جن میں مگر آشاں بنانے کے

تماشا چشم دل سے اہل عرفان کچھ ہی ہیں کسی پردے میں تصویر جاناں کچھ ہی ہیں گے

قفص کی تیلیاں اچھی ہیں نگوں سے نشیب کے یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارے

## حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری

فغاں میں درد دعائیں اثر نہیں آتا جو قم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا  
منہ پھیر کے یوں جلی جوانی یاد آگیا روشن کسی کا  
دیکھو جلیل گوشت و ست جائے گا نام عاشق کا

کوئی حسین ہو ہیں اک نگاہ کر لینا جگر کو تھام کے چپے سے آہ کر لینا

نیا زمند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو  
کوئی نے نہ سنے مجھ کو درد دل کہنا  
سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا  
اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

وہ شوق بھر ادل جھانست ہے تڑپ اٹھا  
جلستے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے  
ثابت ہوا مجھ پر ناوک کا خطا کرنا  
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

برانہ مانو اگر ذکر حور میں نے کیا  
اب اس کو پردہ دردی سمجھو یا کچھ اور کہو  
غزور تم نے کیا تھا فصور میں نے کیا  
تمہارے احسن کا چہرہ فصور میں نے کیا

خاک چمن بیش بزم گل کا عجب ہے رنگ  
سراغر کسی سے چھوٹے پر ہے شلوب کا  
روئے رنگیں پہ پیسنے کا عجب عالم ہے  
آب و آتش کو ہم دست دگر باندھنا

مستی بڑی بہار پہ کچھ منحصر نہیں  
ساقی کے دم سے روز ہے موسم بہار کا  
موسم گل میں عجب رنگ ہے بچانے کا  
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے

میں سمجھتا ہوں تری عفو دگر گوئی کو ساقی  
کام کرتی ہے نظر نام ہے بچانے کا  
کہہ گئے شمع سے پروانہ کو تا مکن ہے  
میں جلوں اور کلیں رہے ٹھنڈا تیرا

دامن سے اب لپٹ کے رہے گامراغبار  
آتا نہیں خیال اب اپنا بھی لے لیں  
اچھا کیا جو خاک میں ہم سے بنا دیا  
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

۳۸۶  
رہا اسیر تو شکوے ہے اسیری کی رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منہ نظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے ہاتھ رکھے ہوئے منھے ہیں گریبانوں پر

بجلی کی تاک جھانکتے تنگ آنکھی زبان ایسا نہ ہو کہ چونکے وہ غم و آشیان کیس

نگاہ برق نہیں پہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مڑے بے تازیوں کے آ رہے ہیں وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

اوانکھ چراگے جانے والے ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

ہمارا ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ یہ گل کھل رہے ہیں کہ مر جھا رہے ہیں

سے پاندھ بچے کرب کے سر تلخ نشیمن ہم ہیں کہ گلستان کی ہوا دیکھ لہے ہیں

باغدار و محبت میں اثر ہے کہ نہیں جس پر مڑتا ہوں اسے سیری خبر ہے کہ ہیں

راہ طلب میں ایسا خورفتہ کون ہوگا منزل پر ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ جو مرنے کے بیٹھے ہیں جان کستوں کی لئے بیٹھے ہیں

و اعظو جھڑو نہ زندوں کو بہت یہ سمجھ لو کہ پیئے بیٹھے ہیں

دست درختیہ کو خبر کر دے کوئی ہم گریبان لئے بیٹھے ہیں



کس کا میں دیکھنے والا ہوں پوچھو کلیمؐ اک تفر میں مجھے سطور نظر آتے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے ان کے لب پرؐ میں سمجھا کوئی جام پھلکا رہے ہیں  
ہے آباد میرے نقور کی دنیاؐ حسیں آرہے ہیں حسیں جاہے ہیں

نہ اشارہ نہ کناہ نہ تبسم نہ کلامؐ پاس بیٹھے ہیں معر دور نظر آتے ہیں

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپؐ کوئی جینے کا سہارا بھی نہیں

مریضوں کو تسکین دے دیتے جاؤؐ دعا لیتے جاؤ دوا دیتے جاؤ  
بکھلتی ہے اس میں بھی شان اک فنا کیؐ یوں ہی تم دعا پردعا دیتے جاؤ  
جلیل آہی جائیگا رحم اس صہم کوؐ تم اللہ کا واسطہ دیتے جاؤ

بوئے مئے پاک سے چلتا ہوا بخانے کوؐ ایک پری تھی کہ لگالے گئی دیوانے کو  
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقےؐ رکھ لوں میں دل میں اٹھا کرتے بیخانے کو  
دم زینت انھیں کیا جائے کیا یاد آیاؐ آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو  
ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کاؐ ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغرؐ رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد قفا غل شکار کوؐ کیا اب جواب دول نگہ انتظار کو

اس گرفتار کی پوچھو نہ ٹپ حسیں کے لئےؐ زرقفص کا ہو کھلا طاقت پر دوازہ ہو

بات ساقی کی نہ ڈالی جائے گی  
آتے آتے ان کو آئے گا خیال  
جسے سبب اپنی جگر کا وہی نہیں  
فنس گل آئی جنوں اچھلا بھیل  
سر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی  
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی  
عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی  
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

برائے سبب جو صبا لائی ہے  
ناتجربہ سے بہت دیر تھے ہم  
دراغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو  
دشت بخوں میں بہار آئی ہے  
بد محسوس کی لگا لائی ہے  
وہ بدراغ شب تنہائی ہے

اس شان سے وہ آج پئے استماں چلے  
جب میں جلوں لکھایا بھی اپنا نہ ساتھ ہے  
آنکھوں میں کون آئے اہل نکل گیا  
اٹھتا ہوں میں جو دشت جانے لگے جو  
فمنوں نے پاؤں جو م کے بوجھا کہاں چلے  
جب تم چلوڑ میں چلے آسمان چلے  
کس کی تلاش میں سرے اشک رواں چلے  
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

دل چرانے کی ادا خاص ہو اگرتی ہے  
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے  
شام غریب کا فسانہ ابھی چھوڑے دل  
کہہ گئی آج وہ سیدر دنگے ش کے بیٹے  
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے  
ہولے دامن تو جہادیدہ ترے پہلے  
پوچھ لیں حال وطن بادِ سحر سے پہلے  
ہم نہ واقف تھے ترے دردِ جگر سے پہلے

کلی نہ آہ منہ سے مرے دل میں رہ گئی  
تلوار کھینچ کے پتھرِ قاتل میں رہ گئی  
تھکے تھکے جاں نثار وہ سب سے گئے تیار  
چلتی ہے تین تار مزے لٹا لٹیل  
صد شکر باتِ غیب کی محفل میں رہ گئی  
سب کی آرزو دل بسمل میں رہ گئی  
رونی ہی رونی آپ کی فعل میں رہ گئی  
کہنا نہ پھر بھی کہ ہوسر دل میں رہ گئی

شب و عدہ عذر خاہور با ہے  
ستم بے ستم کھنڈ دل کا ڈھاتا  
جیل آج کل کشور دل میں اپنے  
داں آج خون وفا ہو رہا ہے  
یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے  
نغم عشق سراں روا ہو رہا ہے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو بھرتے ہیں بدر  
سیر چین کو آپ نگھے تھے یہ گل تھلا  
آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے  
بھونوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں ہی  
یا مہر جبر کا شوق تھا یا انک ننگاہ میں  
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں ہی  
دہر کی کلیم کو حسرت نہیں رہی

دل ہے عجیب گل چین رو نگار میں  
زنجب تو پھول کی ہے مگر وہ فاکا ہے

بہم تم ملے نہ تھے توجہ الی کا تھا ملال  
ابا یہ طال ہے کہ تمنا مکمل گئی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے تنہا مقصود کیا  
ست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہ باقی  
بے خودی میں بھی یہی نہ تھے کلہاڑی جلیں  
خضر نے راہ بتائی مجھے مینا نے کی  
آنکھ کے سانسے جلتی نہیں بجائے کی  
شیشے آباد رہیں خیر ہو بجائے کی

مست کرنا ہے تو غم نہ سے رگا دلتی  
پارسانی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیں  
تو پلائے گا کہاں تک مجھے بیانے سے  
جھوٹے آنچلے آتے ہیں سیانے سے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی  
دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیں  
دیکھو کون پیشتر آئے  
باغ جیسے بہار پر آئے

وہ پھر بھی حسن پہ اپنے غور کرتے ہیں  
یہ جانتے ہیں کہ ہے شام ہر سحر کے لئے  
شب وصال گئی داغ دے کے فرقت کا  
نیا یہ بھول کھلا دامن سحر کے لئے  
جلیل دیدہ خونبار سے خدا سمجھے  
لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

سینے سے میں لگائے ہوں بھگو خیال میں  
اوست نادیکھ تجھے اپنی خبر بھی ہے  
دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے  
اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو نظر بھی ہے  
شوخی بھی ہر نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ  
آنکھ اس کی پردہ دار بھی پردہ در بھی ہے

خون میرا اگر شریک ہوا  
رنگ دے جائے گی حیاتیری  
عشق کا آج امتحان ہے جلیل  
مشکل آساں کرے خدا تیری

چھنے والے تجھے خبر بھی ہے  
ننگ شوق پردہ در بھی ہے  
کچھ تو بے چین ہیں وہ شوخی سے  
کچھ مری آہ کا اثر بھی ہے  
تپے تماشا کہ دل فگاروں میں  
نام قاتل کا چارہ گر بھی ہے

ہو مزہ تم جو اٹھا دو رخ روشن سے نقاب  
شمع نازاں ہے کہ ہے رونق محل مجھ سے  
جذبہ دل کا اثر ہو کے رہا ان یہ جلیل  
اب تو ہوتے ہیں اشائے محض مجھ سے

ہیں کیا لے جنوں کا نئے جو دامن گیر تے ہیں  
نہ ہم رکھیں گے دامن کو نہ وہ الجھیں گے دامن سے  
خدا جلے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ بتا ہوں  
اٹھک گزشتہ محشر تمہاری چشم برفن سے

دیکھا جو حسن یا طبیعت پل گئی  
آنکھوں کا تھا قصور جھری دل پل گئی

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا

جب تک خلش درد تھی یک گونہ مرا تھا

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں

نار بھی ہوتا رہے ہوتی رہے یاد بھی

عجب ادا ہے چمن میں بہا آتی ہے

پھر شوق تماشا سے جاتا ہے کسی سمت

ادا داتیری موجِ شراب ہو کے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا ان کو

چمن کے چھل بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے

کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں تیری

کھدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال

اللہ دری تھلی کہ بخیا کے آگے

مہم پر ساری جوانی سٹاوی

جب کے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

دو قدم کو چہرہ رسوائی ہے

سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

کئی کلی سے مجھے بونہ یا آتی ہے

یہ جس پر آتی ہے بے اختیار آتی ہے

پھر ذوق طلب مجھ کو تماشا دہنا دے

نگاہِ مرست سے دنیا خراب ہو کے رہی

اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی

مرمر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

یوں شمع ہے مغل میں مغل میں نہیں ہے

## شوکت علی خاں فانی

یہ ترا نگاہِ شوق کوئی رازِ دامن نہ تھا      آنکھوں کو ورنہ جلوہ جاناں کہاں نہ تھا  
اب تک تری گلی میں یہ سوا ایمان نہیں      اب تک تو اس زمین پر کوئی آسمان نہ تھا  
ہر شاخ پہ یہ شجر سے نہ تھی جلیوں کو ناگ      ہر شاخ ہر شجر یہ مرا آتشیاں نہ تھا  
اگر سے بے نیازِ آدمی آدابِ انعامات      دیکھا مجھے تو پاسے نظرِ دریاں نہ تھا  
میرے دلِ رنیور کا حسنِ جلب تو دیکھ      گویا زباں پہ حرفِ تمنا گراں نہ تھا

اور تسلی سے سوا ہو گئی      دردِ جگر یہ بجھے کیا ہو گئی  
اور ہیبل کی تڑپِ نفوس میں آج      کون گرفتار بلا ہو گئی

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا      ایک گم شدہ سپہ سالار اسی دیوانے کا  
ایک معصوم ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا      نہ لڑائی کا ہے کو ہے خواجہ پدیوانے کا  
مختصر قصہ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوا      راز کو این خلاصہ ہے اس افسانے کا  
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میتِ فانی      زندگی تمام ہے سر مر کے جسے جانے کا

خود برق ہو اور طورِ تجلی اسے گنہ رجا      خود شعلہ بن اور وادیِ سینا سے گنہ رجا  
یے واسطہ خود نگری اپنی طرف دیکھ      آئینہ انجما حسنِ خود آرا سے گنہ رجا  
اپنی ہی نگاہوں کا یہ لفظ و کلماتِ شک      اس سرحدِ سعیِ تماشا سے گنہ رجا

کیوں جنوں پھر نہ بیا بیاں میں بہا لائی ہو      بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

لے جذبے خودی ترے قربان جائے      چترائے دل میں کوئی مجھے دھونڈتا ہوا  
نیری ہوس کو طیش دو عالم بھی تھا قبول      تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

بچہ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا      دولت دو جہاں تو وی اک دل ملتا دیا  
دل ہی نکادناز کا ایکہ او اشناس تھا      جلوہ برق طور نے طور کہ یوں جلا دیا  
دل میں سما کے پھر گئی اس بندھا کے مگر      آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھک دیا  
بہت کسی طرح کٹی جذبہ مری زندگی کی را      چھیر کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا  
یس نہ ورد ہی نہیں حق تیرے دو ابھی      فانی تو ناما امیر کہ موت کا آسرا دیا

شوق سے ناکامی کی بد دست کو چھوٹا دل ہی چھوٹ گیا  
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بٹھ گیا جی چھوٹ گیا  
مفصل نکل آئی یا اصل آئی کیوں درندہاں کھلتا ہے  
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا  
منزلِ عشق پہ تہنا پہونچے کوئی تنہا سا      نہ تھی  
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک لک سا تھی چھوٹ گیا  
فانی ہم تو جیتے جی وہ سیت ہیں بے گور و کفن  
غربت جس کو اس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا      اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا  
دشتِ بقید چاکِ مریاں و انہیں      دیوانہ تھا جو معتقدِ اہل ہوش تھا

جمالِ خودِ رخِ بے پردہ کا نقاب ہوا      نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا  
لا ازل میں مجھے نیری زندگی کے عوض      وہ ایک لمحہ ہستی کہ صرف خواب ہوا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کیجئے  
 مگر پھر بھی ذوق ٹٹا شام کامیاب ہوا  
 الٹ گئی مری امید و بیم کی دنیا  
 یہ کیا نظام تناسل میں انقلاب ہوا  
 گناہگار بھی دل مگر تصور معاف  
 ظہور شوق بہ اندازہ حجاب ہوا  
 قضا کو مژدہ فرصت کہ فانی ہجور  
 شہید کشکش جبر و اضطراب ہوا

جلوہ عشق حقیقت تھی حسن مجاز بہانہ تھا  
 شمع جسے ہم سمجھتے تھے شمع نہ تھی پروردہ تھا  
 شعلہ آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں  
 آنکھ کھلی تو دینا تھی بند ہوئی افسانہ تھا  
 دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو مچانے تو  
 ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پار تھا  
 فانی کو کیا ہی سہی پھر بھی تجھی سے نسبت تھی  
 دیوانہ تھا، تھا کس کا تیرا ہی دیوانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہیں سار کیا  
 ہم تو چین پرست ہیں بھول کہاں کے خار کیا  
 دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک  
 حوصلہ امید کیا ظرف امید وار کیا  
 جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو  
 وہ غم انتظار کب شب انتظار کیا  
 کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا  
 آرزوں کی کیا بساط شوق کا کلا و بار کیا

وہی برق تجلی کا فرما اب بھی ہے لیکن  
 نگاہوں کو میرا ہی نہیں بے ہوش ہو جانا  
 بہار اپنی چمن اپنا فقس کی تیلیوں تک ہے  
 مبارک نگہت گل کو چمن پرودش ہو جانا  
 قیامت ہے یہ ٹھوڑا داستان عشق کا یعنی  
 مرے راحت طلب دل کو اذیت کو ش ہو جانا

کیا سوال تو آواز باز گشت آئی  
 جواب مجھ سے طلب ہے مے سوالوں کا  
 جنون شکوہ بیداد پر خدا کی مار  
 اثر کے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

آغوش فنا میں ہم پروردہ آفت میں  
 اے فتنہ دوراں اٹھ لے حشر یا ہو جا



۳۹۵ ہر قافلہ دل کو قدمزدانہ منزل سے  
ہر رہ گزر غم میں نقش کف پار ہوا

اس دل یلوس کی دیرانہ سازی کچھ نہ بوجھ  
اس کے دامن سے اٹھتا ہوا بے منت شوق  
اس نے جب رجو حین تاکا بیاباں ہو گیا  
یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہو گیا

گل میں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا  
ہر ذرہ جلوہ نگاہ ہے ہر دل ہے چشم شوق  
اللہ کیا ہوا وہ زمانہ ہمسار کا  
اللہ سے اہتمام تماشا کے یار کا

شاید میں درخونگہ گرم بھی نہیں  
آنکھیں چراگے آپ نے انسانہ کر دیا  
کجی تڑپ رہی ہے مرے اشیائے دور  
جو حال تھا زباں سے قریب بیاں کے دور

بنایا تھا نشین شاخ گل پر کس گھری بارب  
بکھی جاتی ہے ہر برق بلا شاخ نشین پر

کون اٹھائے مری وفا کے ناز  
اب نئے سرے سے چھڑ پرودہ ساز  
دل ستم دوست وہ رقیب نواز  
میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز  
لے شب ہجرتی عمر دراز  
ایک ہے تیری بات کا انداز  
ہو گئی صرف ہمت پرواز  
صور و منصور و طور ارے قور  
رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا  
بات پہ پوچھی تری جوانی تک

نہ انتہا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم  
ہو انداز رضا فاش وہ تو یہ کہتے  
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں وہ بھی کیا معلوم  
مرے نصیب میں تھی ورنہ سبھی نامعلوم

مری وفا کے سوا غائب تھا کیوں ہے تری جفا کے سوا حاصل وفا معلوم

وادی شوق میں دارنہ رخسار ہوئی ہم بے خودی کچھ تو تیا کس کے گنہ گار ہیں ہم  
حسن حیرت بر سر پہ نہ شانہ نہ ہی تیری محفل میں ہیں گو نقش بدلوں میں ہم  
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزائے فانی دو گھڑی ہو جس میں آنے کے گنہ گار ہیں ہم

گو بیٹھے بھی اٹھے بھی ہم محفل دشمن میں تیری خاطر بیٹھے گئے دل زار کی صورت اٹھے صورت درد و جگر ہم  
مشکوہ جو برتیاں ہم کرتے ظاہر درد نہاں ہم کرتے مانا آہ و فغاں ہم کرتے لائے کہاں سے تجھ کو اثر ہم  
دوست تسلی دینے آئے لے کے دو ایل چارہ گر آیا بلجھے آئی زخم بھر پر ادراک تازہ آفت مرہم  
ڈوب ہی گیا اسے کشتی ہستی کچھ تو بوند آخروں کہاں بھر غلام خیر جہاں میں یوں لایا میاں ریز کے زیر و زبر ہم

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک چلے بس نے دل کی پوری کی ہے ایک اسی کا نام تہیں  
رک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں خیرین آپ نے تیور کیوں بدے آہوں میں کسی کا نام نہیں  
دل ہی پوچھا بس نہیں جلتا ان کی شکایت کیا کچھے آپ ہم اپنے دشمن ٹھہرے دوست پر کچھ الزام نہیں

مرکزے خیال کو مائے ہوئے تو ہیں ہم جان دے کے دل کو سنبھالوئے تو ہیں

بیزار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل  
تائیر سے خفا میرے نامے ہوئے تو ہیں  
ہاں درد عشق ان پر کرم کی نظر ہے  
صبر و قرار میرے حوالے ہوئے تو ہیں  
قافی تیرے محل ہمدن جبرای سہی  
سایحے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

غم خانہ دل کو کیا کنا وہ کچھ بھی سہی : بات کہاں  
خلوت میں یہاں جرجلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں  
سننے تھے محبت آساں ہے وائے بیت آساں مگر  
اس پہل میں جو دشواری ہے وہ شکل کی شکل میں نہیں  
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل دور یا ایک ہے  
پھر لطف امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل ہیں نہیں

وہ ایک رنگینی نظر ہے جو سو بہاروں میں دیکھتا ہوں  
مری محبت کی غایوں میں ادائے حسن تمام دیکھو

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار  
سبکھ رہا ہوں میں کلیوں کے سر کرنے کو  
ترے نگاہ نے سب کھلا دیئے زمانے کو  
اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو  
خیال یار بھی کھویا ہوا سارہ تھا ہے  
جگر میں آگ لگا کر نہ آج بھانے کو  
نگاہ لطف نہ فرما نگاہ ناز کے بعد  
ترپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو  
زنا دیر سر آنداز تھا مگر شافی

منہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے  
خورشید قیامت نے سر سے دامن سے  
دل جن سے ملے اب وہ گاہیں نہیں ملتیں  
ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے

ہوش ہے نہ دوش کا فکر ماں رہ نہ جائے غلوت یاد یاد میں کوئی خیال نہ جائے  
عجز اذھر غرور دونوں غور سے غور دامن مدعا سے دور دست ہوا نہ جائے

اک برق سرخورد ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں ترے ہونٹوں پہ منہسی آئی ہوئی سی  
سختا ہوں جو آتی ہے صدا پر وہ دل سے اُمید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی  
یرے دل برباد کے دھندلے سے نشا ہے اس باغ میں کلیاں ہیں جڑ جھائی ہوئی سی

آزردہ کیوں مجھے مری شفتگی سے تم آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی  
اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی  
بے پردہ ذکر بار ہے در پردہ یاد یار میری دباں پہ ہے جو دل برہن میں تھی  
وہ گل ہے گل جسے تری خلوت میں بار تھا وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی  
بیلا ہوا تھا رنگ گلوں بکارتے بغیر کچھ خاک سی آڑی ہوئی سائے چمن میں تھی

فضل گل خیر ہے دشت میں دیوانوں کی دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی  
چشم ساقی کی وہ محمور نگاہی تو بہ آنکھ پرتی ہے پھلکتے ہوئے پیاؤں کی

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے  
ہاں ہم نہ تھے فریب تناسے بے خبر کیا کہئے کیا کیا دل امیدوار نے

داد خود نمای لے وعدت تناسے آئینہ طلب فرما کثرت تماشا سے  
حشر وہ کیوں چھپیں کہ نہ دوں جو نسبت شان بے نیازی کو آرزوئے بولے  
لے ترا تصور بھی جا کے اب نہ آئے گا رسم ہوش! سختی ہے عاشقی کی دنیا سے

اٹھ اے نشا طشوق اٹھ متاع بنائے ہوئے وہ دامن نگاہ میں ہیں بکریاں لئے ہوئے  
 حجاب روزگار میں جھلک ہے یادِ یار کی نشا ط آخر کار سے غم نہاں لئے ہوئے  
 بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہ و افسوس چلی ہے دل کی وا دیوں سے آندھیاں لئے ہوئے  
 نہ پوچھ عہد ہوش کی کہ دامنوں کی آڑ میں بھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لئے ہوئے

تغیر آئیاں کی ہوس کا ہے نام برق جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

دنیا میری بلما جانے ہنگی ہے یا سستی ہے موت ملے قومفت زلوں ہستی کی کیا سستی ہے  
 آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں جوا جڑے اور پھر نہ بے دل نہ زالی سستی ہے  
 بجز گناہ کے دم تک میں عصمت کا لے چکے ہستی ہے تو بندگی ہے زبندی سستی ہے  
 جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بد میں آگے مرضی گا کہ کی ان دامنوں تو سستی ہے  
 بنگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہے جب بھی دنیا سستی تھی اب بھی دنیا سستی ہے  
 آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اند آتا ہے دل پر گھنا سی چائی ہے ٹھنکی ہے زبستی ہے  
 دل کا اجڑنا سہل سہی بنا سہل نہیں ظلم سستی بسنا کھیل نہیں ہے بے بے سستی ہے  
 قافی جس میں آنسو کیا دل کے ہو کا کال تھا ہاے وہ آنکھ اب بانی کی رو بوندوں کی ترسٹی ہے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبہ قیامت کے مری نظریں ہیں جلوے کسی کے فامست کے

لب تک آجائے غم ایجر تو شکوہ ہو جائے آپ سن لیں تو مجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

حساب حسرت جبرم نظارہ دل سے پوچھے نظر تو ایک جھلک کی گناہگار ہوئی  
 بہارِ نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہارِ ہسوئی

۴۰۰  
 خدے خانے کو کہتے ہیں بقول اعظمی  
 دشت و خشت ہے وہ ذرہ جو بیاہو جا

دشت تازہ کا نور و مبارک نئے عشق  
 پھر بہار آئی مجھے خلعت عریانی سے  
 اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یا رب  
 درو دیوار دے اب اھیں یرانی سے

وہ وعدہ آساں پر پائل نظر آتا ہے  
 اب کار متنا پھر شکل نظر آتا ہے

ہوتا نہیں اب ان کی محفل میں شمار اپنا  
 یوں بیٹھے ہیں ہم جیسے اٹھ سے گئے محفل سے

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے  
 میں تھا ابرو دام تو بجلی جن میں تھی

یہ ذوق نظر نرم تماشا زہ ہے گی  
 منہ پھیر یا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

وہ نظر کا میاب ہو کے رہی  
 عشق کا نام کہوں کریں بدنام  
 دل کی بستی خراب ہو کے رہی  
 سر بسر اضطراب ہو کے رہی  
 خود ہی آخر شراب ہو کے رہی  
 بے حجابی حجاب ہو کے رہی  
 ہم سے فنا کی نہ چھپ سکا غم دوست  
 آردو، بے نقاب ہو کے رہی

ہاں، ناخن غم کھی نہ کرنا  
 ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

## سید فضل الحسن حسرت موہانی

عشق میں تیرے دل جو ایک ہی بن بیجوی جان عزیز بن گئی حسرت بے قیاس کا  
 رونق پیر بن ہوئی جوئی جسم نازین اور بھی شوخ ہو گیا رنگ تیرے لباس کا

رنگ سوتے میں چھپتا ہے طرہ داری کا طرہ عالم ہے ترے حسن کی میداری کا

دل کو خیال یار نے محسوس کر دیا ساغر کو رنگ بادہ نے پر نور کر دیا  
 مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حامل دل بھر تو نے یاد آگے بدستور کر دیا  
 گتسخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ لیکن ہجوم شوق نے عبور کر دیا  
 بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجر اول آخر حضور یار بھی نہ کور کر دیا  
 حسرت بہت ہے مرتبہ عاشقی بلند تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

مٹتا ہے مٹاں سے اب شوق کہیں تیرا ہے پیش نظر ہر دم حسن نکس تیرا  
 آنکھوں کے تہہ نے سب کھول دیا رہ ہم پر نہ چلا جاوے ہیں جہنم تیرا  
 مرغوب مٹا ہے انہیب دل و جاں ہے ہر وضع بھائی تیری ہر شیوہ کہیں تیرا  
 ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سے تری باتیں اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا

رنگ یہ لایا ہجوم ساغر و پیمانہ آج بھر گئی سیرا بیوان سے منسلک زندانہ آج  
 بسکہ زیب آجین ہے جلوہ جانا نہ آج ہے سراپا کردار ہر عاشق دیوانہ آج  
 یہ جوابے تابیوں پر نشہ سے لکا اثر کہہ دیا اب اُن سے حال شوق و اشتیاق آج  
 رشک سے مٹا مٹ گئے ہم نشہ کا کاملا جب ملا لب لب سے مانوس سے پیمانہ آج

ہے فروغ بزم بیکتائی جو وہ شمسِ جمال  
فرق ہے رنگینوں میں سینوں میں چرچو  
آگئی ہے دل میں بھی بیتابی پروانہ آج  
ہے سراپا بے خودی وہ نرگسِ متانہ آج  
پڑ رہی ہیں سب نگاہیں اس پشیمانہ آج  
میں ہی اس حسرت نہیں محوِ جمال نے یا

محبورِ مجھ کو جان کے عہد و وفا کے بعد  
محبوبی سوال سے اس چشمِ ناز میں  
بے ہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد  
منظوریوں کا رنگہ عیاں دیکھ کے بعد

محرومِ طلب ہے دل دلیگر ابھی تک  
اک بار سنی تھی مومے دل میں ہے موجود  
باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک  
اے جانِ تنہا تری تقریر ابھی تک  
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلش تیرا ابھی تک  
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی

روشنِ جمال یار سے ہے تجسینِ تمام  
حسرتِ غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب  
دیکھا ہوا ہے آتشِ گل سے چمنِ تمام  
دل نے بھی تیرے یکہ لمبے چلنِ تمام  
بے ہوش اک نظر میں ہوئی آئینِ تمام  
دیکھو تو چشمِ بار کی جادو نگاہیاں

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں  
عقلِ صبرِ آزما سے کچھ نہ ہوا  
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں  
شوق کی بے قراریاں نہ گئیں  
دل کی اُمید واریاں نہ گئیں  
اپنی الفتِ شعاریاں نہ گئیں  
عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں  
درد کی غم گساریاں نہ گئیں  
تجھے جو ہر رنگِ ناز ان کے ستم  
مر کے بھی خاکِ راہ یار ہوئے  
حسن کی دل فریبیاں نہ گئیں  
سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت



نگاہ شوق کیونکہ کامیاب شادمانی ہو غضب کا رعب ہے، اُس شوخ کے منجھاسی

نہیں ہے ضبط شوق پہ آکر معاملہ اس درجہ آرزو کی برصیں بے نیاز یا  
رنگ بہار باغ ہے جہاں یک نفس اسے واسے غلیب تری شادمانیاں

نہ چھڑے ہم نشیں کیفیت صہل کے اُٹنے شراب بے خودی کے جھکوسا غریب آتے ہیں  
نہیں آتی تو یاد آئی ہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں کے صبر کی کہیں آرزوؤں سے بھر کرتی ہیں تقدیریں کہیں  
بے زبانی ترجمان شوق بیحد ہو تو ہو ورنہ پیش بار کام آتی ہیں تو نہیں کہیں  
الطاف یاد تھا اک خواب آغا زوفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیر کہیں  
تیری بے صبری بھرت خام کاوی کی نیل گریہ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

نگاہ یار جسے آشنا سے راز کرے وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نڈا کرے  
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد ترنے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے  
خود کا نام جنوں پر اُچھا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے  
امید وار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ تری نگاہ کو اللہ دلواز کرے

لایا ہے دل پر کتنی خرابی سے یار تیرا حسن شرابی  
پیرا ہن اس کا ہے سادہ زنجیر عکس مئے سے شیش نگاہی  
عشرت کی شب کا وہ دور آخِر (ق) نور حسرت کی وہ لا جوابی  
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں کیفیت ان کی وہ نیم خوابی  
بزم طرب ہی وہ بزم کیوں ہو ہم غم زدوں کو داں بار یا بانی

اس نازنین نے باوصف عصمت کی دسل کی شب وہ بے حجابی  
 شوق اپنی بھلا گستاخ دستی دل ساری شوخی حاضر جوابی  
 وہ روئے زیبا ہے جان خوبی میں وصف جس کے سارے کتابی  
 اس قید غم پر مستربان حسرت عالی جنابی ، گردوں رکابی

اس بزم سے آزرده نہ آسگی محبت آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے  
 جبے کے گلے ہے ہنس تاکوئے طامت مجبورئی دل خاک بسرے کے گئی ہے  
 پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں کہ دعا کو قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے  
 اللہ سے کافر ترے اس حسن کی مستی جو زلف تری تابہ کمر لے کے گئی ہے

جو چاہو سزا دے لہ تم اور بھی کھل کھیلاو بدم ہم سے قسم لے لو کی ہو خوشکایت بھی  
 دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر اے ساتی جاں پرور کچھ لطف عنایت بھی  
 دل لیکر سے دیوانہ اس حسن گلابی کا رنگین ہے اسی روئے شاید غم وقت بھی  
 خود عیش کی گستاخی سب تجھ کو کھالے گی اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی  
 عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خزانہ ک نازک اسی نسبت سے ہے کار محبت بھی

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے تم یہ تو خوب کار پسندیدہ کر چلے  
 مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے بیدار سارے فتنہ و خوابہ کر چلے  
 اظہار التفات کے پردے میں اور بھی وہ عقدہ ہائے شوق کو حمیدہ کر چلے  
 ہم بے خودوں سے چھپتے سکا راز آرزو سب اُن سے عرض حال دل قدیدہ کر چلے  
 تسکین اضطراب کو آنے تھے وہ ہنر بے تابوں کی روح کو بالیدہ کر چلے  
 یہ طرف ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

ہم سے اور ان سے مہربانی ملتی جاتی ہے  
 ہوش و حواس کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 شوق و محبت کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 کوشش و کوشش کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 رہنمائی و رہنمائی کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 سہارا و سہارا کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 شہرت و شہرت کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 وصال وصال کی مدد سے ملتی جاتی ہے

رہنمائی و رہنمائی کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 ہوش و حواس کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 شوق و محبت کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 کوشش و کوشش کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 رہنمائی و رہنمائی کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 سہارا و سہارا کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 شہرت و شہرت کی مدد سے ملتی جاتی ہے  
 وصال وصال کی مدد سے ملتی جاتی ہے

زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا  
 تمہاری محبت نگاہی التماس ہے زبان نکلتی  
 ترا شوق سلم ظالم خیال امتحان نکلتی  
 یہ شان کج اما انی طبری جان ناقص نکلتی

زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا زہرا  
 تمہاری محبت نگاہی التماس ہے زبان نکلتی  
 ترا شوق سلم ظالم خیال امتحان نکلتی  
 یہ شان کج اما انی طبری جان ناقص نکلتی

بہ غرور دلربائی یقین دل سندی  
 ترے عاشقوں کا دیکھ کر کوئی رنگ نہندی  
 وہ ستم بھی گر کر ہے تو بے لطف ہو نہندی  
 کہ جہاں ہے مہربانی دل کو مہربانی سندی  
 مری مہربانی کی پستی کے شوق کی بلندی

بہ غرور دلربائی یقین دل سندی  
 ترے عاشقوں کا دیکھ کر کوئی رنگ نہندی  
 وہ ستم بھی گر کر ہے تو بے لطف ہو نہندی  
 کہ جہاں ہے مہربانی دل کو مہربانی سندی  
 مری مہربانی کی پستی کے شوق کی بلندی

اس شوق پر آتا ہے الزام پشیمانی  
 جتنے ہیں بد شکاری سننے ہیں آسانی  
 واں لطف سے پیدا ہے انداز ستم رانی

اس شوق پر آتا ہے الزام پشیمانی  
 جتنے ہیں بد شکاری سننے ہیں آسانی  
 واں لطف سے پیدا ہے انداز ستم رانی

خیال یار میں بھی رنگ لہے یار پیدا ہے  
ترے رونے دلا رکے تصور کا یہ عالم تھا  
مرے اصرار مضطر میں نہاں تھی مری یا بوسی  
نفا میری تجھ نکل بے زبانی آشکارا تھی  
یہ رنگین ماجرا سے عشق شیریں کا پیدا ہے  
کہ چشم شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے  
ترے اقرار آسان سے ترا نکال کر پیدا ہے  
ستم تیرا بہ رنگ پریشاں اغیار پیدا ہے

عرض کرم ترک جفا بھی نہ کیجئے  
اس بے وفا سے مصلحت شوق کر نہ ہی  
منظور ہے جو ترک محبت ہی آپ کو  
حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت غمش میں  
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے  
اپنی ستم کشی کا گلزار بھی نہ کیجئے  
غم پر اہجوم ناز و ادا بھی نہ کیجئے  
تو گناہتا ہے یا خدا بھی نہ کیجئے

بھیر اسی لطف ستم گوش کا مشتاق و دل  
تجھ میں کچھ بات لے ایسی جو کسی میں نالی  
دل بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت  
ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جفا دیکھا ہے  
لوں تو اوروں سے بھی دل سے لگا دیکھا ہے  
تجھ شوق نے کیا جانے کیا یاد دیکھا ہے

یا جوش اضطراب کو مدام نہ جانے  
واقف ہیں خوب آپ کی طرز جفا ہے  
یا دل کو آشنائے محبت نہ کیجئے  
اظہار انکسار کی زحمت نہ کیجئے

ستم ہو جائے تہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے  
بھلا کویتی میں سب رنج و الم حیرانیاں مری  
جھٹلے یار کے فکروں نہ کر لے گنج نامکامی  
وقار صبر کھو یا اگر یہ ہائے بے قراری نے  
بہ عملے وفا کیوں شکوہ ہیج جو ہے حسرت  
محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ہوتا ہے  
تری تکلیف صحتی قسم ایسا بھی ہوتا ہے  
امید و یاس دونوں ہوں ہم ایسا بھی ہوتا ہے  
کہیں لے اعتبار چشم غم ایسا بھی ہوتا ہے  
دیار شوق میں لے محو غم ایسا بھی ہوتا ہے

گراں گزر گیا حرف آرزو اس طبع نازک  
نغمہ و شوق اس مفہوم رنگین کو ادا کر دے  
غزوہ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت  
کہیں ایسا نہ ہو یہ شوق کو کبھی خود ناکار نہ کرے

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی  
رو برواں کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی  
مہم سے بوجھاد گئی نام و نشان بھی ان کا  
جستجو کی کوئی تہید اٹھائی نہ گئی  
دل کو تھا حوصلہ عرض تناسوا نہیں  
سر گذشت شب بھراں بھی سنائی نہ گئی

دل آدروئے شوق کا اظہار نہ کرے  
ہزار کہ اس پریشیم کی نوازش  
ہم جو رستوں پہ گنجان ترک و فاکا  
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کرے  
ہوتا ہے برا لذت آزار کا پسکا  
عشاق ستم کش کہ ہوس کار نہ کرے  
چمک حد بھی ہو اس شورش خاموش کی نشت  
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کرے  
مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کرے  
یہ شکش غم تجھے بے کار نہ کرے

شک انھیں مجھ یہ کار دانی کا  
تم جو کرتے تو ہم کو تمہا کافی  
کچھ ٹھکانا ہے بگمائی کا  
اک اشارہ بھی ہربانی کا

حسن بے ہر کو پروئے تنایک ہو  
کثرت حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی  
بے مثالی کے ہیں یہ رنگ حیا و صفحہ حجاب  
برق لرزاں ہے کوئی محرم تماشا کیا ہو  
ہم غرض نہ کہاں مرتبہ عشق کہاں  
بے نقابی پہ ترا جلوہ یکسا کیا ہو  
ہم کو سمجھیں وہ ہوس کار تو بجا کیا ہو

تجدید لطف یار کی لذت میں کیا کہوں  
ان کی نگاہ قہر کو ہم نے منالیا  
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے  
پھر اس طبع کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

۱۰۸  
 ناگوار سے بہت تنہی، بھراں لیکن  
 یہ جو ایک دورِ نیست کی غلش ہے حسرت  
 تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا سے یہی  
 مطلقہ دل ہے یہی جان تھا ہے یہی

بہت ناں بہت ترس، دروے دعا میری  
 وہ دل کی تزل قریب ہے حسرت  
 بخون ہے کہ نہ سن لے کہیں اور میری  
 ہوئی ہے آرزو شوق رہنا میری

ان کو نہ کوئی سمجھے بیدار نہیں کرتے  
 دینا جو ہو دوا آخر یہ ادا کیا تو  
 ہم جو رکے خوگر میں فریاد نہیں کہتے  
 انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے  
 اس پر بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں ہم دونوں  
 کر دقت بتاں حسرتِ ناحق زخموں اپنا  
 ہم شاد نہیں ہوئے، تم یاد نہیں کرتے  
 اس جنسِ محرمی کو برباط نہیں کرتے

دل مایوس کو گردیدہ گنہگار کر لینا  
 سکون یا اس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو  
 وہ دن اب یاد آتے ہیں بہارِ خوش فانی کے  
 یہ کیا ایذا پہنچی ہے کہ حسرتِ عشقِ فناں میں  
 ان کا ردِ انکار میں آوار کر لینا  
 قیامت ہے غمی کا دعدہ دیدار کر لینا  
 وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گنہگار کر لینا  
 تجھے ہر عقدہ آساں کو بھی دشوار کر لینا

ہنگامہ تفصیل میں لب ہائے نکایت  
 فریادِ کورل کی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچے  
 جب کہ ہوئی کشورِ حرام کی خبر بند  
 گویا بے دعاؤں پہری بابا شر بند

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر  
 گرچہ ہے پردہ انکار میں ہم کل عتاب  
 پڑ ہی جاتی ہے رخسار پہ حسرت کی نظر  
 پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

عاشقِ دل نگار کو بے خود و بے قرار کو  
 محو تھائے یار کو، شوق بقائے کیا نگر

چارہ در دہل ہو کیوں انہی جفا خوں کیل  
 عشق بھی مغضب ہو کیوں مجھ کو ٹھنکے کیا فتن  
 خیرت سے پرست ہو بندہ ہر ایک مست کو  
 پیر منشاں کے دور میں خوف خطائے نیک کیوں

جہنم کی آگ نہ چھپ جائے سر ہاں کہیں  
 آگ آگستا وہ تو اپنا گئے مجھے گرم نظر  
 بلند سے حوصلہ ڈریہ مجھے تھام کہیں  
 ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں نام آہیں

یواکشان غم انتظار ہم بھی ہیں  
 دل ہوس جوشاۃ تری نظر کا سوا  
 خراب گردش سبیل و نہاد ہم بھی ہیں  
 تو رہ ع شوق، پکاریاں شکارِ ہلم بھی ہیں  
 اکر یہ بھی ہے تو امید وار ہم بھی ہیں  
 تو حال دل سے لہا آتش کے ہم بھی ہیں  
 نشانہ ستم روزگار ہم بھی ہیں  
 نشانہ ستم روزگار ہم بھی ہیں

ہیت نادوم ہوئے آخر وہ کیسے قتل لاحق  
 جلائے شوق سے آئینہ تصویر خاطر میں  
 ہوئی قدر و فاجب آتش کا آہستہ آہستہ  
 نمایاں ہو حیدار وئے گمار آہستہ آہستہ  
 محبت کی جو پسلی ہے یہ نکبت باغ عالم  
 ملا کر خاک میں مجھ کو چھکی ہے شرم سے سکون  
 نہ آئیں گے وہ حسرت انتظار شوق ہیں نہیں  
 گزر جائیں گے ایام بہار آہستہ آہستہ

خیال یار جو مصروف کار ہوتا ہے  
 یہ ماجرا بھی ہے دنیائے عاشقی میں نیا  
 قرار بخش دل بے قرار ہوتا ہے  
 کہ نامراد یہاں کا مسگر ہوتا ہے

اس محم تغافل کی جفا میرے لئے ہے  
 مقصود ہے آنا کہ رہے مجھ پہ توجہ  
 صد شکر کہ آنا تو روایہ میرے لئے ہے  
 مخصوص یہ انداز جفا میرے لئے ہے

جنت کی ہوس ہوتو میں کافر کہ پریشان اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لئے ہے

دام گیسو میں ترے اک دل ناشاد بھی ہے اسے مرے بھولنے والے مجھے کچھ یاد بھی ہے  
کیسے کہدوں اسے بیگناہ افقت کہ وہ شوخ ظلم کرتا ہے مگر مانع فریاد بھی ہے  
لطف نظاہر پہ کہیں اس کے نہ جانا حسرت کہ وہ عیار جفا جو ستم ایسا دہلی ہے

تری محفل سے ہم آئے مگر باحال نہ آئے تماشا کا میاب آیا تنہا بے قرار آئی  
یہ کیا اندھیرے آے دشمن اہل فنا تجھ سے ہوس نے کام جاں پایا محبت تیرا آئی

دیکھنا بھی تو اٹھیں دور سے دیکھا کرنا دیکھنا بھی تو اٹھیں دور سے دیکھا کرنا  
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت بجا اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت بجا  
عاشقو حسن جفا کا رکشا شکوہ ہے گنا تم خبردار، خبردار نہ ایسا کرنا  
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت ان سے لی کر بھی نہ اظہار تنہا کرنا

جان پر غم نے بھی الزام لگایا نہ انھیں یاس کو خوبی تقدیر سے منسوب کیا  
سخت محروم ادب ہے دل حسرت اگر بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

نظر پھرنے کی اس پہ دل جین کا چھینا محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا  
وہ کیا قدر جانیں دل عاشقاں کی نہ عالم نہ فاصل نہ دانا نہ بینا  
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں تما کا پوشیدہ ہے اک خرینا  
یہ کیا قہر ہے ہم پر یارب کرے مئے گزر جائے سداں کایوں ہی ہمینا  
بہار آئی سب شادمان ہلی محرم یہ دن کیسے کاش گے بے جام و مینا



پانی ہے جگہ یا کئی دامن نظریں خوشبوئے حیا نے تری چادر نے نکل کر  
کیا چیز تھی ساقی وہ پس پردہ مینا جو سخن پری بن محنتی ساغر سے نکل کر

چاہت ہی چاہت ہی نہیں آگے نزدیک کچھ میری حقیقت ہی نہیں آگے نزدیک  
کچھ قدر تو کرتے مرے اظہار وفا کی شاید یہ محبت ہی نہیں آگے نزدیک  
یوں غیر سے بے باک اشارے سر محفل کیا یہ مری ذلت ہی نہیں آگے نزدیک  
دعشاق پر کچھ حد بھی مقرر ہے ستم کی یا اس کی نہایت ہی نہیں آگے نزدیک  
اگلی سی نہ راتیں ہیں نہ گھٹائیں ہیں باتیں کیا اب میں وہ حسرت ہی نہیں آگے نزدیک

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد لیکن یہ جبکہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم  
اے یاد یار دیکھ کہ باوصفت رنج ہجر سرور ہیں تری خلش ناواں سے ہم  
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حال آرزو آخر نے اس ننگہ بد نگماں سے ہم  
یا یوں بھی تو کرتے نہیں تم زورہ ناز تنگ آ گئے ہیں مشکش استیاں سے ہم  
ہے انتہائے یاس بھی اک البدائے شوق بھر آ گئے دیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

سبے چھتے ہیں چھپیں مجھ سے تو بردانہ کریں سیر گلشن وہ کریں شوق سے تہنا نہ کریں  
اب تو آتا ہے ہی جی میں کہ لے جو جفا کچھ بھی ہو جائے مگر تری عینا نہ کریں  
میں ہوں مجبور تو مجبور تھی پریش ہے ضرور وہ میجا ہیں تو بیمار گو اچھا نہ کریں  
درد دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں آپ اس کام کا زہنہارا را دہ نہ کریں  
شکوہ جو رتقا ضائع کر م عرض وفا تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا کریں  
نور جاں کے لئے کیوں ہو کسی کام کی تلاش ہم تری صورت زیبا کا تماشا نہ کریں  
حال نکل جائے گا بیتابی دلاک حسرت بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

شوق جب حد سے گزر چکا تو ہوتا ہے یہی  
دل وحشی کا کسی طرح تقاضا تو ہے

ور نہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں  
کیا کریں اس کو جو آمادہ سوڈا نہ کریں

سنت رنجور کر دیا ہسم کو  
مجھ سے بگڑے ہیں کہ تو نے یہ کیا  
دل نے مجھ پر کر دیا ہسم کو  
سب میں مشہور کر دیا ہسم کو  
تم نے مغرور کر دیا ہسم کو  
سزا بسر کر دیا ہسم کو

آج بھراؤں نے کیا وعدہ فردا دیکھو  
حالِ دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں

وصل کی بات کا بن بن کے بھڑنا دیکھو  
اب کبھی تم کو خبر کیا تھی نہ لہنا دیکھو

رکھے نہ مجھ پر ترک محبت کی تہمتیں  
بیگانہ ادب کئے دیتی ہے کیا کروں

جس کا خیال تک بھی نہیں ہے رواج  
اس محونا زکی نگہ اشتبا مجھے

دل اور تہیہ ترک خیال یار کرے  
تفس میں ہو دل لیل شہیدِ فرقت گل

خزاں نے جو نہ کیا تھا وہ اب بہار کرے  
ہجومِ شوق سے کہدو کہ اختصار کرے

نہ میں شمار کروں نہ دل شمار کرے  
فروں میں حد سے ترے جو بے حساب کدے

اُن کو جو شغلِ ناز سے فرصت نہ ہوگی  
خاموشیوں کا راز محبت وہ پا گئے

ہم نے یہ کہہ دیا کہ محبت نہ ہو سکی  
گو ہم سے عرض حال کی جرات نہ ہوگی

ہر بات میں اک شان ہے ساختہ پن کی  
تصویر ہے تقریر تری حسن سخن کی

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرين و تن کی لائی ہے چین میں انھیں تقدیر چین کی

شکوہ غم ترے حضور کیا  
در و دل کو تری تنہا نے  
یہ بھی اک چھڑے کہ قدرت نے  
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے  
ہم نے بے شک بڑا قصور کیا  
خوب سرمایہ سرور کیا  
تم کو خود ہیں ہمیں غیور کیا  
دلے حسن کا غرور کیا

سیہ کا رتھے، با صفا ہو گئے ہم  
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا  
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مارا  
دم واپس آئے پرستش کو ناحق  
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم  
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم  
تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم  
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

حسرت کشاں درد ہیں لب تشنگان عاشقی  
منظور دلداری رہا لطف نہان دلیراں  
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ نشان کہ  
سیراب غم کردے کہیں پر مغاں عاشقی  
مقصود رملو اتنی رہی شان میان عاشقی  
باقی ہے اک سوز نہاں اب تک نشان عاشقی

سعی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال  
رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جورات  
اور ہی کچھ ہے تنہا ترے زندانی کی  
کھینچ کھینچ شکل مری سوختہ سامانی کی

دے دے کے مفت جان شہیدانِ عشق نے  
شوقِ نقائے یار نے راہ مراد میں  
اس نازنین کو شاید قاتل بنا دیا  
سختی کو رشکِ نرمی منزل بنا دیا

سبے شوخی ہے اک ہیں سے جیا  
اے فریب نگاہ یار یہ کیسا

اب وہ طے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی  
گلشنِ حسنِ یار کی حسرت  
ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا  
جانِ نثارِ کس قدر ہے آبِ دہوا

آئی جان کی یاد مراد دل ٹھہر گیا  
تیرنگاہِ یار کا مشکل ہے سامنا  
دو عوی غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا  
میرا ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا  
یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا  
حسرت وہ بادشاہ میں شامل ٹھہر گیا  
دل خوش ہوا جو آبِ ہوئے نائل تم  
اچھا ہوا کہ ملکِ حسنِ عشق میں

مہے محو خواب ہوں اہلِ ظاہر  
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی  
گذر بھی گیا کاروانِ محبت  
بیانِ تمنا، زبانِ محبت  
ترا ناز ہے حکمرانِ محبت  
سرمعزِ حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا

چشمِ رنگینِ یار کو ہے پسند  
صاف اقرار ہے محبت کا  
سرخِ اشک عاشقان کی بہار  
آپ کا التفات سے انکار  
کون ہے رہ سکے گا جو ہشیار  
دور میں حسنِ یار کے حسرت

لطف کی ان سے التجا نہ کریں  
مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے  
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں  
اب کو شہِ منہ دعا نہ کریں  
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں  
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں  
مرضیِ یار کے خلافت نہ ہو  
مہرِ مشکل سے آرزو بیکار

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت  
اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نامرادوں کو شاد کام کرو کرم اپنا کبھی تو عمامہ کرو  
 کار عاشق ہے ناتمام سو تم قتل کر کے اُسے تمام کرو  
 عاشق، ہجر سے بہو بے زار غم جاناں کا احرام کرو  
 پوچھے ہیں وہ جان نثاروں کو تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

لاکھ اس شوق جفا کار سے پرہیز کرو شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب بگیز کرو  
 فرق لائے نہ جھگڑائی مہیا میں بھابھ منچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو

بجا ہے دل زار کی ناصبوری کہاں تک اٹھائے کوئی رنج دوری  
 وہ تہید ہی سے اڑا لیں گے مطلب کہیں شوق نے کی نہ ہولات پوری  
 تمنائے کی خوب نظارہ بازی مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

نظر اُس رخ پہ ہے لوب کے خلاف دل ہے اس فیصلے میں سب کے خلاف  
 آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں بے رنجی وعدہ ہے شے کے خلاف  
 حسن جاناں کے عہد میں حسرت شوق ٹھیرا ہے ناوجب کے خلاف

چھپے گی تری دوستداری کہاں تک کرے گا دل انکار یاری کہاں تک  
 کہیں رک بھی اے چشم خونبار آتش کہاں تک تری اشکباری کہاں تک  
 کرے گی فقروں سے اے شاہ غریب تنافل تری شہزادگی کہاں تک  
 ہمیں حال دل عرض کرنے نہ دے گی بھلا ان سے بے اختیار کہاں تک  
 تناکو اس حد پر رہنے نہ دے گی ترے حسن کی بے قراری کہاں تک  
 کرو سیر دنیا کے حیرت بھی حسرت خرد مندی و ہوشیاری کہاں تک

آج قوم لب ساغر سے بھڑائے میرا  
سُن کے انکار مرا ہجر میں کیا کیا حسرت  
ساقیا تجھ کو مری سسنتی یہاں کی قسم  
ساغر مئے نے دلوائی لب جاناں کی قسم

سمجھنے کے اس دریا سے لاکھوں  
اک بار چلے جاؤ دکھا کر تھلک اپنی  
ہم عاشق بے خود ہیں گنہ گار کہاں ہیں  
ہم جلوہٴ بہم کے طلب گار کہاں ہیں  
عشق اُن سے یہ کہتا ہے توجہ نہیں تم کو  
عقدے مئے سب سہل ہیں دشوار کہاں ہیں

عشق اب ہے نہ عاشقی کی ہوس  
غمچہٴ شوق ہے نسرودہٴ یاس  
ہم ہیں اور دل سے بیدلی کی ہوس  
مٹ چکی سب شگفتگی کی ہوس  
عشق ہر خیز رام حسن ربا  
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے  
پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس  
آپ کو ہوجو عصا جی کی ہوس

حسن جاناں سے یہ کہتا ہوا شہرِ عشق  
فکر کو نین سے بیگانہ ہوا تو حسرت  
دور پہنچا ہے مرنے نام سے افسانہ ترا  
غلبِ غمرا غم جاناں سے یارانہ ترا

شوق کہاں آرزوئے شوق ہے  
درجہ ترے عشق فنوں کا رکا  
جس سے جہاں ست مئے ذوق ہے  
حسن کے رتبے سے بھی فوق ہے

وفا تجھ سے اسے بے وفا چاہتا ہوں  
تری آرزو ہے اگر جرم کوئی  
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں  
تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو جو دو عالم کی  
آہ وہ نکمت پر باد کہ پر باد نہیں

بنے وہ رونق محفل جس انجن میں ہے  
 رہے بہار چین ہو کے جس چین میں ہے  
 زبے نصیب جو ہو میرے حال کو قہر نصیب  
 وہ اتری جو زری زلف پر شکں میں نہیں  
 ادب کہے یہ تھا تھا کہ تھے شوق کی بات  
 سنے ز کوئی مے دل میں یاد میں ہے  
 جو فیض عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرت  
 کہ اتنا ز کچھ شیخ و برہن میں رہے

کہ نہ انکے ہر دم حال ہے کب تھا خوشی کب تھا  
 جو کبھی اٹھا بھی اٹھا ہے تو اسی انکے گنا  
 اثر فانیل یار سے شربت تار اجر میں فقہاً  
 ہو میں سوز غم کی یہ شربتیں کہ انکے ہر دم  
 پر عجیب و گریہ کے کئے حسن کا اجرا  
 کہ اثر سے قوت عشق کے میں گرا تھا چرخ اٹھا  
 میں ہر نہ بادہ رستہ ہوں کہ ہوا جو یکے میں گزر  
 بے خیر مقدم ہرے میں تو نہ ہرے میں گنا  
 کوئی عشق بازی کا شغل نہیں محفل سے ملتا  
 گرا ب کیا ہے یہ حوصلہ تو خوشی سے ناز تھا  
 یہ نہر کہاں ہے جزا ہوئی جتنا خواہش ملتی  
 پئے قتل حسرت طبعی خود آروہ جان اٹھا

تو ہی یاد بے اختیار آ رہی ہے

تنا کی فصل بہار آ رہی ہے

اس نے ہم سے سنی نہ شوق کی بات

ہنس کے پوچھا یہ کس زبان میں ہے

حسن تیرا بہ امتزاج و ف

اک نمونہ تھا بے مثالی کا  
 ب حسرت کی بے سوا کی کا

بے تاب نظر آیا بدنام نظر آیا  
 لے آہ دل عاشق دیکھیں تری تاثیر میں

عاشق جو نظر آیا ناما کام نظر آیا  
 پہلے سے بھی وہ بڑھ کر خود کام نظر آیا

سکھا دی ہیں نرالی شرفیاں کچھ لطف جاننے

مے دست تنا کی شرارت بڑھی جاتی ہے

بکال یارین ہر دم ترقی ہوتی ہے دل چیراں کی جس سے سحریت بڑھتی جا رہی ہے

پھینک دیتا ہوں دستِ ثقیل نے مجھے غلام نہیں  
 گویا کہ اپنے دل پر مجھے اختیار ہے  
 شاہ جہاں سے منتر کا دیرا چلا گیا  
 اے ہاں جہی تو چشمِ جنوں اٹھ گیا ہے

کرتا ہے دل کو اور بھی آمادہ ہوس  
 تیرا بے جی یہ اذا اجتناب کی  
 کچھ الٹا کہ قدرِ شوق نہیں دور نہ آرزو  
 امید وار تھی کرم بے سبب کی

قیمت مئے کہ بہ پیانہ جاں ہے ساقی  
 کون کہتا ہے کہ یہ بیخ گراں ہے ساقی  
 تو نے رکھ دی تھی جہاں چھینچہ ہم کو قتل  
 روح مستی اسی جانب گراں ہے ساقی  
 عجب کی نہ سنی ہے : سے گھاڑا ریتا  
 کہ وہ سے غوار تر افریقہ داں ہے ساقی

حسرت وہ سن رہے ہیں جوان و فاقہ کا حال  
 اس میں ابھی کچھ فریب تری داستان کے ہیں

شوق کو جرم سے بری نہ کیا  
 تم نے کچھ پاس دلبری نہ کیا  
 خام تھی اپنی بندگی کہ انہیں  
 اہل بندہ پروری نہ کیا  
 زہد کو روم کو کہ حق نے اسے  
 سرخ از قلمندری نہ کیا  
 عشقِ صادق نے حسنِ کمال سے  
 نہ سنا ذکرِ برتری نہ کیا  
 شکوہِ بیخ اُن سے کیوں اُسے حسرت  
 احترامِ ستم گری نہ کیا



## جگر مراد آبادی

ہم آنکھوں پر پونے غنیمت آج ہی گھبرا  
اے یہ حسن قصور کا قریب و غیب کیو  
یاق ہی دے دی جگر نے کج پائے یار پر  
دل آنکھوں میں صحرے کے ڈپا ان کو مایہ آج ہی گھبرا  
میا یہ گھبرا، جیسے وہ جان بھائی کی گھبرا  
عمر بھری بے قراری کو قرار آج ہی گھبرا

عشق  
لیا اسی کو کہتے ہیں ربط و قید من و  
زنگ و لوگے پروے میں کون بھونٹ نکلا  
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں ہی  
تو جگر جو رسوا ہے قریبی آہ رسوا رہ  
عشق نارسا اپنا ناز کا سیاب ان کا  
چھپ کا چھپائے سے کیا کہیں شایان کا  
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہ نقاب ان کا  
نام تو ذکر رسوا خانوں خواب ان کا

ہجوم تجسلی سے معسور ہو کر  
مجھی میں رہے، مجھ سے مستور ہو کر  
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں  
نظر رہ محلی شعاع طور ہو کر  
بہت پاس نکلتے بہت دور ہو کر  
کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں  
اس کے بھی شوخ تیراں اس شوخ کی ادائیں  
اں حسن برق و اش کے دل بوخت وہی ہیں  
عاشق، غراب سستی، ازاں غراب، لیکس  
اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی!  
آلودہ خاک ہی میں اپنے دے اگے ناصح  
اشعار بن کے نکلیں جو سینہ بھر سے  
آئے غم محبت تجھ کو گلے لگانا نہیں  
کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں  
شعلوں سے بھی جو جھیلیں، امن کو بھی کاش  
وہ بھی ترے کرشمے، بھی تری ادائیں  
اب بہت شوق کہنے، مایا بال، لڑکھائی  
داسن مگر جھنگ دون جلوے کہاں ہیں  
سب، حسن یار کی عین بسا خندہ ادائیں

کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں بس، اک دل کی خاطر تیاریاں ہیں  
 نہ بے ہوشیاں اب نہ کشیاں ہیں محبت کی، چھٹا فصل سکاریاں ہیں  
 تجلی سے کہہ دو، ذرا ہاتھ روکے بہت عام اب دل کی بیماریاں ہیں

نیاز و ناز کے چھڑے نہاے جاتے ہیں، سو آن میں اور وہ ہم میں ملے جاتے ہیں  
 یہ ناز میں تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر نظر اٹاتے ہیں، سکر آئے جاتے ہیں  
 میں اپنی بات کے صدمے کہ میری آہ میں بھی تری نگاہ تے انداز پائے جاتے ہیں

ملتی ہے عمر اب عشق کے مے خانے میں، اے اجل تو بھی سما جا مے پیانے میں  
 ہم کہیں آتے ہیں، اجنا ترے بہکانے میں اسی میخانے کی مٹی اسی مے خانے میں

ا کہ تجھ بن اس طرح لے دوست گھبراتا ہوں جیسے بریل میں کسی نشتے کی کپی یا مہل میں  
 میری ہستی شوق پیہم میری فطرت اضطراب کوئی منزل ہو نگر گذرا جلاتا ہوں میں  
 میری خاطر اب وہ تکلیف تجلی کیوں کریں اپنی گرد شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں  
 دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں  
 ایک دل ہے اور طوفان حوادث، اے جگر ایک شیشہ ہے کہ ہر تھیرے ٹکراتا ہوں میں

الہی ایک دعا ہے، اگر قبول نہ ہو بہت غریب یہ دل ہے کبھی طول نہ ہو  
 تجھے بھی شاق نہ ہو شوق بھی طول نہ ہو نظر قبول ہوئی ہے، اثر قبول نہ ہو  
 کوئی گناہ نہیں شوق دید و ذوق نظر مگر جو فرصت نظارگی کو طول نہ ہو

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے  
 کبھی آکے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے

تری چشم مست کو کیا کہوں، کہ نظر نظر بے فوں فوں  
 یہ تمام جوشش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردشِ عالم سے  
 یہ کتابِ دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا، جو ہیں نسبتیں  
 مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقش ہائے خرام سے  
 وہیں چشمِ حور، پھٹک اگئی، ابھی پانی نہ تھی کہ بہک گئی  
 وہیں کبھی یک بہ یک جو پھلک گئی، کسی رندِ مست کے جام سے

ہلاکے آنکھ نہ محروم تازہ رہنے دے  
 میں اپنی جان تو قربان کر چکاں تجھ پر  
 غلے سے تیغ ادا کو جدا نہ کر قاتل  
 یہ تیرا زہن تو شوق سے جلانے جا  
 بجھانہ آتشِ پہاں کرم کے پھینٹوں سے  
 تجھے قسم جو مجھے پاکِ باز رہنے دے  
 یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے  
 ابھی یہ منظرِ راز و نیاز رہنے دے  
 خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے  
 دل جگر کو مجسم نگہاں رہنے دے

مجھے ہلاک فریبِ مجاز رہنے دے  
 میں رازِ عشق کو بیگ نہ پہاں رکھوں  
 یہ بات کیا، کہ حقیقتِ وی مجاز وہی  
 یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا، اے زاہد  
 گذرتی ہے جو دلِ محسن پر نہ پوچھ جگر  
 نہ چھپرہ اونچا امتیاز رہنے دے  
 مگر جو مصلحتِ حسنِ ماز رہنے دے  
 مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے  
 یہ منکدہ ہے، یہاں احتراز رہنے دے  
 یہ خاص رازِ محبت ہے راز رہنے دے

حال بھی، ماورائے حال بھی ہے  
 دل کے ہر اضطرابِ نازک میں  
 چھائے جاتے ہیں دردِ دل بن کر  
 خشن کے ہر جمال میں پہناں  
 عشق، ممکن بھی ہے، محال بھی ہے  
 شانِ بے تاباںِ جمال بھی ہے  
 اس پر تاکیدِ ضبطِ حال بھی ہے  
 میری رعنائیِ خیمال بھی ہے

تصور رکھتے ہیں کہ حسن شعور نہ کسی  
جاگ تباہی کے غل کو حاجت نہیں ملوگی

کسے سے مقابل جس کو جو زخم نکلیں  
میں شکستگی ہی اس کے شکستگی سے

عکس بھی ہو تو عرض مٹا نہ سکے  
کیا کہنے ، پھر تیری تمنا نہ کہے

دلانی خیال کو دروازہ نہ دیکھے  
ہر جگہ ہے جال خود کا عورت نکاد

دہن کو کسی بھی جو لینے نظر کو کیا کرتے  
کبھی ادھی نہ ہوتی ، اگر فضا کرتے

یہ کیا مجال کہ ہم ترک التجا کرتے  
نماز عشق یہاں ہے نفس نفس جاری

کچھ اوجھ سے بھی تقاضائے نظر ہوتا  
تو وہ تالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے

میں گنگو گار جنوں میں نے یہ مانا ، لیکن  
کون دیکھے اسے میرا بے جنتا نے دل

کہ جیسے اسباب نازک سے کچھ ارشاد ہوتا  
ساتا جا رہا ہے جس کو عقبنایا ہوتا ہے

تصور میں ہے کچھ ایسا اتری تصویر کا عالم  
کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی

ذوبے ہیں ہم جہاں پر ابھریں گے پھر ہیں سے  
ظاہر تو ہر جگہ ہے ثابت نہیں نہیں سے

یہ راز من رہے ہیں ملک لوح و قش سے  
خون و قاتل کیل جرم نگاہ قاتل

مانا کہ چشم شوق بہت بے حجاب ہے  
دل ماننا نہیں کہ نظر کا میاں ہے

لے حسن اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ  
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج

سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جوشنگ میں ہے  
اوس اس پر یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہیں ہے  
جس رنگ میں دیکھ اُسے وہ پردہ شبنم ہے

جہ سے کوئی پوچھے ترے لئے کون سا دوسرا  
نہ دیکھتا تو کیا پتہ ہے کہ ممکن ہو نہیں سکتا  
برہمنہ یا سب سے نئی آن، نئی آستارا  
یہ کہہ کر شوقی بھی لکھا، سخی تیسرا

یہ کیا کیا کہ عطر کے عشق، راجہ دو  
جمال حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر  
نہر اردل کو ساگر دیا مجھے اک درد  
نور شاہہ درد محبت ازہے بد دل کہ جسے  
تجھے حریفیت ستاؤں رہتا تو نے  
نفس نفس کو سب جگہ لگا دیا تو نے  
اُس ایک درد و پھر زلزلہ غاوت سے  
ذرا سکون ہوا، لگتا تھا، یا تو نے

وہ کافر آشنا نا آشنا یوں بھی ہے اور یوں بھی  
انارکلی، ایتنا، ایتنا، یوں ہی ہے اور یوں بھی  
بغیب کیا ہوا اگر رسم و عادیوں بھی ہے اور یوں بھی  
کہ حسن و عشق کا ہر مسئلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی  
لگا دے آگ اور برقی بجلی، ادا دیکھتی کیسا ہے  
نگاہ شوق، نظام، نارسایوں بھی ہے اور یوں بھی  
ابھی کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کر یوں  
کہ نشائے نگاہ عشوہ زایوں بھی ہے اور یوں بھی

ترے جمال حقیقت کی تاب نہ ہوئی  
ہم اپنی رندی طاعت پر خاک ناز گیا  
تا کہ حرف و حکایت، تمام دید و دل  
صبا! یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا  
ہزار بار رنگ کی مگر کبھی نہ ہوئی  
قبول حضرت سلطان ہوئی ہوئی نہ ہوئی  
اس اہتمام یہ بھی شمع شعلہ نہ ہوئی  
گئے ہو جب آئے یہاں صبح و شام شمع ہوئی

آئے دباں پہ راز محبت حال ہے  
تم سے مجھے عزیز، تمہارا خیال ہے

۴۲۴  
دل تھا دے خیال سے پہلے چین چین اب بھی روش روش ہے مگر پامال ہے

ایمان و کفر اور نہ دنیا و دین رہے اس عشق کی تلافی مافاست دیکھنا  
اس عشق پر چشم یار کی معجز بیانیال  
اے عشق! شاد باش کہ تہا میں ہے ہر اک کو ہے گماں کہ غیاب میں ہے  
روئے کی حسرتیں ہیں جب کہ سنو نہیں ہے

عشق کمار از جنوں عشق کی جد ہی میں ہے  
داستان غم ہستی کو مکمل کرتے  
دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے  
ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے  
حسن سرگرم نوازش ہے مگر غم دل  
رائگال عشق کا احسان نہ جانے پائے

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے  
ہم عشق تجسم ہیں لب تشہ و مستقی  
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جا رہا ہے  
دریا سے طلب کیسی؟ دریا کو رلاتا ہے  
بندہ جائے سو موقی ہے وقتائے تو دنا ہے  
آنسو تو بہت لے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن

اداجو آئے، وہ بے عیب بے قصور آئے  
الہی، جذب محبت کی بخش ہے تقصیر  
خدا وہ دن زکریا آپ کو غور آئے  
وہ آج دست بہ دل سخت تا صبر آئے  
کہیں جو راہ طلب میں مقام طور آئے  
مری طرف سے بھی لے کاہان شوق سلام

کریے نہ کام جو لبس کا نالہ خوئیں  
نہ غنچے فیندے سے چوکیں نہ رنگ و بو آئے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر  
اُن کے پہلائے بھی نہ پہلا دل  
لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی  
رائگال سہی التفات گئی

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن <sup>۳۲۵</sup> ایک میحانفس کو بات گئی

نقابہ روتے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا  
محبت کیا ہے؟ تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں  
مبارک اپنے ہاتھوں حسن کو مجبور ہو جانا  
ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

بہار لالہ و گل، شوقی برق و شر ہو کر  
بھیرم کھلونا کہیں ہے دل! نہ عشق مبتہ ہو کر  
وہ آئے سامنے، نیکن تجا بات نظر ہو کر  
گزر جا، ہاں گزر جا جس سے بھی بے خبر ہو کر  
جایا اندر حجاب جلوہ انداز ہو گیا کہنے  
کہاں جاتی ہے دل کو نگاہ ناز بے پروا  
مرے پہلو میں رہ جا لذت درد جگر ہو کر

دل کو کسی کا تالے فرماں بنائے  
درماں کو درد، درد کو درماں بنائے  
دشواری حیات کو آسان بنائے  
جس طمع چاہیے، مجھے حیر بنائے  
آباد اگر نہ دل ہو، تو برباد کیجیے  
گلشن نہ بن سکے، تو بیا بان بنائے

پھر عشق جنوں پیشہ، یوں سلسلہ جنیاں ہے  
مدحتی ترے ہونٹوں سے رنگینی و رعنائی  
راہیں بھی گر زراں ہیں، منزل بھی گر زراں ہے  
اک موج تبسم میں کل راز گلستاں ہے  
اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے  
لے کفر! ترے دم تک آرائش ایمان ہے

ہر درے سے پیکر میں اک لوح وفا دانی  
ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے  
اپنی ہی سی گل دنیا عاشق نے بنا دالی  
زنہین نگاہوں نے رنگین بنا دالی

نظر صیاد کی کیا؟ برق بھی ہو تو لرز اٹھے  
تماشا دیدنی ہے دیکھ لیں اہل نظر اگر  
ابھی آیا نہیں تنکوں کو جان آسان ہونا  
مرے ہمراہ منزل کا بھی گرد کاوان ہونا

سنا ہے ہر طرف لٹے ہیں جلوہ حسن صدف کے  
کبھی تم بھی جگمگاؤ اور نہ کوئے بتاں ہوں

چھوڑنا نہ راز کوئی بہان خراب کا  
رب کہہ گیا میں خواب میں نہا یہ خواب کا  
بگڑا ہو بہت رنگ جہاں نراب کا  
بھڑوں نغمہ میں حسن کسی کے نہا یہ خواب کا

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشرِ رز آغوشِ خیال  
سن کیا ہے خواب ہے اک چشمِ شاشی کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کا رفرما کا  
وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

زنجبیلی الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر  
آساں نہیں گزرتا صحرائے بے خودی  
اے دل! وہی تو جلوے سرائے نظر ہیں  
ہشیار اہل تمکین: رستے پر خطر پیرا

سمجھائے کون؟ بلبل غفلت شعار کو  
عصیاں کی بھی نہ ہوئی تخیلِ محمہ سے کہ  
مہر کا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر اک کت  
مہر و کر دیا ہے چین تک بہار کو  
کیا نہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو  
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

سیکھو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قید سکاں  
غیر از دوست نہ تھا ہستی عاشق کا وجود  
آج اک موج جہاں لے گئی نے خلع کو  
کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

گوشِ شقائق کی کیا بات ہے اللہ اللہ  
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی سا رہے

ان کی نگاہِ لطیف سے اور کشفِ از دلبری  
میری نگاہِ شوق ہے اور داتا عاشقی



اے جہاں بہر گریں پیدا کیا : اے گریں : تم جان جان : حسن : بہار : چرخ : انجلی : شبنم

ریہ شوق ہی تو تیرا کج : ہے : گریں : تیرا : کیا : ہے : دھو : دھو : گئی : بہار : میں : سدا : گئی : لباس : حسن :

ایسا کہاں بہار میں رنگیں نول : کا : جوش : شاعر : کس : کس : خون : تنہا : صبر : در : تھکا :

جوش : رنگین : تیرا : کا : ان : کے : پیکار : میں : نہیں : کیا : کوئی : قندہ : اپنا : اب : دگ : ہل : میں : نہیں : جو : بہار : اب : تجھ : میں : ہے : سدا : گئے : گلستاں : میں : نہیں :

علاج : کا : دوش : تم : خاک : چاہ : جو : کرتے : ہزار : زخم : تھے : کس : کس : جگہ : دفو : کرتے : بیان : ہو : سکی : ابتدا : نسبت : کی : تمام : عمر : ہو : گئی : شرح : آرزو : کرتے :

## صفر گوندوی

ہزار جامہ : در : صد ہزار : جلیہ : گری : تمام : شورش : و : تکیں : نثار : بے : خبری : جو : مجھ : پہ : گزری : ہے : شب : خبر : وہ : دیکھ : لے : ہم : غلب : ہوا : کہ : گریاں : ہے : چاکلے : نے : کو : اُس : آستان : سے : اٹھائی : نہ : پھر : جس : میں : حرم : میں : سجدہ : پیہم : تھی : ایک : درد : سری :

اللہ : سے : دیو : انگی : شوق : کا : عالم : اک : رقص : میں : ہر ذرہ : صحرانظر : آیا : تعالط : جنوں : دیدہ : خوننا : بہشتاں : کا : بھولاں : سے : پھر : اداس : صحرانظر : آیا :

خوب : تھا : صحرانظر : لے : توف : جنوں : پھاڑنے : کون : تھے : دامن : کہاں :

شوق سے ہے ہر رگ جاں جست میں لے اڑے گی بٹے پیرا بن کہاں

عشق ہی سہی مری عشق ہی حاصل میرا  
اور آجائے نہ زندانی دشت کوئی  
ہی منزل ہے یہی جاوے منزل میرا  
اس میں کچھ نہ تو تنہا بھی ہے شامل میرا

مستی میں فروغ رخ جانان نہیں دیکھا  
زاہد نے مرا حاصل ایسا نہیں دیکھا  
سنتے ہیں بہار آئی گلستان نہیں دیکھا  
رخ پر تیری زلفوں کو ریشاں نہیں دیکھا  
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا زبر آشوب  
روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں  
کچھ ہوش جو آیا لوگ ریاں نہیں دیکھا  
کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم

رخ رنگین یہ موجیں ہیں جسم ہائے پہناکی  
حقیقت کھول دیا میں جنوں کے راز پہناکی  
شعاعیں کیا دین رنگت بھرائی گلستاں کی  
قسم دے دی ہے لیکن قسم نے چاک گریباں کی

پیش جو شوق میں تھی وصل میں بھی ہے وہی مجھ کو  
چمن میں بھی وہی اک آگ ہے جو تھی نشیمن میں  
مری دشت پر بحث ادا کیاں اچھی نہیں ناصح !  
بہت سے باندہ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

عشوؤں کی ہے نہ اس نگہ فتنہ زاکہی ہے  
ستا نہ کر رہا ہوں وہ عاشقی کو طے  
ساری خطا مرے دل غور رش ادا کی ہے  
کچھ ابتدا کی ہے نہ خیر انتہا کی ہے  
جہنم رگ بہار میں موج فنا کی ہے  
کھلتے ہی پھول بارغ میں پژمردہ ہو چلے

ہم خستگان راہ کو راحت کہاں نصیب  
آواز کاں میں آئیں بانگِ دلا کی ہے  
ڈویا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو  
اب تو یہی زبانِ مرثیہ کا کی ہے  
لطفِ بہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز  
زحمت چڑھی ہوئی ستم بر ملا کی ہے

جلوہ زکین اُتر آیا نگاہِ شوق میں  
ہم لطافتِ جسم کی اسے سہم تو نہ بچا کئے  
بیل و گل میں جو گزری ہم کو اس کے کیا غرض  
ہم کو گلشن میں فسطا رنگ جس نہ بچا کئے  
دوڑتے پھرتے تھے جلوہ ان کے بوجِ نور  
دور سے ہم راہِ شمعِ انجمن نہ بچا کئے

ہر اک جگہ سی برقِ نگاہِ دوڑ گئی  
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو  
یہ دیکھنا ہوں ترے زیرِ لبِ تبسم کو  
کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو  
ذرا سے پردہ عمل کی کیا حقیقت تھکی  
خبا رقیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو

مستی سے ترا جلوہ خودِ معرضِ تماشا ہے  
آشفۃِ مزاجوں کا یہ کیفِ نغمہ دیکھا  
ماں وادیٰ ایمان کے معلوم ہیں سب قصے  
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

سوارِ جلا ہے تو یہ سوارِ بنا ہے  
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی ملا ہے  
سنا ہوں بڑے غور سے افسانہِ ہستی  
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادب ہے

یہ بھی فریب ہے کچھ دردِ عاشقی کے  
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کو لیا ہے جی کے

ترے جلوؤں کے آگے بہت شرح و بیان کھی  
زبان بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زبان کھی  
مٹی جاتی تھی بیلِ جلوہ گھلائے زنجیں پر  
چھپا کر گس نے ان بردوں میں برقِ آبی کھی  
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا نے واعظِ ادب  
ہزاروں بن گئے کیسے جیس میں نے جہاں کھی

نفس کی یاد میں یہ اضطراب دل سدا قائم کہ میں نے تم کو کیا کیا شایخ آشیاں بچھا

موج نسیم صبح کے تریان بابائے  
کیا مستقیماً اٹھیں میں آپ جوش بہار سے  
آں پہ لولہ رنق سنبھلے ہوئے  
بر شایخ غل جے لاق میں سناغر کے ہوئے  
رنگ رنگ میں روڑی پھرتی ہے کشتہ نشانی

نہ نیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بستے  
برقوع کے کرتے تھے سر راہ گذر  
جان نہ بھانپ لسی کر سحر ہمتا نہ پہننے  
دورے بدعاک ستائے وہ صنف ضایت  
چارے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے  
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی نیخانہ بنے

گم کر دیا ہے دیدے یوں سرسبز جگہ  
ہیلا کہ جنگل کا جسے راز ہو مسیور  
مٹی ہے اب انھیں کے کچھ اپنی خبر مجھے  
ان عزم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے  
مست شباب وہ ہیں میں بر شایخ عشق ہوں  
نیری خبر انہیں ہے نہ انکی خبر مجھے  
جب اصل اس بیاڑ و حقیقت کی ایک ہے  
پھر کیوں پھر رہے ہیں ادھر کے ادھر مجھے

شرک شوق کا وہ ایک قطرہ ناچیز  
بہت لطیف اشائے تجھے چشم ساقی کے  
ایچانا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا  
نہ میں ہوا کبھی نہ خود نہ ہوشیار ہوا  
لئے پھری کچھ شوق سائے عالم میں  
شدید جیلوہ حسن آج بے قرار ہوا  
مری نگاہوں نے جبک جھک کر لئے بچھے  
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یا ہوا

ذوق سہستی کو محرومے جانان کر دیا  
کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطراب عشق میں  
کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایمان کر دیا  
امن کے دامن کو ستر دینا گریباں کر دیا

شورشِ دلِ جہوہ ہوتی تھی بدستور آج  
فصلِ گلِ جوشِ ہوا طغلت زینِ بہار  
ہنسی معلومِ بیانِ دار و درں ہے کہ نہیں  
جس سے کلِ جہوہ دلِ تیار ہے چنانچہ آج  
ہنسی معلومِ حدِ نزو یکا ہے یا دور کی آج  
عرضِ دیدار پر یکا چو کہ مستور ہے آج  
خون میں گرخی ہنگامِ غمِ غم ہے آج  
اسی شعلہ کو جو دیکھا تو سرور ہے آج

آنکھوں میں تیری زہم تماشا لئے ہوئے  
پاسِ ادب میں جوشِ تنہا لئے ہوئے  
ہے آرزو کہ آئے حیات ہزار بار  
تو برقِ حسن اور بجلی سے یہ مگر نہ  
افتادگانِ عشق نے سراب تو رکھ دیا  
جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار  
جنت میں بھی ہوں جنتِ دنیا لئے ہوئے  
میں بھی ہوں اک حبابِ مریخِ پائے ہوئے  
فقتہ طرازیِ قدرِ عسائے ہوئے  
میں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے  
اٹھیں گے بھی تو نقشِ کت پائے ہوئے  
روتے ہیں منہ پر دامنِ صحرائے ہوئے

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں  
کیا کرے زاہدِ بیچارا اسے کیا معلوم  
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی  
رحم کرتا ہے بر اندازہ عصیاں کوئی

پردہ حرام میں آخر کون ہے اچکھوا  
حسرتِ ناکام میری کام سے فاعل نہیں  
میں تو ان مجوہوں میں بھی سراپا دیدار  
میری محرومی کے اندر سے یہ کیسی ہے صدا  
اے خوشِ در سے کہ نزدیکی بھی یاد دہی ہے  
اک طریقِ جستجو یہ دردِ ہجوری بھی ہے  
اس کے جلوے کی آواکِ شانِ ستوری بھی ہے  
قرب کی راہوں میں میری آہِ اکِ دوری بھی ہے

لڑت سجدہ ہائے شوقِ دہو چھ  
دیکھ رہنا ئی حقیقتِ کمر  
ہائے وہ اتصالِ ناز و نیا د  
عشق نے بھر دیا ہے رنگِ حجاز

آہوں نے میری خرم ہستی جلادیا  
نیزنگی جمال کے قربان جانیئے  
کیا منہ دکھاؤں گا تری برق نظر کو میں  
حیراں ہوں کچھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں

پیرے مذاق شوق کا اس میں مہرائے رنگ  
اس جو بجا حسن سے سیراب ہے فضا  
میں خود کو دکھتا ہوں کہ تقہیر یار کو  
رو کو نہ اپنی نغمہ شمس ستار کو  
یہ اور نے اڑی مرے مشت فبار کو  
تھی بونے دوست موج نسیم سحر کے ساتھ

نہ کچھ فنا کی خبر ہے دے بقا معلوم  
ہجوم شوق میں کیا کہوں میں کیا کہوں  
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم  
مجھے تو خود بھی نہیں ایسا مدعا معلوم  
وگر نہ عشوہ طرازی نقش پا معلوم  
جسین شوق کی شوریدگی کو کیا کہیئے

ہم ایک بار جلوہ جانا نہ دیکھتے  
گر نہ اوہ جھوم جھوم کے زندان مست کا  
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے  
پھر پائے ہم یہ سجدہ اشکرانہ دیکھتے  
تم بھاڑ کر قوسینہ پروانہ دیکھتے  
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے نص میں

شاید کہ پیام آیا پھر وادی سنا سے  
اسرار حقیقت کو اک اک سے پوچھا ہے  
شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوٹینا سے  
ہر تہہ رنگیں سے ہر شاہد زیبا سے  
لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تنہا سے  
سوحن کروں پیدا ایک ایک آفتابا سے  
وہ عشق کی غلطی سے شاید نہیں واقف ہیں  
وہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق نسیم بھی

دہریں سے عشق نے بھی شوریں اڑائی ہیں  
کنشش نہ جام نگارین کی پوچھ لے باقی  
جہاں سے تونے لئے خندہ ہائے زیر لبی  
جھلک رہا ہے مرا آب رنگ تشہ لہری

بدلت ہوئی کہ چشمِ تحمیر کو ہے ملکوت  
سارا حصولِ عشق کی آنا کامیوں میں ہے  
اب جنہیں نظر میں کوئی داستان نہیں  
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں  
لیکن ہنوز ختم میری داستان نہیں  
فطرتِ سارہی ہے اندلی سے اسی طرح  
مجھ کو دماغِ صمیمت رو جانیاں نہیں  
اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیفیت ہے

برکھا فیضِ بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی  
طاقت کہاں شاہدہ بے حجاب کی  
فروں میں روحِ دورِ محی آفتاب کی  
مجھ کو تو پھونک دیگی تجلیِ نقاب کی  
مستوں نے اور راہِ نکالی تو اب کی  
قصی ہر عمل میں دعویٰ ہستی کی معصیت

یہ عشق نے دیکھا ہے یا عقل سے پہنا ہے  
ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زبانی  
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں سیلاب ہے  
جو خون اچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے  
حس نے مجھے دیکھا ہے وہ دیدِ حیران ہے  
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے  
آسمانِ تراداسن ہاتھوں میں مرے آیا

نیزنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے  
لے پردہ شیشِ ضد ہے کیا چشمِ متکا کو  
آنکھوں سے اگر دیکھو پروا نظر آتا ہے  
تو دفترِ گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے  
پھر داغِ کوئی دل میں تازا نظر آتا ہے

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے  
اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف  
جنت ہے ایک خونِ تما نہیں جسے  
ایسا حجابِ چشمِ تماشا کہیں جسے  
برقِ فضا کے والدی سینا کہیں جسے  
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے  
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے  
میری نقانِ درد پہ اس سدا و ناز کو

مستبیدوں میں شیشے کے گاہک میں اتنا اچھا لیں کہ تریا کہیں جسے  
اصغر نہ کہم نا کسی حکمت تاب پر راز حیات سا غر و مینا کہیں جسے

خستگی نے کر دیا اسکو رگ جان سے قریب جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے

فریب دام کہ رنگ و بو مینا ذالشر یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے  
حقیقت ایک ہے صد ہا لباس عین میں نظر بھی لپا بیٹے کچھ حسن نہ گذر کے لئے  
بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہوا تر کے لئے  
بنوں کے سن میں ابھی شان ہے خانی کی ہزار عذر ہیں اک لذت نظر کے لئے

پھیرتی ہر کس رنگ و بون سے نگاہ شرف کو خود بہت باکیف تیری جلوہ گاہ ناز ہے

## اقبال

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش عقل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام بھی  
بے خطر کو دیر امتش نرود میں عشق عقل ہے عورتا شائے لب بام بھی  
عذر پر ہنریہ کہتا ہے بگڑ کر ساتی ہے ترے دل میں ہی کاوش انجام بھی  
خبر قبائل کی لائی ہے گلستاں سے نسیم تو گرفتار پھر کتا ہے تہ دام ابھی

پردہ چہرے سے اٹھا انجن آرائی کر چشم مہر و نہ و انجم کو تماشا ئی کر  
توجہ بھی ہے تو یہ چشمک نہاں کیسی بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر  
نفس گرم کی تاثیر ہے انعام حیات تیرے سینے میں اگر ہے تو میحالی کر  
اس گلستان میں انہیں صدمے گزرتا اچھا ناز بھی کر تو بہ انداز رعنائی کر



دل ہی جائے گی کبھی منزل میں اقبال کوئی دن اوسا بھی باد یہ چٹائی کر

رہ دام بھی غزل آستانا رہے طائرانِ جن تو کیا  
جو فقاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ پایا  
ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دل تا صبور نہ کر سکے  
وہی گر یہ سحر سی رہا وہی آہ نیم شبی رہی

نہ آتے ہیں اس میں تکرار کیا تھی  
تہا رہے پیامی نے سب داز کھولا  
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تارا  
تاہل تو تھا ان کو آتے میں قاصد  
کھینچے خود بخود جانب طور موسیٰ  
ہائیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا  
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی  
خطا اس میں بندگی مر کا کیا تھی  
تری آنکھ مستی میں ہمشیر کیا تھی  
نگرہ بتا ملز انکار کیسے تھی  
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی  
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

لاؤں وہ تینکے کہیں آشیانے کے لئے  
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے لئے  
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لئے  
آہی نکلتے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

علاج درد میں بھی درد کی لذت پڑتا ہوں  
نہ پوچھو مجھ سے لذتِ خاناں برباد رہنے کی  
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل کے  
جو تھے چھاؤں میں کائناتِ نوکِ سبز سے نکلتے ہیں  
نیشہ سیکڑوں میں نے بنا کر بھونک اے پس  
ٹھہر جائے شدر ہم بھی تو آخر ٹھٹھنے والے ہیں

وہ میکش ہوں فروغِ مئے سے خود گلزارِ بہن جاں  
چمن زارِ حبت میں خموشی موت ہے قبل  
ہو اے گلِ فراقِ ساقیِ ناہرِ بانِ میکش  
یہاں کی زندگی پابندی رسمِ فغانِ میکش

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں  
ستم جو کہ ہو و مدد بے حساسی کوئی بات، صبر آرزو چاہتا ہوں  
کوئی آدم کا جہاں ہوں لہ اہل محفل چراغ سو ہوں بجایا چاہتا ہوں  
بھری بزم میں راز کی بات کہدی بڑا بے ادب ہوں سننا چاہتا ہوں

مری نگاہ میں وہ رندی نہیں ساقی جو ہوشیاری و رندی میں امتیاز کرے  
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا نکتہ ہے جو بے عمل پر بھی رستہ سے نیا کرے

واعظ کمال ترک سے متی ہیاں مراد دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقی بھی چھوڑ دے  
واعظ ثبوت لائے جوئے کے جوازیں اقبال کو یہ ضد ہے کہ پس بھی چھوڑ دے

میرے مشہر میں سبیل کے جوہر لیکن رستاں تیرا ہے فناک  
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سینے میں نقد ہر کے چاک  
کامل وہی ہے رندی کے فن میں مستی ہے جس کی بے منت ناک

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک لار تھا سیعہ کائنات میں

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد سرکار کرب و غم شکار کر  
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر  
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں کار جہاں راز ہے اب مرا انتظار کر  
روز حساب جب مابیشل ہو ذکر عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

گدائے میکہ کی شان بے نیازی دیکھ پہنچ کے چشمہ حیاں پر توڑتا ہے سب

میں فو نیاز ہوں مجھ سے حجابِ اولیٰ کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نکاح دے نکاح

لہوئی سمجھ کے شان کر بھی نے چٹن لئے قطرے جوتے مرے عرقِ انفکال کے

## فراق گورکھپوری

جو بھولتی بھی نہیں یا د بھی نہیں آتیں تری نگائے کیوں وہ بہ نیاں نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تنہا بھی نہیں  
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ نہیں  
چہر بانی کو محبت نہیں کہتے لے دوست  
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں پہلے سے  
لیکن اس ترکِ محبت کا بیڑا سا بھی نہیں  
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں  
ہائے اب مجھ سے کچھ رنجش بجا بھی نہیں  
اور دل بھر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

وہ ماجرا لے عشق بھی خواب و خیال ہے  
مگر بھی اٹھیں ملا درود یار بھی مگر  
تیری نگاہ سے جو ہوا تھابیاں کبھی  
کم ہو سکی نہ وحشت دندانیاں کبھی

جہت میں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد  
کیا کہیں وہ ترے اقرار کا اقرار سے تھے  
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں  
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

تجھ کو اے موجِ صبا شوخیِ بہیم کی قسم  
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی شکل  
اس طرح پھیر کر ہر گل کو گلستاں کر دے  
اب اے اے مگویا کچھ آساں کرے

جنھیں ہے ناز بہت اپنے طرف پر ساقی  
تیری نگاہ ہے انداز ان کے پاس لئے

نہ انہم نہ پناہیں ہیں کس کے دامن کی چراغ ویر و حرم بھی ہیں جھلکائے ہوئے  
خواب دور نہ کر اب خواب حالوں کو ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے  
خیر ہر ہنر کو سر حشر بھی نہیں چو کے تری نگاہ کرم کے قریب کھائے ہوئے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم جو تیرے ہجر میں گزاری وہ رات بات ہوئی  
دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں تھیں حرمِ عشق میں دن ہی ہوا رات ہوئی

ابھی تو طبعیں سودہ نشیمن ہیں گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال کھاؤ  
یہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حسن ہی جانے کسی سے عالم مستی میں اس طرح کھل جاؤ  
نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھنڈاؤ

تج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں دل وہی کار گم شیشہ گراں ہے کہ جتنا  
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں وہی اندازِ جہان گزراں ہے کہ جتنا  
دیکھ سکنے کی انگ بات مگر حسن ترا دولت دیدہ صاحبِ نظر اے کہ جتنا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہنڈ دھڑکھا

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں گو درِ خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے  
عالمِ حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے بھولیں اگر تو یاد آئے یا دکریں تو بھول جائے  
گو ہم تن وہ جبر ہے کہتی ہیں مشیتیں ہم سے بھی کچھ نہ بن رہے عشق جو اپنی ضد کے  
کشتی دل بچا ہے اتنا مگر رہے خیال ڈوبے اگر تو پار ہو پار لگے تو ڈوب جائے

کئی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں  
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دل پہ بوت  
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں  
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

بنگلہ گاہ یا خبر تھی نہ ترے وعدوں کی  
جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا  
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بے گناہ

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے  
ذرسے ذرسے سے تلاطم سا پتا ہوتا ہے

کہہ گئی کیا ننگہ نماز تری ہم جس کو  
ایسے دیوانے نکھا دنیا میں لڑکھانا ہی کہیں  
بات کی بات فرمانے کا فسانہ سمجھے  
لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے نہ پائی پاتے ہی  
کچھ حسرت صحرابھی ہے، کچھ رنجِ درو دیوار بھی ہے  
امید نہ دے پیش بھی کر، دے اور فریب حسن کوئی  
ماریسیوں کا خرش ہو جانا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے  
دن رات شکوئے کھلتے ہیں دن رات بہاریں شتی ہیں  
تذییر جنوں، تقدیرِ حین، ایام کی کچھ رفتِ رُفت بھی ہے  
اک تارنگاہ کی جنبش سے شہِ عشق کو دیتی ہے کیا کیا  
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے کس مادہ پیکار بھی ہے  
رہ رہ کے غلش بھی ہوتی ہے کچھ کشمکشِ دل بھی کم ہے  
سننے ہیں فراق وہ تیر نظرِ دل میں بھی ہے دل کے پار بھی ہے

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے جس کے ایک  
لے اڑی تجھے کو نگاہ شوق کیا جانتے ہوتا  
تو نے وہ عالم نگاہ ناز کا دیکھا نہیں  
تیری صورت پر بھی اب تیرا لگا ہوا نہیں

نہ پوچھ نہ غصہ ہستی کی وسعت تو تنگی  
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی  
جو چل پڑے تو بیا باں جسے تو زنداں  
رگ جنوں ہے، رگ گل ہے یا رگ گل ہے

یہ بزم عام بھی اسے دوست! بزم عام نہیں  
نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

ماٹھے پر ترے صبح چمن کھیل رہی ہے  
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے  
پیرا ہن خوش وضع سے آتی ہے لیٹ سی  
اس پیکر رنگین میں رہے شوخی نہاں  
ہاتھوں میں فراق اس کی معطر ہے سہمت  
آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے  
وہ زلف شکن زیر شکن کھیل رہی ہے  
لبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے  
بجلی نہ داماں چمن کھیل رہی ہے  
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے شائقِ جمال  
انھیں دیدار نہ ہو حسرت دیدار تو ہے

— ہم سے کیا ہو سکا محبت میں  
تو نے تو خیر بے وفائی کی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے  
دنیا کا خیال آگیا ہے

## جوشِ صلح آبادی

محلِ عشق میں ہمارے دواں آیا      اے گدا خوابِ بیدار کہ سلطان آیا  
لے کلی! ناز سے کھل آبادہ سر جوشِ ابل      کہ بھگارِ جن و مشاہدِ مستان آیا  
غافلِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہو گی زلف      کشتیِ دل سے خمدار کہ طوفاں آیا  
کچ کلا ہی کا سرورِ بگ مبارک لے جوش      بے پیام شکن طرہ جاناں آیا

گر زربا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا      چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا  
نگاہِ جبر سے آفتابِ عالم پاک      حقیرِ خاک کے زروں کو جگمگاتا جا  
ملا کے فحش سے نظرِ عزتِ جنوں کی قسم      چراغِ محفلِ عقلِ خرد بجھاتا جا  
اسیر کر کے سیدہ کاکلوں کے حلقے میں      کند عقلِ تنک مایہ سے جھڑاتا جا  
انٹھ کے عارضِ گلگوں سے دو ٹھکڑی نقا      نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا  
مزاجِ پوچھ کے اے شاہِ عارضِ ہماکل      گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

چلا بے سوئے حرمِ دل سے سائر کرتا جا      طوافِ کعبہِ حسنِ محباز کرتا جا  
لے جو وقت تو لے رہرورہ اکسیر      حقیرِ خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

ادھر بھی بادِ صبا! آ بہار کی سوگند      شمیمِ طرہ گلیوے یار کی سوگند  
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور      جھائے طولِ شبِ انتظار کی سوگند  
ٹہر ٹہر کے شاہِ داستانِ عشوہ و ناز      نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند  
سادے جوش کو بھی لہنائے لعلِ نگار      خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

سخن فروشیاں نہ کر جہاں حسن و عشق میں  
 کہ بیاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ داناں  
 وہ زیبِ نجس ہو اڑ سکئی بولتے نہیں  
 معاشران بزم کیا ہوئیں وہ گلِ فشانیاں  
 شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپِ کُسن رہا ہوں میں  
 ندیم! ہندِ شوق کی سارے چاکھانیاں

اللہ رے سن دوست کی آئینہ داریاں اہل نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا  
 مجھ کو وہ بخشے تھے دو عالم کی تمیں میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں امانوں کا  
 دیکھا جو سینے کو میرے جی چھوٹ گیا طوفانوں کا  
 یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیر دیا ہے عالم کو  
 ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں منکامہ لاکھوں جانور کا  
 دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقایق کی تلخی  
 اور ہم نے حقایق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانہ

مرا پیرہن نہیں چاک ابھی، مجھے رجم کھا کے سنگھابھی دے  
 یہ ہنک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلف دراز میں  
 یہ دغا کا رنگ شکستہ ہے، امریِ حسرتوں کا یہ خون ہے  
 یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں



اے شرق مجھے گمراہ نہ کرو، شورش کے لئے اسباب نہیں  
 امید کہ اجڑے گلشن میں آگ بھول بھی اب شاداب نہیں  
 اب دل کا سینہ کیا پتھر سے، طوفان کی ہوائیں ٹانگن ہیں  
 اب بحر کے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی کج داب نہیں

### سید وحید الدین احمد بخود دہلوی

رق کا گرنا سنا، صیاد کا کہنا سنا  
 چار سمکھوں کا اجڑنا، داتا ہوتا نہیں  
 ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ اس کے عشق کا  
 مر گیا ہوں اور مرنے کا گماں ہوتا نہیں

جاٹے ہی ان کے گویا کچھ بھی تھا چمن میں  
 جوش بہار گل کو پا مال کر گئے ہیں

وعدے کا ذکر، وصل کا ایسا وفا کا قول  
 یہ سب فریب ہیں دل شیدا کے واسطے  
 لے ضبط کر یہ خاک میں مل جائے کاش تو  
 آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے  
 وحشت یہ کہہ رہی ہے دل داغدار کی  
 اس باغ کی بہار ہے صحرائے آگے واسطے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک انگلی بہاراں کی  
 بہار آتی تھی میں ڈال لی دھجی گریباں کی

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے  
 دوستی دشمنی نہ ہو جائے  
 اپنی خوئے و فاسے ڈرتا ہوں  
 عاشقی سب دگی نہ ہو جائے  
 بیٹھا ہے ہمیشہ رندوں میں  
 کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

## مرزا حنیف علی خاں آرزو لکھنوی

ہم نے رورہ کے رات کافی ہے آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

چل گیا اس نگاہ کا جادو کہہ گئے دل کی بات کیا کہیے

### ۸ آرزو لکھنوی

جو سینے میں دل ہے تو بار محبت اٹھیا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا

رہنے دوستی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا  
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

لطف بہار کچھ نہیں گز رہی بہار دل کیا اجر دیکھا کہ زمانہ اجر گیا

### ۹ ہادی پھلی شہری

درد سا اٹھ کے نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب  
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب

## معین احسن جذبی

فیضِ غم بے سبب نہیں جذبی خلشِ دل بڑھاتا ہاں میں

سوال شوقی پر کچھ اُن کو اجنبی ہے جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب ہے

مرنے کی تمنا کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے  
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے  
جب شستی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی  
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے  
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بچھایا آنکوں نے  
جو آنکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

## مرزا یگانہ لکھنؤوی

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے تراؤ درد  
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا دیا  
کروں تو کس سے کروں دردنا سا کلمہ  
کہ مجھ کو لے کے دل دوست میں سماتا دیا  
پلکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا  
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے نہ گیا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیںک مہل  
وہ آسو کیا پائے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

دھواں صاحب نظر آیا سوا دمنزل کا  
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا  
کبھی توجہ میں آئے گا تیرا دیوانہ  
اشارہ چاہئے ہے جنبش سدا سدا کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں رکھا ہے پر ہوا ہنوز نہ گرداب کا ذمہ سہا ل کا  
جواب حسن طلب کے دلوں سے بن نہ پڑا حیا سے گڑبگڑے جب نام آگیا دل کا

ترپ کے آبلہ یا اٹھ کھڑے ہوئے آخر  
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

جس نے مردہ منزل سنا کے چونکایا نکل چلا تھا دیے پاؤں کارواں اپنا

نہ بخیر پھر بلا دی نسیم یہاں تے پھر باہر آج سے تراویز ان ہو گیا  
کیا جانے آج خواب میں کیا دیکھا یا سنے کیوں چننے ہی آپ کے بیگانہ ہو گیا

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا  
ناگماں جھج ستم گارنے کڑوٹ بدنی  
مناں گمراہ نے دیوار نہ بست انا چاہا  
نجات بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا  
جذبہ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی  
پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

وحشیو! کیوں ننگدل ہو فصل گل آنے تو دو  
غنجہ غنجہ میں بہار صد گریباں دیکھنا

یہ دل بے مدعا بیگانہ امید و بیم  
عشق کا حسن طلب اک معنی بے لفظ ہے  
غرق ہو کر آب اپنا ناخدا ہو جائے گا  
ننگی بندھ جائیگی مطلب دا ہو جائے گا

اہل دل مست ہوئے پھیل گئی بے وفا  
بیرہن چاک ہو اجب ترے دیوانے کا

انگڑائیوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے  
آساں نہیں ہے رنج اٹھانا خمار کا

۴۴۷  
دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جانہ میاں اللہ رحمت حسن پیر ہن تار تار کا

خواب کیا فہمی آواز باز گشت آئی  
امید و بیم نے مارا مجھے دور ہے پر  
قفس میں نالہ جاں کاہ کا مزہ نہ ملا  
کہاں کے دیرو حرم گھر کا راستہ نہ ملا  
گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا

بسی ہے نہکت آوارہ کن زک زماغوں میں  
دکھائی جلوہ موہوم نے کیا برق زقاری  
مبارک ہستی برباد پر خسرو ہو جانا  
پلک چھبکاتے ہی حد نظر سے دور ہو جانا  
پٹ کر شمع سے آخر سر پا نور ہو جانا

عالم شوق میں اسیر ہوئے باہر کس سے  
ہول ہی و ساقی استقامت کا دم نکل نہ جائے  
جل بے آمد آمد فصل بہار دیکھ کر  
صبح کو تیری آنکھ میں کیف خمار دیکھ کر  
محو طلسم بندی نقش و نگار دیکھ کر  
سو جھا پھر آنکھ سے نہ کچھ فنرل یار دیکھ کر

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دکھاتا ہے  
زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشت بندلی  
ساد از رنگ و بو اڑ جائے یا مال نظر مو کر  
انکھے محفل سے سب بیگانہ شمع سحر ہو کر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا  
گرفتار قفس پر یا گرفتار شمع پر

دور ہی جاتی ہے گھٹا سوئے چمن بادہ کٹو  
پردہ غیب سے ہونے لگی تدبیر بہار

چشم پرخوں نے مجسم کر دیا موہوم کو  
ورنہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار

خار و گل دونوں کو اپنے بانگن پر ناز ہے دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار  
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں کوئی حیران خزاں کوئی بیش مان بہار  
دیکھ لیتا ہوں جن کو دور سے بیگانہ وار یا اس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبان بہار

یاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے نزل کی طر کاں اب تک ہوس بانگ دراز تے پاس  
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چلے اب ترک دعا کرتے ہیں

الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل فرق آگیا ہے گردش لیل نہار میں  
نمزل کی دھن میں آبدی پاپل کھڑے ہیں شور و جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم کون سی جا ہے جہاں حکم خزاں جاری نہیں  
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ جا سکے داغ دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

سنتا ہوں آپ خاندہ دل میں ہیں جلوہ گر دیوار درمیاں ہے مگر کچھ خبر نہیں  
کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو داخل ہو دل میں سوائے یا کسی کا گزر نہیں

شش جہت میں ہے تیرے جلوہ بے فیض کی نھوم  
کان محبہم میں مگر آنکھ گنت گار نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری مانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں  
دیواریں پھاند پھاند کھدوانے جل ہے خاک اڑ رہی ہے چاروں طرف قید خانے میں  
رہ رہے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی ہوں گے نفس میں کل جو ہیں گج آشیانے میں

گلا گھٹنے لگا اب تنگا۔ آیا ہوں گریباں سے جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں  
بہت دست جنوں نے گد گدایا جب تک کیا کرتے آئیں بیڑیاں اور پہنے دوسرے طوق گردن میں

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل دیر و حرم میں گم نگہ نارسا نہ ہو

حیرت نے شش بہت میں نظر بند کر دیا نامحرم طلسم خندان و ہزار کو  
اللہ رے اختیار نہ آما دہ سحر لیا فکر محال کہہ دل بے اخذت رکھو

اسیڑوں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائیگی قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھائیں گے گلستان کو  
مزاج حسن بدلے آسماں بدلے زمین لے سزائے عشق کیا بدلے گی ذوق ناپیشیاں کو

آ رہی ہے یہ صداکان میں دیوانوں سے کل کی ہے بات کہ آیا دتھے دیوانوں سے  
آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

بقدر حوصلہ ملتی ہے داو عشق و ہوس مزاج حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

گم ہوئے پوش و حواس ایسے محیط عشق میں ڈوبنے والوں کو اب نہ پر ہنگام ساحل کا ہے

غبار بن کے پستی ہے دامن دل سے شے یہ بھی وہی دل بستگی بہار میں ہے  
دعاے شوق تجا ایک ہاتھ ہے دل پر اور ایک ہاتھ گریباں تار تار میں ہے

دور سے ان کو آج دیکھ لیا دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

آنکھوں آنکھوں میں بے لیا وعدہ کاؤں کاں ایک کو خبر نہ ہوئی

نظارہ رخ لیلیٰ مبارک اے مجنوں نگاہِ خوق نے پردے اٹھائے محل کے

نا خدا کو نہیں اب تک تہ دریا کی خبر ڈوب کر دیکھے تو بیگانہ ساحل ہو جائے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو بسن الثا مرا صیاد پڑھا تا ہے مجھے  
لب دریا کا ہوا میں نہ تہ دریا کا نا خدا کوں سے گھاٹ اب لے جاتا ہے مجھے

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں ہستی مری مجموعہ اصداد رہے گی  
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

نظام دہرنے کیا کیا نہ کرو نیں بدلیں مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار ہے

خزاں کے دم سے شاخ و زیت کا جھگڑا چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار ہے

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بیجا ہے  
لے رہن بے پروا شکل مری آساں کر کیوں آنکھ جراتا ہے گم گشت تہنا سے  
کیوں نہکت آوارہ جاے سے نہ ہو باہر کس دن کو وفا کرتی ہیں سوا سے  
حیراں ہیں نظر والے بیتاب ہیں لالے کچھ رنگ تماشا سے چمچہ تو بے تناسے

کھیل ہے حسن نظر کا شمع کیا پروا نہ کیا دل بے جنتک دل جھی بیک روشنی محفل میں ہے  
باز آساں پہ غوطے کھانے والے آساں آساں دلوں نے مارے دنیا بے سال ہیں

